اے بی سی آڈٹ بیورو سرکولیشن کی مصدقہ اشاعت

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

جلد نمبر ۔۔۔۔۔۔ ۳۶
شمارہ نمبر ۔۔۔۔ ۱۱۔۱۲
جلد نمبر ۔۔۔۔۔ ۳۷
شمارہ نمبر ۔۔۔۔۔ ۱۔۲
اگست تا نومبر ۲۰۰۱ء

مدیر اعلیٰ: حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ
نگران: حضرت مولانا انوار الحق صاحب مدظلہ
مدیر: حافظ راشد الحق سمیع حقانی
ناظم شفیق الدین فاروقی

اس شمارے کے مضامین

اداریہ: عالم اسلام کیخلاف صلیبی جنگ کا آغاز اکیسویں صدی کی بھیانک ابتداء ۔۔۔۔۔ راشد سمیع ۳
الشیخ المجاہد اسامہ بن لادن کا خصوصی پیغام ۔۔۔۔۔ ادارہ ۱۱
امت مسلمہ کے اندازِ فکر میں انقلاب کی ضرورت ۔۔۔۔۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ۱۶
اکیسویں صدی اور امت مسلمہ کی ذمہ داریاں ۔۔۔۔۔ حضرت علامہ محمد یوسف القرضاوی ۲۹
ت مسلمہ کی معیشت اور اسلامی خطوط پر اس کا اتحاد ۔۔۔۔۔ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی ۳۶
ں صدی اور مسلمان ۔۔۔۔۔ سید مولانا محمد رابع ندوی ۴۴
فانستان اور عالم اسلام کی صورتحال (انٹرویو مولانا سمیع الحق صاحب) ۔۔۔۔۔ حامد الحق ۴۹
یسویں صدی اور اسلام بیسویں صدی کے تناظر میں ۔۔۔۔۔ مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری ۷۳
سویں صدی عیسوی میں عالم اسلام کا کردار ۔۔۔۔۔ مولانا محمد شہاب الدین ندوی ۸۰
اکیسویں صدی میں اسلامی قیادت کا سنگین بحران ۔۔۔۔۔ ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی ۹۲
اکیسویں صدی کیا اسلام کی صدی ثابت ہوگی؟ ۔۔۔۔۔ ڈاکٹر اسرار احمد ۹۴
مغرب کا فکری چیلنج اور علمأ کرام کی ذمہ داری ۔۔۔۔۔ مولانا محمد عیسیٰ منصوری ۱۰۳
جدید ملت اسلامیہ کا ظہور اور عالمی خلافت اسلامی کے قیام کے امکانات ۔۔۔۔۔ ارشاد احمد حقانی ۱۱۳
اکیسویں صدی اور علمأ کرام کا کردار ۔۔۔۔۔ ابو عمار زاہد الراشدی ۱۲۰
اکیسویں صدی کا پیغام ۔۔۔۔۔ احمد ندیم قاسمی ۱۲۷
اکیسویں صدی اور عالم اسلام ۔۔۔۔۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ۱۳۵
اکیسویں صدی اور علمأ کرام کا رویہ اور کردار ۔۔۔۔۔ صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی ۱۴۲

اکیسویں صدی اور امت مسلمہ .... فرانس روبجن ۱۵۹
مغربی فکر و تہذیب: چیلنجز اور تقاضے .... ڈاکٹر عمر فاروق غازی ۱۶۷
امت مسلمہ اور یہودی عزائم ...... لمحہ فکریہ! .... ڈاکٹر عبدالرشید رحمت ۱۷۵
اکیسویں صدی میں علوم عصریہ اور عوامی خدمت کی اہمیت .... ڈاکٹر محمود الحسن عارف ۱۹۰
بیسویں اور اکیسویں صدی میں علمائے دیوبند کا کردار .... محمد یونس مئیو ۲۰۱
بیسویں صدی عیسوی اور مخزن علم و معرفت دار العلوم دیوبند .... ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی ۲۱۲
نیا ہزاریہ اور امت مسلمہ کو پیش آمدہ معاشرتی چیلنجز .... ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر ۲۱۷
اکیسویں صدی میں عالم اسلام کیلئے کمپیوٹر 'انٹرنیٹ' جدید مواصلات .... پروفیسر صفدر احمد ۲۳۴
اکیسویں صدی کا آغاز اور عالم اسلام کی زبوں حالی .... حافظ محمد ابراہیم فانی ۲۳۷
مفکر اسلام حضرت علی میاںؒ کا آنے والی صدی کے نام آخری پیغام .... شاہنواز خان ۲۴۱
اکیسویں صدی کیلئے اسلام خطرہ ہے یا مغربی جمہوری نظام؟ .... عبدالماجد ۲۴۳
اکیسویں صدی، عالم اسلام اور سائنس و ٹیکنالوجی .... محمد نسیم خان ۲۴۷
گزشتہ صدی کا قرض .... مفتی ابو لبابہ ۲۵۸
اکیسویں صدی "کتابِ زندگی کا نیا باب" .... ڈاکٹر اصغر حسن ۲۶۱
اکیسویں صدی میں امت مسلمہ کیلئے شرح خواندگی .... جناب احمد دین حداد ۲۶۳
بیسویں صدی عیسوی کے تین بڑے المیئے .... حافظ عرفان الحق حقانی ۲۷۱
یہ صدی بھی یورشِ خونبار کے نرغے میں ہے (نظم) .... حافظ محمد ابراہیم فانی ۲۷۸
اکیسویں صدی کا استقبال (نظم) .... راجا رشید محمود ۲۷۹
سالانہ اشاریہ (انڈکس) .... ادارہ

ماہنامہ الحق جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ (سرحد) پاکستان

فون نمبرز: 630340-630435 (0923) فیکس نمبر 630922 (0923)
ای میل نمبرز: haqqania@nsr.pol.com.pk OR haqqania@hotmail.com.

سالانہ بدل اشتراک اندرون ملک فی پرچہ: -/20 روپے سالانہ -/200 روپے بیرون ملک -/20:$
پبلشر: مولانا سمیع الحق مہتمم جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ قیمت خصوصی شمارہ -/80 روپے

نقش آغاز

راشد الحق سمیع حقانی

عالم اسلام کے خلاف صلیبی جنگ کا آغاز

اکیسویں صدی کی بھیانک ابتداء

اکیسویں صدی کے اوائل میں امریکی صدر جارج ڈبلیو بش یہ اعلان کر رہے ہیں کہ "امریکہ اس کے اتحادی اور خصوصاً مغربی ممالک ایک نئی صلیبی جنگ کیلئے اپنے آپ کو تیار رکھیں۔ اس میں ہمیں ایک لمبے عرصے کیلئے "انتہا پسندوں اور تخریب کاروں" (مسلمانوں) کے خلاف لڑنا ہوگا۔ امریکہ اور مغرب کیلئے یہ اکیسویں صدی کی پہلی جنگ ہے اور اسے ہمیں ہر حال میں جیتنا ہوگا۔"

اسی طرح گزشتہ سال جب عیسائیوں کے روحانی پیشوا پوپ جان پال ایشیا کے دورے کے سلسلے میں ہندوستان پہنچے تو انہوں نے لاکھوں افراد کے سامنے علی الاعلان ان خیالات کا اظہار کیا کہ:

"اکیسویں صدی اور نیا میلینیم (ہزاریہ) عالم عیسائیت کی ترویج اور برتری کیلئے ہے اور ہم کوشش کریں گے کہ ایک بار پھر عالم عیسائیت جس کا آبائی وطن ایشیا ہی ہے، کو دوبارہ عیسائیت کی لپیٹ میں لے آئیں اور اس سلسلے میں ہماری ساری کوششیں اور توانائیاں ایشیاء ہی پر مرکوز رہیں گی۔"

یہ خیالات امریکی صدر بش اور عیسائیوں کے روحانی پیشوا پوپ جان پال کے عالم اسلام اور اس کے باسیوں کے خلاف ان کے دلوں میں رچی بسی نفرت اور انتہائی تعصب کی ایک ادنیٰ مثال ہے جو آپ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ معلوم نہیں کہ مغرب کے "انسانی اور جمہوری" سرخی پاؤڈر سے سجے خوبصورت چہرے کی اصل شکل کتنی مہیب اور خطرناک ہوگی اور بیان کردہ ظاہری خیالات کے علاوہ درپردہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف انکے اس صدی میں کتنے خطرناک عزائم ہوں گے؟ فی الحال تو اسکا آغاز سرزمین افغانستان سے شروع ہوگیا ہے۔ دو مہینے ہونے کو ہیں کہ افغان مسلمانوں کے مسلسل خونِ ناحق سے زمین سینچی جارہی ہے۔ لاکھوں بموں، کروز میزائلوں اور ہر قسم کے آتشیں مہلک اسلحہ سے بے گناہ شہریوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی مشقِ ستم جاری ہے۔ تادم تحریر ساٹھ ستر ہزار سے زائد بے گناہ اور معصوم افراد کو خاک و خون میں ڈبو دیا گیا ہے۔ شہر شہر اور گلی گلی سے جنازے اٹھ رہے ہیں، لاکھوں افراد اپنا وطن اور گھربار چھوڑ کر مہاجرت کی زندگی گزارنے کیلئے دربدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر

دیے گئے ہیں اور یہ سب کچھ "دہشگردی" کو مٹانے کے سلسلے میں کیا جارہا ہے۔ لیکن در حقیقت یہ تہذیبوں کے تصادم کی جنگ ہے' نئی صلیبی جنگوں کا آغاز ہے' مذاہب کی بالادستی کی لڑائی ہے' اقتصادیات اور قدرتی وسائل پر قبضے کا مقابلہ ہے' سیاسی مفادات اور فوجی برتری کا جھگڑا ہے اور اسلام وکفر کا معرکہ ہے طرفہ تماشہ یہ کہ قیامت کی ان گھڑیوں میں کفر کے اتحاد کیساتھ ساری امت مسلمہ بھی اپنے ہی مسلم بھائیوں کیخلاف ان ظالموں کے شانہ بشانہ کھڑی ہے ع جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

امریکہ اور ساری دنیا نے مل کر اپنی قتل وغارت گری' طاقت کی دھاک بٹھانے اور ستم ظریفی کی یہ داستان رقم کرنے کیلئے ایک ایسے مظلوم خطے کو چنا ہے جس پر اب نشانہ اور نئے زخم لگانے کیلئے سرے سے کوئی جگہ باقی ہی نہیں رہی تھی اور جس کا ایک کونہ اور منڈیر بھی سالم حالت میں نہیں بچی۔ پورے ملک پر قیامت کی تباہی کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ رشکِ جنت خطہ ارض اب ایسی دوزخ بن گئی ہے جس میں بجھتی آگ کو ہر دم انسانی ایندھن سے تازہ کیا جارہا ہے۔ اس تن ناتواں کے چاک چاک گریباں کا اب ایک تار بھی سالم نئے دراندازوں کے دست ستم کیلئے باقی نہیں بچا۔

اس مقتل گاہ میں کوئی بھی ایسا خاندان اور گھرانہ ڈھونڈنے کو نہیں ملتا جس نے اپنے لخت جگروں کا خراج عالمی استعماری قوتوں کی نذر نہ کیا ہو اور جس کا ہر تیسرا بچہ یتیم اور ہر تیسری عورت بیوہ نہ ہوئی ہو۔ ظلم وعدوان کی ان نوازشوں کے طفیل آج افغانستان کے وسیع وعریض کوہ ودمن' بیابانوں اور قلعہ جنگی میں لاشوں کے پشتے اور انبار پڑے ہوئے ہیں جس پر عرش بریں کے حاملین بھی گریہ کناں ہوں گے۔ یہ تباہی وبربادی جس کا مختصر ذکر ہوا بیسویں صدی ہی کی سوغات ہے۔ لیکن زمانہ حال کے انسانوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ انہیں تو بس صرف "دہشت گردی" کے خلاف لڑنا ہے؟ ہائے افسوس کہ اکیسویں صدی کا آغاز بھی مسلمانوں کی آہ وفغاں اور قتل وقتال سے دوبارہ کیا جارہا ہے۔ جیسا کہ بیسویں صدی کا آغاز اور انجام انہی کے خون ناحق سے کیا گیا تھا۔

انسانی المیوں سے لکھی گئی کتاب کا ہر باب اور ہر صفحہ بلکہ ہر سطر مسلمانوں کی مظلومیت اور بے کسی سے پُر آپ کو ملے گی۔ کرہ ارض پر اگر آج کوئی سب سے زیادہ مقہور' مظلوم اور بے سہارا ہے تو وہ مسلمان ہی ہے جس کے خلاف بیرونی محاذ پر تمام عالم کفر متحد ہے تو داخلی طور پر ان کے حکمران بھی دن رات اسلام اور اپنی عوام کی بیخ کنی میں معروف ہیں۔

دنیا کے نقشے پر ایک ہی آزاد اور خود مختار ریاست امارت اسلامیہ افغانستان تھی جس نے عالم کفر اور خصوصاً امریکہ کی بالادستی اور نظام کو اپنانے سے صاف انکار کر دیا تھا اور خالصتاً قرآن وحدیث کی بنیادوں پر ایک صحیح اسلامی مملکت کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا تھا لیکن عالم کفر اور انکے ایجنٹ برائے نام مسلم

حکمران اس کے شروع دن ہی سے مخالف بن گئے تھے اور ان چھ سالوں میں انہوں نے مسلسل سازشوں کے ذریعے اس کے خلاف کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور ہر قسم کی کوششوں کے باوجود جب اس چراغ حق کو نہ بجھا سکے اور نہ ہی حزب اللہ (اللہ کی جماعت) کو خرید سکے تو انہوں نے ایک عظیم سازش کے ذریعے اسلام کے اس قلعے پر شب خون مارنے کیلئے حزب شیطان جنکا سرغنہ شیطان اکبر امریکہ اور اسکے حواری عالم کفر اور اسکے ایجنٹ عالم اسلام کے حکمران اکٹھے ہوئے اور ایک بار پھر افغانستان کے خون سے رنگیں میدانوں اور پہاڑوں میں میدانِ کارزار لگ گیا ہے اور معرکہ حق وباطل کا آغاز ہو گیا ہے بلکہ یوں کہیے کہ وہاں پر فضائے حشر کا سماں برپا کر دیا گیا ہے۔

آج قیامت کی یہ گھڑیاں مسلمانوں کیلئے ایک کڑے امتحان کی حیثیت رکھتی ہیں ایک طرف بے کس مفلوک الحال اور بے سہارا لیکن بہادر طالبان ہیں تو دوسری جانب امریکہ، عالم کفر اور بین الاقوامی اتحاد جو عصر حاضر کے خدا بن بیٹھے ہیں اور اپنے ہر قسم کے مادی وسائل اور آلات حرب وضرب سے لیس بھی ہیں۔ لیکن طالبان اور افغان امت کے حوصلے ابھی پست نہیں ہوئے۔ دو مہینے کی مسلسل خطرناک ترین ریکارڈ بمباری کے باوجود یہ لوگ امریکہ کے سامنے شکست ماننے پر تیار نہیں۔ انہیں اللہ کی نصرت اور اپنی روایات پر مکمل بھروسہ ہے ورنہ بظاہر اسباب اور طاقت کے لحاظ سے تو ایک دن کی جنگ بھی طالبان کیلئے لڑنا مشکل تھی۔ طالبان کی نظر اللہ تعالیٰ پر ہے اور ان کے آگے اپنے اسلاف کی وہ تابندہ تاریخ ہے جس میں ہمیشہ اسباب وتعداد کفر کے پاس تھی اور حق کے پاس ہمیشہ تعداد واسباب نہ ہونے کے برابر تھی لیکن سرخروئی اور کامیابی اسلام اور مسلمانوں ہی کو بالآخر حاصل ہوئی۔ طالبان تحریک کے اعلیٰ حکام اور کارکن شہید ہو جائیں گے لیکن وہ اسلام کی عظمت پر آنچ آنے نہیں دیں گے اور نہ ہی وہ امریکہ کی بالادستی مرتے دم تک تسلیم کریں گے۔ تاریخ میں استعمار کے خلاف ان کی جدوجہد اور سرفروشانہ کردار ہمیشہ زندہ وباقی رہے گا اور یہی ان کی فتح اور بڑی کامیابی ہے۔

تاریخ میرے نام کی تعظیم کرے گی ۔۔۔ تاریخ کے اوراق میں آئندہ رہوں گا

طالبان کی چھوٹی سی جماعت "حقہ" کو گرانے کیلئے امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس، جرمنی، بھارت اور جاپان بلکہ سارا عالم کفر اور اس کے اتحادی اسلامی ممالک اس وقت ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ان ممالک کے اسلحہ کے ذخائر کثرتِ استعمال کی بنا پر تنگ دامنی پر اتر آئے ہیں۔ سرزمین افغانستان کو بارود وآہن میں غرق کر دیا گیا ہے اس کے لہلہاتے کھلیانوں کو کلسٹر اور نیپام بموں سے جلا دیا گیا ہے اور تمام اہم عمارتوں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ شمالی اتحاد جو کرائے کے قاتلوں کی فوج اور ہٹلر د چنگیز خان کے باقی ماندہ لشکر کی ذریتِ فاسدہ ہے، آج ان کے ہاتھوں افغانستان میں دوبارہ انسانیت موت

کے دروازے پر سسکیاں لے رہی ہے اور ان کی عارضی فتح اور مظالم کے تماشے پر امریکہ اور مغرب بغلیں بجا رہا ہے۔ میڈیا اور عالمی ٹیلیویژن چینلز پر ایسے ایسے دردناک مناظر دکھائے جارہے ہیں کہ انسانیت سر پیٹ رہی ہے۔ اخلاقی اقدار نوحہ کناں ہیں۔ عرش بریں اس ظلم پر لرزاں ہے، مسلمانوں کے دل بھی گرفتہ اور شکستہ ہیں اور چنگیز وہلاکو کی روحیں بھی اس جارحیت کے تماشے پر کپکپا رہی ہوں گی۔

ان دنوں شمالی اتحاد، امریکی اور مغربی افواج ایسی بربریت کی داستاں سرزمین افغانستان کے نقشے پر رقم کررہی ہیں جس کے سامنے روسی اور نازی مظالم بھی شرمسار ہیں لیکن اس کے باوجود پوری دنیا ان کی تعریف اور قصائد میں جُتی نظر آرہی ہے حالانکہ طالبان نے از خود تمام شہر اور آبادیاں خالی کردی ہیں۔ شمالی اتحاد نے اپنے زور بازو پر کوئی بھی فتح حاصل نہیں کی بلکہ شمالی اتحاد امریکہ اور عالم کفر کے کاندھوں پر ہی آگے بڑھا ہے۔ لیکن صرف ہفتہ دس دن کی حکومت کے بعد پورا افغانستان دوبارہ خانہ جنگی کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ کابل سے لے کر طورخم بارڈر تک دوبارہ پھاٹکوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوچکا ہے۔ امن کی موت واقع ہوچکی ہے، تحفظ وسالمیت کا گلا گھونٹا جارہا ہے، عزت و آبرو اور ننگ وناموس ہر موڑ پر گریہ زن ہیں اور خلق خدا دوبارہ امن کے سفیروں، فرشتہ سیرت طالبان کو دہائی دے رہے ہیں، لیکن یہ تو ابھی ابتداء و آغاز ہے آگے آگے دیکھئے ...... بون کانفرنس کا فارمولا بھی دیرپا حل نہیں اور نہ ہی اس سے امن قائم ہوسکتا ہے۔ اس کا انجام بھی سابقہ معاہدوں کی طرح خطرناک ہوگا۔ امریکہ نے ایک بار پھر ایسی آگ بھڑکائی ہے اور افغانیوں کو دوبارہ ایک ایسی جہنم میں دھکیلا ہے جس کے سرد ہونے کے آثار و قرائن دور دور تک دکھائی نہیں دے رہے لیکن ہمیں مکمل بھروسہ ہے کہ اسی آگ کی چنگاریوں سے امریکہ کا اپنا دامن بھی محفوظ نہیں رہے گا اور اس کا سارا غرور اور دنیوی طاقت، جاہ وحشمت کا مزار بھی دنیا کی نگاہوں کے سامنے سوویت یونین اور برطانیہ کی طرح عنقریب بنے گا۔ کیونکہ یہی قانون فطرت اور تاریخ کا وطیرہ رہا ہے۔

امریکہ، عالم کفر اور شمالی اتحاد کو اس عارضی فتح پر نازاں نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ شکست گوریلا جنگ کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوسکتی ہے اگرچہ طالبان نے ایک سوچے سمجھے منصوبے اور جنگی حکمت عملی کے تحت ملک کے اہم شہر اور علاقے چھوڑے ہیں تاکہ امریکہ اور اتحادیوں کی بے رحمانہ بمباری سے معصوم شہریوں کی ہلاکتوں کا سلسلہ ختم کیا جاسکے دوسرا پہلو یہ ہے کہ طالبان اور مجاہدین کو ختم ہونے سے بچایا جائے اسی لئے انہوں نے گوریلا جنگوں کو ترجیح دی ہے اس المناک صورت حال پر اگرچہ امت مسلمہ اور خصوصاً اسلامیان پاکستان پر جو کیفیت گزری وہ نہایت ہی گراں اور ناقابل بیان ہے۔ لیکن ہمارے سامنے جنگ احد اور دوسری غزوات وغیرہ کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ عارضی شکست جسے مغرب اسلام کی

حتمی شکست سمجھ رہا ہے ہر گز اسلام کی شکست نہیں۔ اسلام تو ہر کربلا کے بعد ہی زندہ ہوتا ہے۔

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

مغرب جتنا بھی اس کو دبائے گا اتنا ہی وہ اسلام کی طاقت کو مزید ابھارے گا۔ طالبان کی تحریک اور القاعدہ اور اسامہ بن لادن جو آبروئے امت مرحومہ کی زندہ علامات ہیں اس بحر ذخار کی چھوٹی لہریں ہیں' اس کی گہرائی اور قوت وشدت کا اندازہ ان عقل کے اندھوں کو نہیں ہو سکتا۔ اگر طالبان اور اسامہ بن لادن مشیت ایزدی کے مطابق نہ بھی رہے تو بھی ہر دور اور ہر زمانہ میں حق کا قلیل گروہ کفر کی سرکوبی کیلئے موجود رہتا ہے اور رہے گا یہ اللہ کا وعدہ ہے جو کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اکیسویں صدی انشاء اللہ اسلام کی شان وشوکت اور ترویج وتشہیر کی صدی ہوگی خود مغرب کے اندر اسلام کی لہریں اٹھ رہی ہیں اور خصوصاً امریکہ ویورپ کے دوہرے معیار کے باعث وہاں کے باشندے مسلمانوں کی طرف ہمدردانہ جذبات رکھنے پر مجبور ہو رہے ہیں' 11 ستمبر کے بعد امریکہ سے دنیا میں ہمدردی رکھنے والوں کی تعداد میں گو کہ کچھ اضافہ ہوا تھا لیکن 7 اکتوبر کی بمباری کے بعد امریکہ اب دوبارہ ظلم وبربریت کا نشان بن گیا ہے اور بعض اطلاعات کے مطابق صرف ان دو ماہ میں ہزاروں امریکن مسلمان ہو گئے ہیں جو اسلام کی حقانیت کی روشن دلیل ہے بلکہ اب تو خود امریکی باشندے بھی طالبان کے شانہ بشانہ امریکہ کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکی پالیسیوں سے اس کے اپنے شہری بھی نفرت کرتے ہیں۔ پھر امریکی معیشت اور اسکے دفاعی نظام پر بھی زوال آنا شروع ہو چکا ہے انشاء اللہ امریکہ اور مغرب اس جنگ کے مہیب اثرات صدیوں تک محسوس کرتے رہیں گے۔

یہاں سب سے تکلیف دہ اور باعثِ شرم بات یہ ہے کہ عالمی کفری اتحاد کا ساتھ دینے اور آتشِ نمرود میں مسلمانوں کو جلانے اور سوختہ سامانی فراہم کرنے میں عالم اسلام کے تمام حکمرانوں نے کفار سے بھی بڑھ چڑھ کر اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا اور پھر پاکستانی جرنیلوں نے تو اس سلسلے میں نہایت ہی "خشوع وخضوع" اور انتہائی تابعداری سے ان کا ساتھ دیا۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ہم اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں اور اپنی ہی پیٹھ ننگی کر رہے ہیں۔ پرویز مشرف کے کردار نے تو اس بوڑھی عورت کو بھی مات دے دی جس کی بے وقوفی کا ذکر قرآن میں آیا ہے کہ کالتی نقضت غزلها من بعد قوة انکاثا کہ تمام دن محنت کر کے سوت کاتتی اور پھر شام کو اس کو ادھیڑ دیتی۔ پہلے پاکستان نے بھی اپنے پڑوسی ملک افغانستان کیلئے بے شمار وبے نظیر قربانیاں دیں۔ بیس بائیس سال تک لاکھوں مہاجرین کے بوجھ کو برداشت کیا' سپر پاور روس سے انہیں تحفظ دینے میں ان کا بھرپور تعاون کیا خود اپنی

معیشت کو کمزور کیا پھر اسی کی وجہ سے خود دہشت گردی کا نشانہ بھی بنا رہا اسکے علاوہ افغانستان ہی کی وجہ سے پاکستان متعدد بحرانوں کا شکار بھی ہوا۔ لیکن ہم نے سب کچھ برداشت کیا اور اب جبکہ ہمارے پڑوس میں ایک مستحکم اسلامی اور دوست حکومت امارت اسلامی افغانستان قائم ہوئی تو حکمرانوں نے امریکہ کی معمولی جنبش ابرو پر اسکے خلاف محاذ جنگ گرم کر دیا۔ اور اسی پڑوسی ملک کو پلیٹ میں سجا کر دوسری سپر پاور امریکہ کے آگے پیش کر دیا۔ ع جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

بھارت نواز 'شمالی اتحاد تو پہلے ہی پاکستان کا دشمن تھا طالبان جو پاکستان کے دوست تھے انہیں بھی ناراض کر دیا گیا اور اپنے ملک کی سالمیت بھی داؤ پر لگا دی گئی۔ امریکیوں کو ہوائی اڈے دیئے گئے۔ اب ہمارا بھی سعودی عرب اور خلیجی ممالک جیسا انجام ہو گا سب سے بڑا خطرہ تو ہمارے ایٹمی پروگرام کو ہے جو اب کسی بھی وقت انکا آسانی سے ہدف بن سکتا ہے۔ اسکے علاوہ پرویز مشرف نے افغانستان کیساتھ ساتھ کشمیر کاز کو بھی ہار دیا ہے۔ اکثر مجاہد تنظیموں پر امریکہ نے پابندی عائد کر دی اور امریکی وزیر خارجہ اور بھارت میں امریکی سفیر نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ "اب ہم کشمیر میں دہشت گردوں کو ختم کریں گے اور اب پاکستان مزید دہشت گردوں کو پناہ بھی نہیں دے سکے گا" امریکہ کیساتھ مل کر ہم نے صرف خسارے ہی کا سودا کیا ہے۔ کشمیر پر اپنا مقدمہ ہر محاذ سے کمزور کر بیٹھے۔ اسی طرح پورا ملک پرویز مشرف کے خلاف ہو گیا اور عوام و خواص نے "دفاع افغانستان و پاکستان کونسل" کی احتجاجی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیکر موجودہ فوجی حکومت پر عدم اعتماد کا ثبوت بھی دے دیا ہے۔ اسی طرح پاکستانی حکمرانوں نے فوج کا اسلامی تشخص بھی مسخ کر دیا۔ ایمان تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ جو افواج پاکستان کی امتیازی بنیادیں تھیں ان کی بھی دھجیاں اڑا دی گئیں اب اسکے بجائے انہیں امریکہ ڈالر اور غلامی کو موٹو بنا دینا چاہئے۔ ملکی قرضے معاف کرنے اور معیشت کی بہتری کے نعرے بھی ایک سراب ثابت ہوئے ہم نے ایک ارب ڈالر کے عوض قومی غیرت، دینی حمیت، خودداری اور ملکی وقار کا سودا کر لیا۔ ع قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند اور ننگ و نام کی بچی کھچی جمع پونجی ایک بے وفا صنم (امریکہ) کی ادائے کافرانہ کی نذر کر دی اور ملی قبائے حمیت جو پہلے ہی تار تار کی جا چکی تھی اس نئی بادِ سموم نے تو قوم کو برہنگی کا ایک ایسا وجود عطا کر دیا ہے کہ شاید صبح قیامت تک ہی اسے نہ ڈھانپا جا سکے۔ امریکہ نے حسب روایت اپنی طوطا چشمی کا بھرپور مظاہرہ اس بار بھی کیا اور پاکستان کو فقط ٹشو پیپر بنا کر استعمال کیا۔ حکمرانوں کو اس کوئلے کی دلالی میں ماسوائے بدنامی اور خسارے کے کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا۔ الغرض ۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم ‏ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

پھر جن مذہبی جماعتوں نے حکومت کی اس شرمناک پالیسی پر صدائے احتجاج بلند کی تو انہیں

غدار ملک دشمن شرپسند تخریب کار الغرض طرح طرح کے القابات سے نوازا گیا اور "دفاع افغانستان وپاکستان کونسل" کی اعلیٰ قیادت کو نظر بند کیا گیا اور انہیں ناجائز پابندیوں میں جکڑا گیا ان پر جھوٹے مقدمات قائم کئے گئے درجنوں افراد کو مظاہروں کے دوران اپنی ہی پولیس اور فوج نے گولیوں سے بھون ڈالا۔اب مشرف صاحب دینی مدارس اور مذہبی جماعتوں کے خلاف آپریشن کا ارادہ رکھتے ہیں۔یہ کوئی نئی بات نہیں۔آپ کے پیش رووں نے بھی دین ومذہب کے ان مراکز کو ختم کرنے کیلئے بڑی ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا لیکن وہ خود نیست ونابود ہو گئے اور ان کا یہ خواب کبھی بھی پورا نہ ہو سکا۔دراصل یہ سب کچھ امریکہ کو خوش کرنے کیلئے کیا جارہا ہے۔دینی جماعتوں نے جو کچھ کیا وہ ان کا اسلامی اور جمہوری حق تھا اور ہم اب بھی امریکی پٹھوؤں اور ان کے ایجنڈے کے خلاف جائز قانونی وجمہوری جدوجہد جاری رکھیں گے۔

ادھر آ ستم گر ہنر آزمائیں ۔۔۔ تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

دوسری شرمناک بات یہ ہے کہ اس تمام صورتحال پر ملک کے دانشور اہل قلم اور اصحاب رائے حضرات نے بھی مصلحت بینی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔قوم اور حکمرانوں کو انہوں نے مستقل افیون کا نشہ دینے کی کوشش کی اور بزدلی وگیدڑ کی سوسالہ زندگی اختیار کرنے کا درس دیتے رہے پھر کئی سرکاری اور درباری مولویوں نے بھی اس تمام صورت حال میں انتہائی منافقانہ کردار ادا کیا۔لیکن یہ سب کچھ اب تاریخ کا حصہ بن گیا ہے کہ کس کس نے کیا کیا کردار ادا کیا؟ لیکن جب کابل میں پاکستان مخالف حکومت کا سورج طلوع ہوا تو ان سارے چمگادڑوں اور الوؤں کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔اب افغانستان میں پاکستان دشمن قوت اقتدار میں ہے اور اسکے عزائم انتہائی خطرناک ہیں۔امریکہ نے بھی مطلب نکل جانے کے بعد حسب عادت آنکھیں پھیر لی ہیں۔ہم سمجھتے ہیں کہ جن قوتوں نے امریکہ اور عالم کفر کا ساتھ دیا ہے وہ اس دنیا اور آخرت میں بھی روسیاہ ہوں گے اور بے گناہ انسانوں کا قتل عام انکے گلے کا طوق ہوگا۔یہ قتل وغارت اور خون مسلم کی ارزانی اکیسویں صدی کی ابھی شروعات ہیں معلوم نہیں کہ اسکی شام کے سائے کتنے مہیب اور دراز ہو سکتے ہیں پھر وقت کے سارے پیمانے گھڑیوں کی طنابیں اور طاقت کے سرچشمے بظاہر آج کفر کے علمبرداروں کے ہاتھوں میں ہیں لیکن بہر حال مایوسی اور ناامیدی کے ان گھٹا ٹوپ اندھیروں کے باوجود میرے شکستہ دل میں امید کی ایک کرن جگمگا رہی ہے کہ ہزار امتحانوں آزمائشوں اور زمانے میں نار نمرود کے شعلوں کے باوجود اکیسویں صدی اسلام ہی کی صدی ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ خودداری وحدت محنت وجدوجہد عزم جواں جدید علوم وفنون سے لگن اور توکل کا جذبہ جواں ہو۔

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں ۔۔۔ نفس سوختۂ شام وسحر تازہ کریں

ان اللہ لا یغیر مابقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم .... (الآیۃ)

خصوصی نمبر کے سلسلے میں ضروری گزارشات

معزز قارئین "الحق"! ادارہ "الحق" نے ڈیڑھ سال قبل اس خصوصی نمبر کی اشاعت کا اعلان کیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ چند ماہ میں یہ نمبر شائع بھی ہو جائے گا لیکن اس سنجیدہ موضوع پر معیاری مضامین کی عدم دستیابی اسکی اشاعت میں تاخیر کی بنیادی رکاوٹ بن گئی۔ اس سلسلے میں عالم اسلام کے اہم اور مقتدر علماء، دانشور اور اہل قلم حضرات سے بار بار لکھنے کی اپیلیں کی گئیں لیکن اسکا کوئی خاطر خواہ نتیجہ فوری سامنے نہ آسکا اور نہ ہی ان حضرات نے اس اہم موضوع کو در خور اعتناء سمجھا۔ ان بہی خواہان امت مسلمہ کے پاس (معذرت کے ساتھ) دو سال کے طویل عرصے میں اس موضوع کیلئے وقت نہ مل سکا جس پر ماسوائے تاسف کے اور کیا کیا جاسکتا ہے اس سلسلے میں راقم السطور کو متعدد تکلیف دہ حالات و مشکلات اور طویل و صبر آزما اور حوصلہ شکن انتظار سے دوچار ہونا پڑا۔ یہاں اسکے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ حقیقت میں اس نمبر کی اشاعت ہمارے لئے ایک تلخ تجربہ ہی ثابت ہوئی۔ کئی مرتبہ تو مایوس ہو کر اس نمبر کی اشاعت کا ارادہ ترک کرنا پڑا لیکن اسکی اشاعت کے اعلان اور قارئین کے انتظار و اشتیاق کے باعث ایسا نہ کر سکے۔ ستمبر کی ابتداء میں اس کی اشاعت حتمی تھی لیکن 11 ستمبر کے بعد عالمی حالات میں اچانک تبدیلی اور "دفاع افغانستان و پاکستان کونسل" کی سرگرمیوں میں حضرت والد صاحب کیساتھ شبانہ روز مصروفیات کے باعث اس میں تاخیر ہوتی چلی گئی اور پھر بعد کے ناگفتہ بہ حالات نے تو رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ہم اس تاخیر پر انتہائی معذرت خواہ ہیں۔ اس نمبر کی وجہ سے رسالہ کی اشاعت میں کئی ماہ کا تعطل بھی اسلئے ہوا پھر ایسی خصوصی اشاعتوں کیلئے اشتہارات ہی سہارا ہوتے ہیں لیکن اس میدان میں بھی ہمیں بالکل مایوسی ہوئی۔ لہٰذا چار ماہ کی اشاعتوں کو معطل کرنے کی قربانی بھی اسلئے دی گئی۔ امید ہے آپ ہماری مجبوریوں کو سمجھ گئے ہونگے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس نمبر میں مختلف طبقات اور مسالک کے لکھنے والوں نے اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر کے مطابق ہمیں مضامین بھیجے ہیں چونکہ ان حضرات کو ادارے نے لکھنے کی دعوت دی تھی لہٰذا ان کے مضامین کو ہم من و عن شائع کر رہے ہیں۔ انکے جملہ خیالات کیساتھ ادارے کا اتفاق ضروری نہیں ہے۔ نیز یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یہ ادار یہ افغانستان کے حالات کی اہمیت کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ورنہ اکیسویں صدی کے حوالے سے تفصیل سے لکھنے کا ارادہ تھا۔ آخر میں ہمیں امید اور دعا ہے کہ یہ معمولی کوشش امت مرحومہ کی بے جان روح میں گرمئی افکار و عمل کا باعث ثابت ہوگی اور آنیوالے قافلوں کیلئے یہ بانگ درا اور سنگِ میل کا کام دے سکے۔

مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آراء تو بھی ہو وہ چمک اٹھا افق گرم تقاضا تو بھی ہو (راشد سمیع)

خاص برائے "الحق"

شیخ اسامہ بن لادن کا خصوصی پیغام امت مسلمہ کے نام

اکیسویں صدی اسلام کی سربلندی اور عظمت کی صدی ہوگی

ان الحمدلله نحمده و نستعينه من يهده الله فهو المهتد ومن يضلل فلن تجدله ولياً مرشداً واشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له واشهد ان محمداً عبده و رسوله.

حق تعالٰی کا فرمان ہے ۔

يا ايها الذين امنوا اتقوالله حق تقاته ولا تموتن الا وانتم مسلمون.

ترجمہ : اے ایمان والو! اللہ تعالٰی سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

میرے معزز مسلمان بہنو اور بھائیو! آپ کو معلوم ہے کہ اکیسویں صدی شروع ہو گئی ہے انشاء اللہ یہ صدی اسلام کی سربلندی شان و شوکت اور اس کی عظمت و وقار کی صدی ثابت ہوگی۔ لیکن اس کے لئے ہم سب کو ایک عظیم جدوجہد سے گزرنا ہوگا اور پہلے عالم اسلام کو عالمی استعمار اور اس کے ایجنٹوں سے آزاد کرانا ہوگا۔ اور ہر محاذ پر باطل قوتوں کے خلاف جہاد کرنا ہوگا۔

جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے :

بعثت بين يدى الساعة بالسيف حتى يعبد الله وحده.

ترجمہ : مجھے قیامت سے قبل تلوار کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے۔ تاکہ کائنات میں صرف اللہ رب العزت کی عبادت کی جائے۔

اس حدیث مبارکہ دعوت الی اللہ میں تلوار کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کو

تلوار کے ساتھ کیوں مبعوث کیا گیا؟ اس کی علت بھی اسی حدیث میں درج ہے۔ فرمایا کہ

"تاکہ دنیا / کائنات میں صرف اور صرف اللہ کی عبادت کی جائے۔"

دعوت الی اللہ کا یہ طریقہ اللہ رب العزت اور اس کے پیغمبر نے بیان فرمایا ہے۔

جو بھی یہ چاہتا ہے کہ کائنات میں صرف اللہ کے دین کا بول بالا ہو' اسے اللہ اور اس کے رسول کے اس طریقہ کی پیروی کرنا ہوگی۔ ایک دوسری صحیح حدیث میں آیا ہے حضورؐ نے فرمایا۔

أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدو أن لا اله الا الله وأن محمداً رسول الله.

ترجمہ: مجھے اس وقت تک لوگوں سے قتال کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ کلمہ شہادت (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کا اقرار نہ کرلیں۔

لہٰذا دعوت الیٰ اللہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں۔ اگر غیر مسلم ہماری اس دعوت کو قبول کرلیں تو وہ ہمارے بھائی ہیں۔ بصورت دیگر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اور یہ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کائنات میں دینِ الہٰی کا الٰہی اقتدار قائم نہیں ہو جاتا۔ "حتى يكون الدين كله لله" ترجمہ: یہاں تک کہ سارا دین اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔

آج پیغمبر آخر الزمان کے پیروکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے اکثر کی حالت سیلاب کے ساتھ بہہ کر آنے والے خس وخاشاک اور جھاگ کی ہے۔ جیسا کہ حضرت ثوبانؓ سے مروی حدیث میں مذکور ہے:

لكنكم غثاء كغثاء السيل ترجمہ: لیکن تم جھاگ (بے کار) ہو گے سمندر کے جھاگ کی طرح۔

کامیابی کی راہ پر گامزن صرف وہ مسلمان ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت سے نوازا ہے اور اپنی زندگیوں میں پیغمبر اسلام ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں کی پیروی کرتے ہیں۔

مسلمانوں کیلئے لائحہ عمل متعین کرنے والی وہ ذات اقدس ہے جن کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں جو صاحب شفاعت ہیں اور قیامت کے دن نبیوں اور متقیوں کے سردار بنا دیئے گئے ہیں جن کی ہر بات حکم خداوندی ہے۔ یہ ذات حضرت سیدنا نبی آخر الزمان محمد علیہ الصلوۃ والسلام کی ہے جو حق تعالیٰ کے فرمان:

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون

ترجمہ: اور میں نے جنات اور انسانوں کو صرف عبادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔

میں بیان کردہ عبارت کے درجہ کمال اور حقیقت دنیا کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے اگر مجھے اس بات کا خوف نہ ہو تا کہ یہ عمل

میری امت کے لئے باعث مشقت بن جائے گا تو میں اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلنے والے کسی لشکر سے بھی پیچھے نہ ہوتا"

افسوس! آج مسلمان اپنے صحیح راستے اور راہنما کی تعلیمات سے منہ موڑے ہوئے ہیں حالانکہ حیات مستعار کے تقریباً تمام شعبوں میں یہ طریق کار مروجہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل اور بحرانوں میں متعلقہ شعبوں اور علوم وفنون کا ماہرین سے رجوع کیا جاتا ہے۔ مسلمان کے لئے زندگی کے تمام شعبوں میں ہدایت ور ہنمائی کا ذریعہ سیرت نبویؐ ہے۔ نبی آخر الزمان کو سنیئے! وہ اس دار فنا میں مسلمانوں کی زندگی کی حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں:

"اسی ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے شہید کر دیا جاؤں۔۔ دوسری بار مجھے زندگی عطا کی جائے پھر میں اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے شہید کر دیا جاؤں پھر تیسری بار مجھے زندگی عطا کی جائے اور پھر تیسری بار بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے مجھے شہادت کی موت نصیب ہو۔"

یہ ہیں پیغمبر اسلام جن کی تمنا ہے کہ وہ عمر بھر اللہ کی راہ میں جہاد میں مصروف ہوں اور یہ کہ انہیں بار بار زندگی صرف اس لئے نصیب ہو کہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے بار بار شہادت سے سرفراز ہوں۔ عاشق جہاد پیغمبر آخر الزمان کے امتیوں (ہم) نے کبھی سوچا ہے کہ ہمارا جہاد میں کیا حصہ ہے؟ ہم پیغمبر آخر الزمان کے اس دستور حیات پر کتنے کاربند ہیں؟

اللہ اور اس کے رسول کے دربار میں سرخرو ہونے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں لیکن ان میں سے سب سے بہترین طریقہ اللہ اور اس کے رسول کے دین کے لئے خون کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔ خصوصاً آج کے حالات میں جب کہ امت محمدیہ 'علی صاحبھا الف الف تحیۃ وسلام' پر ظلم کے انبار توڑے جا رہے ہیں۔ آج جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں اور سن بھی رہے ہیں کہ فلسطین (اور دیگر مسلم ممالک) میں مسلمانوں کو وحشیانہ انداز میں ذبح کیا جا رہا ہے اور انکی نسل کشی کی جا رہی ہے ہمیں حضورؐ کا یہ فرمان کیوں یاد نہیں آتا۔

راس الامر الاسلام وعموده الصلوة وزروة سنامه الجهاد۔

جس کا مفہوم یہ ہے کہ سب سے عظیم امر اسلام ہے جس کا ستون نماز اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔

فلسطین کے نابالغ، معصوم اور بے سہارا بچوں کو یہودی ہاتھوں اور تباہ کن امریکی ہتھیاروں کے ذریعے بے دریغ قتل کیا جا رہا ہے۔ اور ہم مسلمان ٹس سے مس نہیں ہو رہے ہیں۔ تصور کیجئے قیامت کے دن کا جب ہم سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے فلسطین کے ان مظلوموں کے لئے کیا کیا؟ ہم سب ذوالجلال کے اس سوال کا کیا جواب دیں گے؟ کیا ہم حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان کو بھول نہیں گئے ہیں کہ:

لزوال الدنیا اھون عنداللہ من قتل امرء مسلم بغیر حق

ترجمہ: یعنی اگر کوئی مسلمان ناحق قتل ہو جائے تو اس کے مقابلے میں اگر ساری دنیا مٹ جائے اللہ کے نزدیک آسان ہے۔

کیا آج دنیا کے کونے کونے میں مسلمانوں کو ناحق قتل اور نیست و نابود نہیں کیا جارہا ہے؟ کیا مسلمانوں کے مقدس مقامات کو پامال نہیں کیا جارہا ہے؟ کیا ارض معراج یہودیوں کے ناپاک قدموں تلے نہیں روندھی جارہی ہے؟ کیا بلاد حرمین غیر مسلم افواج کی آماجگاہ نہیں بنا دیئے گئے ہیں؟

کرہ ارض میں متعدد مقامات پر مسلمانوں کو نیست و نابود کیا جارہا ہے۔ فلسطین کے بعد لبنان پر نظر ڈالئے۔ کیا صابرہ اور شتیلا میں مسلمانوں کا قتل عام قصہ پارینہ بن گئے ہیں؟ اس قتل عام میں تین لاکھ سے زیادہ عورتیں اور بچے انتہائی ظالمانہ طریقے سے ذبح اور قتل کیے گئے۔ حاملہ ماؤں کے پیٹ چیر کر رحم مادر میں موجود جنین ضائع کیے گئے۔ عراق پر وحشیانہ اقتصادی پابندیاں مسلط کی گئیں جنکے نتیجے میں دس لاکھ معصوم عراقی بچے شہید کروائے گئے کیا ہم حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان کو بھول گئے ہیں۔

دخلت امراۃ النار فی ھرۃ ربطتھا لاھی اطعمتھا ولاھی ترکتھا تأکل من خشاش الارض۔

ترجمہ: یعنی ایک عورت صرف اس وجہ سے جہنم میں داخل کی گئی کہ اس نے ایک بلی کو پکڑ لیا اور اس کو بھوکا پیاسا رکھا۔ جس کی وجہ سے وہ مر گئی۔

ایمان والو! ایک بلی کو بھوک سے مارنے بالفاظ دیگر اس پر اقتصادی پابندیاں لگانے کے جرم کا ارتکاب کرنے والی کے متعلق نبی آخر الزمان فرمارہے ہیں کہ وہ جہنم میں پھینک دی جائے گی۔ کیا ہم دس لاکھ عراقی بچوں کے قتل میں معاونت کے مجرم نہیں ہیں؟ ہم نے اس ظالمانہ قتل عام کو روکنے کے لئے کیا کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ ہمیں دیگر اہم کاموں سے فرصت نہیں ہے۔ لہذا ہم اس صورت حال کے نتیجے میں وقت کی پکار۔ جہاد۔ کو ٹال رہے ہیں۔

اس سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کا اسوہ کیا ہے؟ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مسلمانوں کے پاس اطلاع آئی کہ قریش مکہ نے آنحضرت ﷺ کے سفیر حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس موقعہ پر قریش مکہ کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور بیعت کیلئے اپنا ہاتھ پھیلا دیا چنانچہ سوائے ایک منافق الحر بن قیس کے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی۔ کیا حضور اکرم ﷺ کی قائم کی ہوئی مثالیں ہمارے لئے واجب التقلید اور واجب الاتباع نہیں ہیں؟

برادران اسلام! اللہ سے اپنے گناہوں اور غفلت کی معافی مانگو اور نام نہاد ضروری امور سے چھٹکارہ

حاصل کر کے وقت کی پکار ۔ جہاد۔ پر لبیک کہو۔ کرہ ارض کے کئی حصوں میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ بوسنیا کے مسلمانوں کو گائے بکریوں کی طرح ذبح کیا گیا عیسائی سربوں کی طرف سے ان کا قتل عام برسوں تک جاری رہا۔ اس دوران امریکہ نے مظلوم مسلمانوں تک اسلحہ پہنچانے کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لئے بوسنیائی حکومت اور بوسنیائی مسلمانوں پر فوجی پابندیاں عائد کر دیں جن کی وجہ سے ان مظلوم مسلمانوں تک اسلحہ پہنچانا "بین الاقوامی جرم" بنا دیا گیا۔ چیچنیا میں مسلمانوں کو بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں تلے کچلا جا رہا ہے۔ انڈونیشیا میں مسلمانوں کو مساجد کے اندر عبادت کرتے ہوئے بھسم کیا جا رہا ہے۔ کشمیر کے مذبح خانوں سے کون واقف نہیں ہے۔ جہاں آزادی کی شمع روشن کرنے والوں کو بے دریغ قتل کیا جا رہا ہے۔ آخر ہم کب اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے حضور اکرم ﷺ کی تابعداری کرتے ہوئے غیرت و حمیت اسلامی کا اظہار کرتے ہوئے علم جہاد بلند کریں گے۔ یاد رکھیئے وقت کی پکار جہاد ہے۔ کندھے سے کندھا ملا کر دشمنان اسلام کے خلاف بنیان مرصوص بن جایئے اور اپنے رب اور پیغمبر آخر الزمان کی رضا حاصل کیجئے۔ مسلم حکمرانوں سے کوئی بھی توقع مت رکھیں، انہوں نے تو شرم الشیخ جیسی شرمناک کانفرنسوں میں مسلمانوں کا سودا کر لیا ہے اللہ ہمیں اپنے دین کی نصرت عطا فرمائے۔ امین

مردِ مسلمان

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن!
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایہ جبریل امیں بندۂ خاکی!
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

امت مسلمہ کے اندازِ فکر میں انقلاب کی ضرورت

اس وقت ہم "مسلمانان عالم "امت مسلمہ" کے بارے میں جو نظریہ رکھتے ہیں اور اس کو جس نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں وہ فکر و نظر کا ایک افسوسناک انقلاب ہے۔ ایک طویل عرصہ سے ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ امت مسلمہ اس سے زیادہ کچھ حیثیت و حقیقت نہیں رکھتی کہ وہ دنیا کے بہت سے انسانی جتھوں میں سے ایک جتھا ہے جو اس ربع مسکون کے مختلف حصوں میں تقسیم ہے، مختلف کمروں اور مختلف گوشوں میں پھیلا ہوا ہے، اس میں مختلف قوموں، نسلوں اور ملکوں کے لوگ شامل ہیں۔ مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مقامی معاشرت و معیشت رکھنے والے اس کے حلقۂ متعبین میں ہیں۔ جگہ جگہ اسکے گرد و پیش مخصوص مقامی حالات و مخصوص ماحول ہے، اس کی طاقتیں اور صلاحیتیں اور اسکے مادی وسائل و ذرائع ہر جگہ محدود ہیں .... اسکی ان مختلف در مختلف شاخوں اور حصوں میں قدر مشترک دو .... اور صرف دو .... مسلم بنیادیں اور حقیقتیں ہیں، ایک "عقیدہ کی وحدت" دوسری "مغرب کی دریوزہ گری اور مرعوبیت، اور سیاست و معیشت میں اس پر کلی انحصار و اعتماد۔"

دنیا کے نقشہ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اپنی ذات اور اپنی قیمت و حیثیت کا اندازہ ہم انھیں طاقتوں اور انھیں مادی وسائل و امکانات .... مواد خام ملکی آمدنی و تحصیل، تعداد نفوس اور فوجی طاقت و قوت .... کی بنیادوں پر کرتے ہیں، اسی میزان و معیار پر ہم اپنے کو تولتے ناپتے ہیں، اور فیصلہ کرتے ہیں کہ فلاں ملک و مقام پر ہم کچھ قوی ہیں، ہمارا پلڑا بھاری ہے اور فلاں ملک و مقام میں ہلکا۔ بعض وقت ہم کو اپنا وجود بالکل بے وزن نظر آنے لگتا ہے، اور بعض حالات میں ہم اپنے کو موثر اور وزنی محسوس کرنے لگتے ہیں، بحیثیت مجموعی ہم اپنی کوئی خاص طاقت و قیمت نہیں پاتے۔

ہم نے آج مغرب کی امامت و پیشوائی کو ایک ناگزیر اور لابدی شئے سمجھ لیا ہے، اس پر اس طرح ایمان لے آئے ہیں جیسے اس میں کسی تغیر و تبدیلی کا امکان ہی نہیں، تاریخ اسلام میں ایک وقت آیا تھا جب مسلمانوں کی زبانوں پر یہ فقرہ چڑھا ہوا تھا "إذا قيل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق" (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی تو یقین مت کرنا (۱) مسلمانوں کی بد قسمتی سے یہی جملہ ایک

---

(۱) ساتویں صدی ہجری میں جبکہ تاتاری عالم اسلام پر چڑھ آئے تھے، اور اس سرے سے اس سرے تک ان سے مرعوبیت اور دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ یہ جملہ اسلامی معاشرے میں زبان زد خاص و عام تھا، اور تاریخ میں بالاتفاق منقول و ماثور ہے۔

دوسرے عنوان سے پھر مسلمانوں میں رائج ہو گیا ہے، اور انکا عقیدہ و ایمان بنتا جا رہا ہے کہ مغرب ناقابل شکست ہے اور موجودہ حالات میں تبدیلی خارج از بحث ہے۔

ہمارا حال یہ ہے کہ ہم مغرب سے آنکھیں ملانے کا تصور تک نہیں کر سکتے، اور اگر کبھی ہم اپنی "دانش مندی و دور اندیشی" اور علم و مطالعہ و تجربہ سے نظریں بچا کر اس کی مخالفت کا تصور دل میں لاتے بھی ہیں تو ہم اپنے امکانات و وسائل، اپنی مادی قوت و طاقت، عسکری صلاحیت اور جنگی انتظامات کا جائزہ لینے لگتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ جدید ایجادات اور ایٹمی آلات حرب میں ہمارا کیا حصہ ہے؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم پر یاس و حرماں نصیبی اور اپنی شومئ قسمت کا احساس طاری ہو جاتا ہے، ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم دنیا میں ضعف و پستی اور ذلت و خواری ہی کیلئے پیدا کیے گئے ہیں، ہماری اپنی کوئی زندگی نہیں، ہم مغربی قوموں کے حاشیہ بردار اور دست نگر بن کر زندگی گزار سکتے ہیں، زندگی کی اس دوڑ میں خود ہمارا کوئی حصہ نہیں، ہم دنیا کے اس اسٹیج پر کوئی اہم پارٹ ادا نہیں کر سکتے، ہماری قسمت میں ہی مقدر ہے کہ ہم مغرب کے دو "حریف خاندانوں" میں سے کسی ایک کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دیں اور اس کے رحم و کرم پر زندگی گزاریں۔ یہی انداز فکر ہے جو آج تمام عالم اسلام پر چھایا ہوا ہے، تمام مسلم اقوام و مسلم ممالک اسکے شکار ہیں، کیا عرب، کیا عجم ہر جگہ یہی ذہن کام کر رہا ہے، ممالک عربیہ سے لیکر پاکستان، انڈونیشا و ترکی تک کے مسلمان اسی طرز پر سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہندوستان، چین، شام و برما (جہاں مسلمان اگرچہ اقلیت میں ہیں لیکن کثیر تعداد میں ہیں) اس سے آگے ایک حرف نہیں سوچتے، اسی انداز فکر کو اس وقت تمام اسلامی دنیا میں صحیح، دانشمندانہ اور علمی انداز فکر سمجھا جاتا ہے، اور یہی بلند سے بلند پرواز فکر ہے

لیکن تاریخ عالم بتلاتی ہے کہ اسی عالم اسباب و عالم مادی میں ایک جماعت انسانی ایسی بھی پائی گئی ہے جو اس انداز فکر اور اس منطق و استدلال کو قبول کرنے سے انکار کرتی رہی ہے، اس جماعت کا اپنا ایک مخصوص طریق فکر و طریق عمل ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اس جماعت کے افراد نے اپنے مقاصد میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کی ہے، دنیا کے تمام انقلابات میں اصلح و افضل، اعلیٰ و مفید تر انقلابات کا وجود انہیں کے دم سے ہوا، ان کے اس انداز فکر پر تاریخ کے ان قوی ترین و عظیم ترین انقلابات کی بنیاد ہے جنہوں نے دنیا کے مسلمات و مزعومات اور رسوم و قیود کو اس طرح بدل ڈالا ہے کہ عالم انگشت بدنداں رہ گیا ہے، یہ وہ انقلابات ہیں جس نے ایک طویل مدت کی سیاہ بختی کے بعد دنیا کو آفتاب سعادت کا نور بخشا ہے، اور ایک وسیع ابتری، ایک عالمگیر فساد کے بعد معاشرۂ انسانی کو طمانیت و راحت کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔

تنہا یہی وہ طریق فکر ہے جس میں ان پسماندہ و شکست خوردہ، کمزور و بے سر و سامان قوموں کے

لئے نوید جاں فزا ہے، جن کے پاس دنیا کے لئے کوئی صالح و صحیح دعوت و پیغام ہو۔

کوئی امت جس کا سرمایۂ امید اور منتہائے علم و نظر محض علم اسباب و خواص اشیاء ہی ہو، جو مادیات و محسوسات اور سازو سامان اور اس کی کثرت و فراوانی ہی پر سارا دارو مدار و انحصار سمجھتی ہو، جس کا یقین ان اشیاء عالم و مادیات عالم سے آگے کسی چیز پر نہ ہو اور پھر جس چیز پر اس کا یہ یقین و ایمان ہے اس میں وہ دیوالیہ بھی ہو .... تو اس کے لئے سوائے مایوسی و افسردگی اور نوحہ و ماتم کے اور کیا ہے؟ اُس کی ناامیدی و یاس کا کیا ٹھکانا جس کے درد کی دوا موت کے سوا کچھ نہ ہو ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے

آپ سوال کریں گے کہ ایسی بھی کوئی جماعت ہو سکتی ہے جو اپنے گرد و پیش سے آنکھیں بند کر کے سوچ سکتی ہو اور اگر ہو بھی سکتی ہے تو پھر وہ کامیاب و بامراد بھی ہو سکتی ہے؟ آپ اس کیلئے تاریخ کی کوئی مثال اور کوئی عملی نمونہ چاہیں گے، ذرا ماضی کے اوراق الٹئے اور "صحف صادقہ" اور "وحی آسمانی" کی طرف کان لگایئے۔

سرزمین مصر پر ایک ظالم و جابر "بادشاہ" فرمانروا ہے جس نے قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے، ان کے ساتھ جانوروں اور چوپایوں کا سا معاملہ کرتا ہے، ان کے اندر نہ کوئی حوصلہ اور امنگ ہے نہ کوئی ولولہ اور جوش، ان کا "حال" پریشان، مستقبل تاریک، تعداد کے اعتبار سے ایک حقیر اقلیت، سامان کے لحاظ سے فقیر و بے بضاعت، اہمیت کے اعتبار سے حقیر و بے حیثیت، دشمن قاہر و زبردست، ظالم و بے درد، خود بیکس و بے بس، بے یار و مددگار، نہ دوست نہ غمخوار، نہ حامی نہ مددگار، ایک حتمی و یقینی انجام۔ ہلاکت آنکھوں کے سامنے، اور انجام سے پہلے جب تک زندہ ہیں بدبختی و بدنصیبی، مصیبت و کلفت زندگی کیساتھ، نمک بر جراحت یہ کہ ظالم نسل کشی پر آمادہ، اور قومی زندگی کے بقاو تسلسل کا دشمن ہے۔

اس خونی، بھیانک اور ہلاکت خیز ماحول میں موسیٰؑ پیدا ہوتے ہیں، فرعون جو بادشاہ وقت ہے، چاہتا ہے کہ موسیٰؑ پیدا نہ ہوں مگر وہ پیدا ہوتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ زندہ نہ رہیں مگر وہ زندہ رہتے ہیں، لکڑی کے ایک سربمہر صندوق میں رہنا پڑتا ہے مگر وہ وہاں بھی زندہ رہتے ہیں، نیل کی بے شعور و بے درد موجوں کے حوالے کردئے جاتے ہیں مگر پھر بھی زندہ رہتے ہیں، حتی کہ اللہ کی قدرت اپنا تماشہ دکھاتی ہے کہ وہ اپنے سب سے بڑے دشمن، خونی و وحشی جلاد کی گود اور اس کی حفاظت و نگرانی میں پلتے بڑھتے ہیں، دوربین، بیدار مغز پولیس کی عقابی نگاہوں سے وہ مستور و مخفی رہتے ہیں، پھر ان کو مصر سے جلاوطن ہونا پڑتا ہے، مسافرت و کسمپرسی کی حالت میں ایک درخت کے سایہ میں پناہ لیتے ہیں، لیکن اللہ ان کے

لئے ایک باعزت و کریمانہ ضیافت کا اہتمام کرتا ہے، حتی کہ اس اجنبیت و غربت میں ان کے لئے اسباب سکینت وطمانیت (لتسکنوا إلیھا) بھی مہیا فرماتا ہے............ پھر وقت آتا ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ کو لے کر واپس ہوتے ہیں، اثنائے راہ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے، راستہ بھیانک اور سنسان ہے کہ اہلیہ محترمہ دردِ زہ میں مبتلا ہوتی ہیں، موسیٰ کو آگ کی تلاش ہوتی ہے تاکہ بیوی رات کی اس ناقابل برداشت سردی میں کچھ تاپ کر آرام حاصل کر سکیں، لیکن یہاں قدرتِ الٰہی کچھ اور کرشمے دکھاتی ہے، آگ کی تلاش کے نتیجہ میں انہیں وہ نور اور وہ روشنی حاصل ہوتی ہے جس سے سارے عالم کو منور و فیض یاب ہونا ہے، موسیٰ صرف ایک عورت کے لئے مدد و چارہ سازی چاہتے ہیں لیکن اللہ انہیں اس وقت کی تمام انسانیت کی چارہ سازی اور سامان راحت و سکونیت عطا فرماتا ہے اور انہیں پیغمبری ورسالت کی دولت وعزت سے سرفراز فرماتا ہے ۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں، پیمبری مل جائے

موسیٰ فرعون کے پاس آتے ہیں، فرعون شان و شوکت اور اپنے نشۂ حکومت وسطوت میں سرشار ہے، اپنے روساء وانصار اور مصاحبین واہل دربار کے ساتھ سریر آرا ہے، یاد رہے کہ یہ وہ موسیٰ ہیں جن کی کل تک تلاش تھی، اور جن کے قتل و گرفتاری کے لئے فوج اور پولیس سرگرداں تھی، جرم ان پر ثابت ہو چکا ہے، اس جرم کے مطابق اب وہ مدعا علیہ ہیں، مزید یہ کہ زبان میں لکنت بھی ہے...... ان کا پہلو اور موقف نہایت کمزور، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرعون، اسکے مصاحبین واہل دربار، ان کے پیغام ورسالت، ان کے عقیدہ وایمان اور اس کی صداقت و حقانیت پر انکے بحث واستدلال اور ان کے اظہار واعلان پر غضبناک ہو جاتے ہیں، فرعون ساحران مصر کو موسیٰ کے مقابلہ کیلئے بلاتا ہے تاکہ ان کے زورِ فن سے معجزات موسیٰ کا جواب دے اور ان کو بیکار و غیر مؤثر ثابت کرے، کہ اس نے ان کو مداری کا کرتب اور جادو کا کھیل سمجھا تھا، اللہ تعالیٰ ہمیشہ کی طرح یہاں بھی بالکل خلاف امید اور ظاہری اسباب کے برعکس موسیٰ ہی کا پلہ بھاری رکھتا ہے۔ سارے کے سارے جادوگر دیکھتے ہی دیکھتے سپر انداز ہو جاتے ہیں، موسیٰ کی برتری تسلیم کر لیتے ہیں، اور زبان سے کہتے ہیں آمنا برب العالمین رب موسی و ہارون (ہم ایمان لائے مالک دو جہاں پر، ہم ایمان لائے موسیٰ وہارون کے رب پر)

ابھی اور سنئے، موسیٰ کو حکم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو راتوں رات سرزمین ظلم وجور سے نکال کر مقام امن و نجات کی طرف لے جاؤ، فرعون کو پتہ لگ جاتا ہے، وہ اور اس کی افواج پیچھے پیچھے ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی مصلحت و مشیت یوں نمودار ہوتی ہے کہ موسیٰ راستہ بھول جاتے ہیں اور بجائے شمال

و مشرق کے عین مشرق کی سمت روانہ ہوتے ہیں .... سپیدۂ سحر کے ساتھ ساتھ سمندر کی لہریں جھلملاتی نظر آئیں، سامنے لہریں لیتا ہوا سمندر تھا پیچھے مڑ کر دیکھا تو ظالم دشمن کی فوجوں کا سمندر موجیں مار رہا تھا، بنو اسرائیل کی حالت چکی کے دوپاٹ کے درمیان حقیر و بے بس دلنہ ہائے گندم کی تھی، کہ اللہ کی مدد .... وہی خلاف قیاس و خلاف اسباب و خلاف عقل و فہم مدد .... نمودار ہوتی ہے، سمندر پایاب ہو جاتا ہے، کئی جگہ سے پانی پھٹ جاتا ہے، سمندر پر خشکی کے راستے بن جاتے ہیں اور وہ رُکا ہوا پانی بلند ٹیلوں اور عظیم دیواروں کی شکل میں کھڑا ہو جاتا ہے، موسیٰ اور ان کی قوم سمندر عبور کر لیتی ہے، فرعون بھی اپنی فوج کے ساتھ انہیں راستوں پر چل پڑتا ہے، لیکن سمندر کی پُر غضب موجیں فرعون اور اس کے پورے لشکر کو لقمۂ نہنگ بنا لیتی ہیں، اور ہمیشہ کے لئے وہ سب وہیں غرق ہو جاتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح فرعون اور اس کی ساری کی ساری طاقتور، دولتمند اور اسباب و وسائل سے ہر طرح لیس و مسلح قوم ایک بے سر و سامان، و بے ہتھیار قوم کے مقابلہ میں ہلاک ہو کر رہ گئی، اور بالآخر وہی مفلس و بے ساز و سامان قوم بنی اسرائیل زمین کی مالک و مختار بنی۔

وأورثنا القوم الذين كانوا يستضعفون مشارق الارض و مغاربها التى باركنا فيها و تمت كلمة ربك الحسنىٰ علىٰ بنى اسرائيل بما صبروا و دمرنا ما كان يصنع فرعونُ و قومه و ما كانوا يعرشون

”اور وارث کیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور ہو رہے تھے اس زمین کے مشرق و مغرب کا کہ جس میں ہم نے برکت رکھی ہے، اور پورا ہوا تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر، اس بنا پر کہ وہ ٹھہرے رہے، اور برباد کر دیا ہم نے وہ جو بنایا تھا فرعون اور اس کی قوم نے اور وہ جو انگور چڑھایا کرتے تھے چھتریوں پر۔“

آپ ذرا غور کریں وہ کون سی طاقت ہے اور اس میں کیا راز ہے جس کی بنا پر موسیٰ نے اپنے ملک اور اپنے زمانے کی سب سے بڑی (سپر پاور) طاقت پر غلبہ حاصل کیا، اور بنی اسرائیل جیسی نہتی قوم نے اپنے کثیر التعداد اور کثیر الوسائل حریف پر فتح پائی، وہ کون سا ہتھیار ہے جس کو لے کر انہوں نے عظیم الشان اور زبردست دشمن کا مقابلہ کیا اور اسے زیر کیا، اور اپنے باغی و حیات کش ماحول کو اپنے ہم مرضی اور تابع بنا لیا؟

موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن مجید میں آپ نے بارہا پڑھا ہوگا، ایک مرتبہ پھر اس نقطۂ نظر سے اور اس سوال کو سامنے رکھ کر پڑھ جایئے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ہتھیار جس کے ذریعہ موسیٰ فرعون اور اس کی قوم کا مقابلہ کر سکے اور بنی اسرائیل غالب آئے اور جس کی بدولت مصر اور ”مشارق

الارض و مغاربها" کے وہ وارث و مالک بنے وہ صرف "ایمان" "اطاعت" اور "دعوت الی اللہ" کی طاقتیں ہیں، یہ ایمان اور یہ اطاعت گزاری اور جذبہ دعوت اس پورے قصہ کی جان اور اس کا اصل عنوان ہے، یہ پیغمبرانہ ایمان اس وقت عیاں ہوتا ہے جب موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کو پیغام الٰہی پہنچاتے ہیں، یہ ایمان ہی کی تو طاقت تھی جس کی بنا پر موسیٰ علیہ السلام فرعون کی سیاست اور شاطرانہ چالوں اور موشگافیوں سے پست نہیں ہوئے، اور بالآخر غالب آئے، وہ چاہتا ہے کہ موسیٰؑ کو ان کے اصل موضوع و مقصد سے ہٹا دے، اور ان کو دوسری باتوں میں پھنسا لے، کبھی چاہتا ہے کہ اپنے مصاحبین و درباریوں کو ان کے خلاف بھڑکا دے، لیکن موسیٰؑ اپنی دعوت اور اپنے اصل پیغام پر جمے رہتے ہیں، اپنے راسخ العقیدہ یقین و ایمان و عقیدہ کو ایک لمحہ کے لئے نہیں بھولتے، ان کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش اور تزلزل نہیں پیدا ہوتا، فرعون کہتا ہے "مارب العالمین" تمام عالموں کا رب (جس کا بار بار تمہارے منہ سے تذکرہ سنتا ہوں) کون ہے؟ جواب دیا "رب السماوات و الارض و ما بینهما إن کنتم موقنین" (وہ جو تمام آسمانوں اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان کے درمیان ہیں پیدا کرنے والا ہے اگر تم یقین کرو) فرعون غصہ میں بھر جاتا ہے، چاہتا ہے کہ اہل مجلس بھی غصہ ہو جائیں، اپنے گرد والوں سے کہتا ہے "ألا تستمعون" کیا سنتے نہیں ہو، لیکن موسیٰؑ اپنی بات چھوڑتے نہیں، فرماتے ہیں "ربکم و رب آبائکم الاولین" (رب العالمین وہ ہے) جو تمہارا اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا رب ہے، فرعون غصہ سے بے قابو ہو جاتا ہے اور جھنجھلا کر کہتا ہے "إن رسولکم الذی ارسل إلیه لمجنون" یہ تمہارے لئے پیغام لے کر آنے والا مجنوں ہے، موسیٰؑ اب بھی اس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے، اور اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہیں، "قال رب المشرق و المغرب و ما بینهما إن کنتم تعقلون" فرمایا وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کا پیدا کرنے والا ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو، (تو جانو)

اس کے بعد فرعون انتہائی سیاست سے کام لے کر ایک بہت خطرناک موضوع چھیڑتا ہے اور ایک بہت اشتعال انگیز سوال کرتا ہے، پوچھتا ہے "ما بال القرون الاولی" "ان گزشتہ لوگوں کی کیا کیفیت ہے؟ (ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے) لیکن موسیٰؑ اپنے پختہ اور قوی ایمان اور پیغمبرانہ حکمت عملی کی وجہ سے موقع کی نزاکت پر غالب آجاتے ہیں، جواب دیتے ہیں "علمها عنده ربّی فی کتاب لا یضل ربی و لا ینسی" "ان کی خبر میرے رب کے پاس لکھی ہے، نہ بہکتا ہے میرا رب، نہ بھولتا ہے......... اور اتنا کہہ کر اپنی پہلی بات، اپنے معبود حقیقی اور خدائے بے ہمتا و لاثانی کی ثنا و تعریف میں پھر لگ جاتے ہیں، کہنے لگتے ہیں "الذی جعل لکم الارض مهداً و سلك لکم فیها سبلاً

وانزل من السماء ماءً فاخرجنا به ازواجاً من نباتٍ شتی" (میرا رب) وہ ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا، اور چلائیں تمہارے لئے اس میں راہیں اور نازل کیا آسمان سے پانی، پھر نکالے ہم نے اس میں سے مختلف قسم کے بہت سے سبزے۔

اس ایمان و یقین کا سب سے زیادہ کامل اور واضح ظہور اس وقت ہوتا ہے جبکہ موسیٰؑ اپنے سامنے موجیں مارتا ہوا سمندر دیکھتے ہیں، پیچھے دیکھتے ہیں تو دشمن کی فوج جوش غضب میں موجیں مار رہی ہے، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، نہ ایک قدم آگے بڑھنے کی گنجائش، نہ ایک قدم پیچھے ہٹنے کی، وہ اور ان کی ساری قوم گویا چکی کے دوپاٹوں کے درمیان تھی جہاں پس کر ہلاک ہو جانے کے سوا کوئی صورت فرار نہیں، بنو اسرائیل کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے دہشت اور خوف و اضطراب میں واویلا کرتے ہیں "إنا لمدرَکون" ہم تو فرعون کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہوئے۔ لیکن موسیٰؑ ہیں کہ اپنی جگہ کوہِ استقامت، ایک لمحہ کے لئے دل میں کوئی شبہ واندیشہ نہیں ہوا ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی حوصلہ مند اور پر امید ہیں، انہیں یقین ہے کہ ان کا اللہ اپنے بندے کا مددگار ہے، وہ اپنا وعدہ ضرور پوا کرے گا، پورے حزم و وثوق کے ساتھ اعلان فرماتے ہیں۔ "کلا إن معی ربی سیہدین" ہر گز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھ کو راستہ دے گا۔

آپ دیکھئے کہ ان حالات میں کہ جب بنی اسرائیل مصر میں ذلت و مشقت اور عسرت و فقر اور بدبختی و درماندگی کی زندگی گزار رہے ہیں، ظلم و استبداد کی شقی ترین قسموں اور صورتوں کو جھیل رہے ہیں ان کو کس بات کی ہدایت کی جاتی ہے؟ ان مصائب و آلام سے چھٹکارا پانے کیلئے ان کو کس چیز کا حکم دیا جاتا ہے؟ ان سے نہیں کہا جاتا .... اگرچہ عقل کی میزان میں اور آج کی دنیا میں یہی اس کا واحد حل ہے .... کہ مادّی اسباب اور ذرائع و وسائل پر اپنی پوری توجہ مرکوز کردو، حتی کہ فرعون اور اس کی قوم کے انتظامات اور ساز و سامان اور آلات و وسائل تمہارے سامنے ماند پڑ جائیں، تاکہ پھر اس پر غلبہ حاصل کر سکو، بلکہ ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کو پکارو، اس کی طرف متوجہ ہو اس کی قدرت، طاقت اور حاکمیت کا یقین پیدا کرو، اطاعت و فرمانبرداری کی شرط پر اس کی مدد و نصرت کے وعدے پر راسخ و کامل ایمان رکھو، اس پر بھروسہ واعتماد کرو، اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو قوی کو، یہاں تک کہ اللہ کی مدد کے مستحق ہو جاؤ، اور تمہارے اندر نیابت الٰہی اور خلافت ارضی کی صلاحیت اور شان پیدا ہو جائے، اس وقت ہم اس کا خارجی ظہور بھی کر دیں گے۔

و أوحينا إلىٰ موسىٰ و أخيه أن تبوأ لقومكما بمصر بيوتا و اجعلوا بيوتكم قبلةً و أقيموا الصلوٰة و بشر المومنين

"اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کو کہ ٹھہراؤ اپنی قوم کے واسطے مصر میں سے گھر اور بناؤ اپنے گھر قبلہ کی طرف، اور قائم کرو نماز اور خوش خبری دے دو ایمان والوں کو۔"

اطاعت و فرماں برداری کی مثال دیکھئے، آپ دیکھیں گے کہ حکم الٰہی کے سامنے سر جھکا دینے اور بے چون وچرا اور بسر و چشم بات مان لینے میں پیغمبر کس حد تک بڑھے ہوتے ہیں، حال یہ ہے کہ اچانک حکم ہوتا ہے "إذهب إلىٰ فرعون انه طغىٰ" (جاؤ فرعون کے پاس اس نے بہت سر اٹھایا ہے) اور یہ فرعون ہے کون؟ کس کے پاس جانے کا حکم ہو رہا ہے؟ بادشاہ وقت کے پاس وہ بھی ایسا کہ جو غضب ناک اور جوش انتقام سے بھرا ہوا ہے جس کی گرفت شیر کے چنگل سے کم نہیں، جس کے دبدبہ و سطوت کے سامنے کوئی چیز ٹھہرتی نہیں، اس فرعون کے سامنے اور ان ناموافق حالات میں موسیٰؑ کو اس کے پاس دعوت و پیغام لے جانے کا حکم دیا جا رہا ہے لیکن موسیٰؑ جاتے ہیں، بلا توقف و تردد قصر شاہی کا رخ کرتے ہیں، اس بادشاہ کے دیوان خاص میں جاتے ہیں جو خدائی و ربوبیت کا دعویدار ہے، اور اس کو دعوت دیتے ہیں کہ اللہ واحد و قہار کی عبادت کرے، اس کو خدا مانے اور اس کے آگے سر جھکائے، اور یہی نہیں کہ ایک دفعہ کہہ کر اور اعلان حق کر کے فرصت پا جائیں، موسیٰؑ اپنی اس دعوت اور جد و جہد اور اپنے وعظ و ارشاد میں لگے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اللہ جو کہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ان کے اور ان کی قوم کے درمیان انصاو حق کو فیصل فرما دیتا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ "ایمان و اعتماد" "اطاعت و فرمانبرداری" اور "دعوت الی اللہ" ہی وہ طاقت تھی کہ جس سے موسیٰؑ نے مشکلات زمانہ کا مقابلہ کیا اور جس کے ذریعہ اور جن کی بدولت سطح زمین کی سب سے بڑی شہنشاہی .... اسی شہنشاہی پر کہ جو باعتبار تمدن سب سے زیادہ ترقی یافتہ باعتبار وسعت سب سے زیادہ وسیع، باعتبار اسباب و وسائل سب سے زیادہ غنی اور سرمایہ دار اور باعتبار شوکت و دبدبہ سب سے زیادہ عظیم و باہیبت تھی .... فتح و غلبہ حاصل کیا۔

اگر موسیٰؑ آج کے مفکرین و قائدین کی طرح بنی اسرائیل کے صرف ایک مفکر و لیڈر ہوتے، اور اسی طرح سوچتے جس طرح آج کے "سیاست دان" زعماء سوچتے ہیں، اگر وہ ان اسباب و وسائل اور امکانات و مواقع کا جائزہ لیتے جو اس وقت ان کی قوم کو حاصل تھے، اور ہر چیز کو واقعیت اور حکمت عملی کے ترازو سے تولتے .... اور دوسری طرف وہ لوازمات شاہی دیکھتے، تعداد و مقدار اور ساز و سامان دیکھتے، فرعون کی افواج اور آلات حرب دیکھتے، اس کی ثروت و دولت اور احوال دیکھتے .... اور کیا انہوں نے دیکھا نہ تھا؟ کیا ان چیزوں سے وہ واقف نہ تھے؟ جبکہ ان کے مرکز عین قصر شاہی میں انہوں نے پرورش پائی اور جوانی تک وہیں رہے، لیکن اس کے باوجود ان کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی، اور

اس سب کو کسی شمار و قطار میں نہ لائے .... لیکن اگر وہ ایسا کرتے، اور ان چیزوں کو اہمیت دیتے اور نظروں میں لاتے، اور پھر ان چیزوں میں فرعون کی قوم سے اپنی قوم کا مقابلہ کرتے، تو کیا میزان "عقل" میں آج اور آج کے قانون سیاست میں ان کے لئے یہ جائز ہوتا اور ان کے لئے اس بات کا امکان اور گنجائش ہوتی کہ وہ فرعون کا مقابلہ کریں، اور اس سے وہ بات کہیں جو اس کے لئے سخت ناراضگی اور غیظ و غضب کا باعث بنے؟ آج کی عقل سلیم اور حکمت و سیاست اور فہم و فراست کی رو سے تو ضروری تھا کہ وہ اس جرأت بیجا کا تصور تک نہ کریں، بالکل فیصل شدہ اور یقینی راستہ ان کے سامنے یہ تھا کہ اپنی اور اپنی قوم کی حالیہ قسمت و نصیب پر قانع و مطمئن ہو جائیں، زمانہ کے حالات سے متفق ہو جائیں، وقت کے دھارے پر بہتے رہیں اور اپنی قوم کو بھی تلقین کریں۔

زمانہ باتونہ سازد توبا زمانہ بساز

نتیجہ یہ ہوتا کہ نہ ایمان کی ہوا چلتی، نہ صلاح و تقویٰ کے باغ لگتے، نہ اخلاق ہوتے نہ اعمال ہوتے، نہ شرافت ہوتی نہ انسانیت۔

لیکن یہ ہوتا کیسے، موسیٰؑ "قومی رہنما" نہیں تھے، خود ان کی رہنمائی کی جاتی تھی، وہ نبی تھے، ان کے سامنے اللہ کی ہدایتیں اور ان ہدایتوں پر عمل کرنے پر اس کی طرف سے نتائج و انعامات کے وعدے تھے، وہ ایک داعی اور اللہ کے دین کے مبلغ تھے، ان کا طرزِ فکر و عمل مبلغین و اہل دعوت کا تھا اور فکر و عمل کا یہی وہ طریقہ ہے جس نے بارہا تاریخ کے دھارے بدل دیئے ہیں، یا وہ طاقت ہے جس کی کرشمہ سازی سے عجائب و خوارق کا ظہور ہوا ہے، جس نے بارہا عقل و دانش کو دم بخود کر دیا ہے۔

رسولوں کے سردار، سید الانبیاء اور خاتم الرسل محمد بن عبداللہ ﷺ کی حیات مبارکہ سب سے زیادہ مفصل اور واضح آپ کے سامنے ہے، اگر آپ نے بھی عام رہنماؤں کی طرح سوچا ہوتا، اور وہ اسباب و وسائل اور لوازمات و انتظامات کہ جو قریش کے پاس تھے آپ نظروں میں لاتے .... اگر آپؐ نے وقت کی ان دو عظیم الشان شہنشاہیوں کی طرف نظر کی ہوتی، جنھوں نے اس وقت کے تمام آباد اور متمدن خطۂ زمین کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا یعنی شہنشاہیت روم اور شہنشاہیت ایران، اور وہ تمام طاقتیں اور اختیارات و اقتدارات کہ جن سے وہ بہرہ مند تھے، آپؐ نظر میں لاتے، اور آپؐ ایسا کر سکتے تھے، بالخصوص جب کہ آپؐ ان کی طاقت و قوت اور ان کی وسعت مملکت سے واقف تھے، اور ان کا پورا اندازہ رکھتے تھے، اور کیوں نہ رکھتے کہ آپ پیغمبرانہ فہم، ہوش و بیدار مغزی رکھتے تھے لیکن پھر بھی آپؐ کی سیرت مبارکہ بتلاتی ہے کہ آپؐ نے بالکل ان چیزوں کو کوئی اہمیت نہ دی، اگر آپؐ نے ایسا کیا ہوتا تو کیا میزان عقل اور قانون خرد میں یہ جرأت مناسب و معقول ہوتی کہ آپؐ تمام انسانیت کو اپنے پیغام کا مخاطب بنائیں، اور

یہ کہ اس عہد کی دنیا کے دو مالک و خود مختار اور مغربی و مشرقی شہنشاہیوں کے دونوں سربراہوں کو یہ خط لکھیں کہ وہ اسلام کی دعوت قبول کریں، اگر آپؐ نے اس طرح سوچا ہوتا تو وہی صورت حال اور عالم کا وہی نقشہ جو اس وقت عالم پر چھایا ہوا تھا اور صدیوں سے چھایا ہوا تھا اب بھی قائم رہتا، اور شاید ہمیشہ کے لئے دنیا کی قسمت میں یہی صورت حال لکھ دی جاتی، اگر فتح و ظفر کا انحصار و دارومدار انہیں مادیات و وسائل پر آپؐ سمجھتے تو کب وہ دن آتا جب آپؐ پر ایمان لانے والی ایک مٹھی بھر جماعت اس قوت و طاقت اور سامان و وسائل کی مالک ہوتی جو ان دو عظیم شہنشاہیوں کی قوت و طاقت کا مقابلہ کر سکے؟ بلکہ نہیں آپؐ تو اس قوت و طاقت کو سوچتے جو ان سے بھی بڑھی ہوئی ہو، اور جو ان کو شکست دے سکے اور ان پر غلبہ حاصل کر سکے، اور اگر انہیں چیزوں پر دارومدار ہوتا تو کب تک آپؐ کے لئے واجب اور ضروری ہوتا کہ آپؐ انتظار فرماتے رہیں؟ پھر اس وقت اس دنیا اور اس انسانیت کا کیا انجام ہوتا؟ یقیناً انسانیت کی قسمت پر مہر لگ گئی ہوتی، اور یاد رہے کہ یہ مہر پھر قیامت تک کبھی نہ ٹوٹتی، افق انسانیت پر صبح سعادت کا طلوع کبھی نہ ہو پاتا، اور انسانیت کی تاریخ موجودہ تاریخ کے بجائے کچھ اور ہوتی۔

لیکن اللہ کو ابھی انسانیت کے ساتھ خیر مقصود تھی، اللہ نے آپ کو "رہنما" نہیں بلکہ رہنمائے راہ یافتہ اور ہادی مہدی بنایا تھا، آپؐ وہی کرتے تھے جو آپ کو حکم ملتا تھا، آپ کو جو احکام و ہدایات اوپر سے ملتی تھیں، انہیں کا آپ اس عالم میں نفاذ فرماتے تھے، آپؐ کو ان احکام و ہدایات پر اعتماد کلی تھا، آپ ان نتائج اور ان پر اللہ کے وعدہ و انعامات پر اس طرح یقین رکھتے تھے، گویا آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، آپ کا ایمان تھا کہ کمزور اللہ کی مدد و حمایت کے ساتھ بہت قوی ہوتا ہے، وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتا، اور وہ قوی جس کے ساتھ اللہ کی مدد و حمایت نہ ہو انتہائی ضعیف ہے، وہ کسی کا بال بیکا نہیں کر سکتا، آپ کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تھا کہ "إن ینصرکم اللّٰہ فلا غالب لکم و ان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ و علیٰ اللّٰہ فلیتوکل المومنون"
(اگر اللہ تمہارا مددگار ہو جائے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہیں اپنی مدد سے محروم کر دے تو کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے اس کے بعد، اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔
آپ کو بتلایا جا چکا تھا کہ "کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللّٰہ" (کتنی ہی قلیل التعداد جماعتیں غالب آئی ہیں اللہ کے حکم سے کثیر التعداد جماعتوں پر) آپ سے بڑھ کر ان وعدوں، یہ کہ جو اعتقاد عمل صالح توحید، جہاد فی سبیل اللہ اور اِعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئے گئے ہیں، کون ایمان و یقین رکھنے والا اور ان پر کامل و راسخ اعتماد و ایمان کرنے والا ہو سکتا ہے، نتیجہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

"أعدوا لهم ما استطعتم" کے تحت حتی الامکان تیاری وانتظام کے بعد آپ نے اور آپ کے سچے وصحیح جانشینوں نے ہر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر لی، اور زمین و آسمان کا نقشہ بدل ڈالا، سیلابوں اور طوفانوں کے رخ پھیر دیئے، جس کی بدولت آج تک دنیا میں ایمان، توحید، حقانیت، صداقت، نیکی، اخلاق، محبت، شرافت اور انسانیت کی روشنی موجود ہے ۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے   یہ سب پودا انہیں کی لگائی ہوئی ہے

آپ کو غلط فہمی نہ ہو، جو آپ سے یہ باتیں کر رہا ہے، وہ ان لوگوں میں نہیں ہے جو اسباب ووسائل کے ترک واہمال کی دعوت دیتے ہیں، اور ترک سعی اور تعطل کو "اعتماد و توکل" کہتے ہیں، میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو عالم خواب وخیال میں رہتے ہیں، جن کی باتوں کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، میں نے عالم اسلام کو اور ان قوموں اور حکومتوں کو کہ جن کے ہاتھ میں اس عالم کی زمام قیادت رہی ہے، ان کی اس کوتاہی اور تقصیر پر ہمیشہ سخت ملامت کی ہے جو انہوں نے حربی وصنعتی تیاری کے سلسلہ میں برتی ہے، میں نے ان کے اس تغافل اور عدم توجہی کو انسانیت کی شقاوت اور بدبختی اور اس کے ہدایت و تعمیر اور ترقی واقبال مندی کے راستہ سے ہٹ کر زوال وانہدام اور شقاوت وبدبختی کے راستہ پر پڑنے کے اسباب میں سے ایک اہم سبب شمار کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اس طرز فکر سے شدید اختلاف ہے جو اس وقت تمام عالم اسلام کی عقلیت پر مسلط ہے، میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا کہ مختلف گوشہ ہائے عالم میں پھیلی ہوئی اسلامی جمعیتوں کو ایک جامد اور غیر متحرک، بلکہ غیر ذی حیات انسانی بھیڑ سمجھا جائے، بالکل ویسے ہی جیسے کہ اس وقت عالم کے بقیہ تمام انسانی گلے ہیں، جو بھیڑوں اور چوپایوں کے ریوڑ سے زیادہ کوئی حیثیت اور حقیقت نہیں رکھتے، جن کے پاس دنیا کو دینے کیلئے کوئی پیغام اور کام کی بات نہیں، جن کے مقام اور جن کے اقتدار کا فیصلہ ہمیشہ صرف مادی ترقیوں اور وسائل و آلات کی فوقیت پر ہوتا ہے، یہ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ "ازالۂ حیثیت عرفی" کے مرادف ہے کہ ان کو اس عام انسانی ترازو پر تولا جائے، اور ان کے اصل سرمایہ اور ان کی عظیم طاقت "ایمان باللہ" "اطاعت" اور "پیغام دعوت کی روح" کو نظر انداز کر دیا جائے، اگر غیر مسلم اقوام ان کو اس معیار سے تولتی ہیں تو وہ معذور ہیں کہ ان کو اس روحانی ایمانی طاقت کے سرچشمہ کا احساس واندازہ نہیں، لیکن مسلمان خود انہیں اسی ترازو پر تولیں، یہ ان کیلئے بڑے شرم وعار کی بات ہے اور بڑی حسرت وماتم کا مقام ہے ۔

مومناں باخوئے دبوئے کافراں   لاالٰہ گویاں واز خود منکراں

یہ بیشک صحیح ہے کہ ہم مادی سازوسامان کے اعتبار سے فقیر ہیں، ہم کمزور و نہتے ہیں، علم وصناعت کی دوڑ میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں، سیاست اور اقتصادی حالت میں اور قوموں کو نہیں پہنچتے

ان چیزوں میں ہم میں اور اقوام مغرب میں صدیوں اور قرنوں کا فرق ہو گیا ہے .... اور بڑی حد تک یہ ضروری بھی ہے کہ یہ چیزیں ہمارے قائدین وزعماء کے فکرو اہتمام کا موضوع بنیں، اور یہ باتیں خاصی توجہ والتفات کی مستحق ہیں .... لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم اس کے بغیر بھی دنیا میں عظیم طاقت ہیں، ہمارا صرف وجود بڑی قیمت رکھتا ہے، ہمارے پاس وہ پیغام، وہ دعوت اور وہ دین ہے جو انسانیت کی غذا اور اس کی روح ہے، یہ وہ چیز ہے جس کے بغیر دنیا میں اس وقت ایک دردناک والمناک انجام کی طرف تیزی سے بڑھتی جارہی ہے اور روز بروز اس قعر ہلاکت سے قریب تر ہوتی جارہی ہے، اور قریب ہے کہ کسی دن یہ انجام ہلاکت انسانیت مجسم کو نگل جائے .... ہمارے پاس وہ ایمان ویقین ہے جو امانت واحساس ذمہ داری پیدا کرتا ہے، جواب دہی اور باز پرس کا خوف پیدا کرتا ہے، نفس لوامہ پیدا کرتا ہے، اچھے برے کی تمیز پیدا کرتا ہے اور صرف ذاتی ووقتی لذت ونفع کو اچھے برے کا معیار نہیں بننے دیتا، یہی وہ طاقت ہے جو کار خیر اور خدمت خلق کے جذبات دلوں میں پیدا کرتی ہے، اور اندر سے اس کے تقاضے اور داعیے پیدا ہوتے ہیں۔

آج کی متمدن دنیا کی وہ قومیں جن کو دنیا کی امامت وپیشوائی کا دعویٰ ہے اس طلسمی طاقت اور اس "کلید حیات" سے محروم ہیں، جنہیں ہم آج "سرمایہ دار" قومیں کہتے ہیں وہ اس سرمایہ عظیم کے اعتبار سے دیوالیہ ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ یہ اسباب ووسائل اور آلات واسلحہ، اور ساز وسامان ولوازمات آسائش ضائع ہیں .... صرف ضائع اور غیر مفید نہیں .... بلکہ وبال جان اور ہلاکت وبربادی کا ذریعہ بن رہے ہیں، اور ان کو موت کے گڑھے کی طرف لے جارہے ہیں، یورپ کو سخت ضرورت ہے کہ جلد از جلد اس آب حیات اور سرمایہ زندگی کو قبول کرلے، یہی وہ واحد نسخہ شفا ہے جس سے اسکے مزمن ومہلک مرض کا علاج ہو سکتا ہے، ہم مسلمانان عالم مغرب کے ان علوم وفنون اور ان ایجادات وصناعات کے اتنے محتاج وضرورت مند نہیں جتنا کہ مغرب ہمارے ایمان ویقین کا محتاج ہے، یہ ایمان ہی صالح معاشرے کی اساس وبنیاد ہے، پھر اس ایمان ویقین کے بعد وہ قانون اور شریعت ہے جو آج بیسویں صدی کی تمام مشکلات اور پیچیدگیوں کا صحیح حل پیش کرتی ہے، یوں سمجھئے، صاف واضح اور بلیغ الفاظ میں کہ ہمارے پاس ایک پیغمبر کے وجود کی نعمت موجود ہے جو تمام عالم کیلئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، یہ ایمان وشریعت اسی کی امانتیں ہیں کہ جس کے ہم مسلمان حامل ہیں، اللہ کا فیصلہ ہے کہ اب قیامت تک تمام وہ لوگ جو اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی وخوشنودی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو راستہ یہیں سے ملے گا، یہیں وہ نور ہے جو صراط مستقیم دکھاتا ہے، اور تاریکیوں اور گمراہیوں سے نکال کر منزل مقصود تک پہونچاتا ہے

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

مسلمان اپنا مقام پہچانیں، ہماری ذمہ داری اور فریضہ ہے کہ ہم اس وقت حیران، سراسمہ اور سرگرداں و آوارہ یورپ کو صحیح راستہ کی طرف بلائیں، اپنے دنیاوی فوائد، منافع اور راحتوں اور لذتوں کو بالکل نظر انداز کر کے، انتہائی اخلاص و دلسوزی کے ساتھ، اور اس اعتماد و یقین کے ساتھ کہ یہی ہمارا منصب و مقام ہے، ہم ہی اس وقت عالم کی اصلاح و رہنمائی کی قوت و صلاحیت رکھتے ہیں، ہم ہی اس کے صحیح مبلغ و مصلح ہیں، ہم اس کے نجات دہندہ ہیں، ہم ہیں جو اس کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضامندی اور جنت و حیات دوام کا راستہ دکھا سکتے ہیں، اور اس کو انعامات کی بشارت سنا سکتے ہیں، ہم ہی ہیں جو اس کو اللہ کی ناپسندیدگی اور اسکے عذاب، دوزخ و جہنم سے ڈرا سکتے ہیں، اور اس کو بچا سکتے ہیں ۔

افرنگ ز خود بے خبرت کرد و گرنہ اے بندۂ مومن! تو بشیری، تو نذیری

ہمیں اپنے ایمان و یقین کی اس عظیم طاقت سے کام لینا چاہئے، ہمیں چاہئے کہ ہم قافلۂ انسانی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں، یہ کیا شومیٔ قسمت ہے کہ ایک عرصہ سے ہم گرد کارواں بنے ہوئے ہیں، اس کہنہ دماغی کو ہم کب تک عقل و دور اندیشی کہتے رہیں گے، اس معمورۂ عالم میں بہت سے گوشے ایسے ہیں جہاں فطرت سلیم کے خزانے مدفون ہیں، ایشیاء افریقہ کے وسیع خطہ ہائے ارض ایسے ہیں جہاں زرخیز و شاداب ذہنوں پر محبت و پر خلوص دلوں اور طاقتور و صناع ہاتھوں کی کمی نہیں، ہمیں ان کو دین و ایمان، زندگی کے حقیقی و نیک مقاصد اور کائنات کے افضل و برتر اصول و حقائق پہونچانا چاہئے، آپ یقین کریں کہ یہ قومیں اس چیز کی پیاسی ہو رہی ہیں، اور آپ کے انتظار میں ہیں ۔

ہم آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

امید یہاں تک کی جاتی ہے کہ انکے ایمان قبول کر لینے کے بعد اور اسکو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اور اس کے دلوں میں اتر جانے کے بعد اور اس پیغام و دعوت اور مشن کو خود اپنا لینے کے بعد تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوگا، اور جسطرح عہد اول میں ایرانیوں ترکوں اور دیلمیوں کے ایمان لانے سے، اور قرون وسطیٰ میں تاتاریوں اور مغلوں کے اسلام لانے سے تاریخ کے دھارے بدل گئے ہیں، آج بھی بدلیں گے۔ لیکن اس انقلاب کی بنیاد کیا ہے؟ اس کی بنیاد اپنے اندر کا فکری انقلاب ہے؟ ہم کو بلا توقف و تاخیر اپنا موجودہ انداز فکر بدل لینا ہے، اور اس طرح پر سوچنا ہے جس طرح پیغمبر سوچتے ہیں، یہی انقلابِ فکر باذن اللہ عالم میں انقلاب کا باعث ہوگا، اس کے بغیر دنیا کی کوئی طاقت عالم کو وحشت و درندگی، آدم کشی اور غارت گری کے گڑھے سے نہیں نکال سکتی، عرصہ سے بڑے بڑے عقلاء عالم تدبیر تو کر کے عاجز آچکے ہیں، اس کے لئے تو "شان کلیمی" ہی درکار ہے ۔

صحبت پیر روم سے مجھ پر ہوا یہ راز فاش لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

حضرت علامہ یوسف القرضاوی (قطر)

اکیسویں صدی اور امت مسلمہ کی ذمہ داریاں

۲۱ ویں صدی کی ابتدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے تیسرے ہزار سال کی ابتدا ہے۔ دور جدید اپنے ساتھ بڑے بڑے چیلنج لا رہا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ امت مسلمہ مستقبل کے لئے درست نقطۂ نظر اختیار کرے، صحیح منصوبہ بندی کرے اور عملی استعداد کو بڑھانے کی تدابیر بھی کرے۔ یہ ہمارا اولین فرض ہے تاکہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔

اس حوالے سے چند امور توجہ کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں:

۱۔ اسلامی تشخص:

ہم مسلمانوں کو سب سے پہلے خود اپنے مقام اور مرتبے کا ادراک کرنا ہوگا تاکہ معلوم ہو کہ ہمارا تعلق کس عظیم نظام حیات سے ہے۔ اس پر کاربند ہو کر ہم اپنی منفرد و ممتاز حیثیت کو دنیا بھر سے منوا سکتے ہیں۔ ہم غیروں کے تابع مہمل نہیں ہیں۔ اسلام ہماری شناخت اور تشخص ہے۔ ہم اول و آخر مسلمان اور اپنے رب کے مطیع ہیں۔ ہمیں اس کا دوٹوک اعلان کرنا ہوگا۔ اسی بنا پر ہم عالم جدید میں اپنی قائدانہ حیثیت کو تسلیم کروانے کی پوزیشن میں ہیں۔

۲۔ مرجع اساسی کا تعین:

امت مسلمہ کو اپنے اساسی مرجع کا تعین کرتے ہوئے اپنے احکامات و تعلیمات کو وہیں سے اخذ کرنے اور اپنی تہذیب و تمدن کو انہی بنیادوں پر استوار کرنے کا اہتمام بھی کرنا ہوگا۔ نیز اختلاف کی صورت میں وہی ہمارا مرجع ہونا چاہیے۔ بلاشبہ ہمارا بحیثیت امت مرجع "دین اسلام" ہے جس سے مراد کسی خاص زمانے کا اسلام، کسی خاص مسلک کا اسلام نہیں اور نہ ہی کسی خاص مکتبہ فکر کا اسلام۔ ہے بلکہ دور اولین کا وہ اسلام ہے جو ہر قسم کی بدعات اور ملاوٹ سے پاک تھا۔ یعنی فرقوں میں بٹ جانے سے پہلے کا وہ صحیح اسلام، جو تاویلات و تشریحات کی بھول بھلیوں میں کھو جانے سے پہلے کے دور نبویؐ اور خیر القرون کا اسلام ہے۔

حقیقی اسلام کو متعارف کروانے اور دنیا میں نافذ کرنے کیلئے مشترکہ طور پر ایسا نظام عمل مرتب کرنے اور جاری و ساری کرنے کے لئے ایسی عالمی مشنری کو وجود میں لانا ہوگا جو افراط و تفریط سے پاک ہو

کر متوازن اور معتدل تعلیمات پر عمل کرے۔

وکذلك جعلنكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا (البقره ۲'۱۴۳)

"اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔"

یہ تحریک ایسی موج رواں ہو جو ایمان و عمل کو یک جائی بخشے عقل و نقل میں موافقت پیدا کرے' دنیا و آخرت کو باہم مربوط کرے نئے مفید امور کو جذب کرے' قدیم طرز عمل کا احیاء کرے' وسائل کو عمدگی سے بروئے کار لائے' جزئیات تک کو خوبی سے قابل عمل بنائے۔ یہ تحریک شرعی اصولوں اور تغیرات زمانہ میں مناسب توازن برقرار رکھنے کی استعداد رکھتی ہو' ماضی سے مربوط رہتے ہوئے زمانہ حال میں درست انداز سے زندگی بسر کرنے کا ادراک رکھتی ہو اور مستقبل میں مزید ترقی کرنے کے اسلوب سے بھی آگاہ ہو۔

یہ تحریک عالمی تبلیغ میں اصول یسر (آسانی) کو پیش نظر رکھنے والی' انسانی مسائل کا حل پیش کرنے میں سہولت کے پہلو کو مقدم کرنے والی اور عام فہم ہونی چاہیے۔ اسی طرح دوسرے فریقوں سے ربط و ضبط رکھنے ان کی سننے اور اپنی کہنے کی قائل ہو۔ مخالفت کرنے والوں سے وسعت قلبی کے ساتھ معاملہ کر سکتی ہو۔ ارتقائی تبدیلی پر عمل پیرا ہو' نئے تقاضوں کے مطابق اجتہاد کی متعینہ شرطوں پر کاربند رہتے ہوئے پیش آمدہ حالات پر مجتہدانہ غور و فکر کی داعی اور تجدید و احیاء و نشاۃ ثانیہ کے ضابطوں پر کاربند رہے۔ یہ عالمی اسلامی تحریک نہ تو خود اعتدال کو ترک کرنے والی ہو اور نہ کوئی اسے حدود توازن سے تجاوز کرنے پر مائل ہی کر سکتا ہو۔ یہ نہ غلو کی حامل ہو نہ تشدد کی بے جا رنگ آمیزی اس کا وصف ہو بلکہ یہ تعمیر کرنے کی قوت رکھتی ہو' نہ کہ بگاڑ کی۔ یہ تحریک ملانے والی ہو نہ کہ منتشر کرنے والی۔ اس کے بنیادی اوصاف میں حیات جدید کی نوید ہو نہ کہ مایوسیاں پھیلانا۔ کیونکہ مایوسیوں کا بالآخر انجام اعضاء و قویٰ کا معطل ہونا ہوتا ہے۔

۳۔ نیا عالمی منصوبہ:

امت مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسا عالمی اسلامی منصوبہ تشکیل دے جس پر عمل پیرا ہو کر پس ماندگی کی حالت کو بدل کر ترقی اور سبقت لے جانے کی فضا پیدا ہو سکے۔ ہم بلا شرکت غیرے ایک ہزار سال تک دنیا کی قیادت کرتے رہے ہیں۔ ہماری تہذیب و تمدن ساری دنیا میں رائج تھی۔ ہم نے ساری دنیا کے لوگوں کو آداب حیات سکھائے تھے۔ ہم پر یہ واضح رہنا چاہیے کہ جہالت و پس ماندگی ہماری

سرشت کا حصہ نہیں اور نہ ہی ہماری موجودہ حالت اسلام کے مزاج سے میل کھاتی ہے۔ اس لئے یہ درست نہ ہوگا کہ ہم انقلابات زمانہ کے شانہ بشانہ نہ چلیں۔ اس دور کی خاصیت اطلاعی و ابلاغی و فضائی انقلابات ہیں جن سے منہ موڑے رکھنا یا پہلوتہی برتنا کسی طرح بھی قابل قبول نہیں کیا ہم کمپیوٹر و انٹر نیٹ کے دور میں پرانے آلات و وسائل پر ہی اکتفا کیے رہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

حصول ترقی کیلئے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں رائج فلسفہ تعلیم و نظام تعلیم میں مثبت تبدیلیاں لائی جائیں تاکہ اسلامی معاشرے میں اعلیٰ جدید تعلیم یافتہ ماہرین تیار ہوں جو نئی ایجادات کی قدرت رکھتے ہوں۔ اس وقت ساری دنیا میں مسلمان ماہرین اور سائنس دان پھیلے ہوئے ہیں۔ ایسے حالات پیدا کرنے ہوں گے کہ اسلامی معاشرے میں خدمات انجام دینے کے لئے وہ اپنے ممالک میں خوشی واپس آسکیں۔ ہمیں شرح خواندگی کی کمی کو بھی دور کرنا ہوگا اور اس کے لئے قابل عمل منصوبہ بنانا ہوگا۔

۴۔ عالمی صیہونی تحریک کا مقابلہ:

امت مسلمہ کے لئے ممکن نہیں کہ تہذیب و تمدن کی بلندیوں کو چھولے جب تک کہ وہ اپنے وجود کے خلاف ہونے والی عالمی صیہونی سازش کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے شکست فاش نہ دے دے۔ اسی طرح نصرانیت اور ہندومت کی سازشوں کو سمجھنا اور ان کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دینا بھی اسی کا جز ہے۔ یہ ہدف زبانی دعووں اور امن و سلامتی کے نام پر کئے جانے والے معاہدوں سے، جن کا واضح مقصد ان قوتوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے، حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے لئے بصیرت افروز سوچ اور گہرے ایمانی جذبات کا پایا جانا ضروری ہے۔

امت مسلمہ کے احیا کے لئے یہ ضروری ہے کہ عوامی سطح پر اور حکومتی و عسکری سطح پر نئے عزم اور ولولے سے پختہ بنیادوں پر کام کا آغاز کیا جائے 2وہ طرز فکر و عمل اپنایا جائے جس سا ہر مسلمان قیاساتی، فکری اور تہذیبی و تمدنی حوالے سے اپنا سر بلند کر کے چل سکے اور عظیم تر اسرائیل (اور اکھنڈ بھارت) کے خوابوں کو پاش پاش کرنے کے لئے حوصلہ پاسکے۔

یہ نعرے لگائے جاتے ہیں کہ: "فرات سے لے کر دریائے نیل تک اسرائیل تیری سرحدیں ہیں" اور یہ بھی کہا جاتا ہے: "چاولوں کے کھیتوں سے کھجور کے جھنڈوں تک"۔ یہود نے اس خیالی نعرے کو پے درپے کوششوں سے اپنے حامیوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے اس کے مقابلے میں ہمارے دینی لٹریچر میں یہ سچی بشارتیں موجود ہیں کہ اسلام عالم گیریت حاصل کرے گا اور ساری دنیا میں اس کا ڈنکا بجے گا۔ ہماری تاریخ بھی شان دار اور سچا عالم گیر حقائق پر مبنی ہے۔ اس لئے جا طور پر مستقبل میں مزید کامیابیوں اور سرفرازیوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔

۵۔ **ہمہ جہت ترقی کے لئے جدوجہد:**

جس ہدف کو ہمیں خاص اہمیت دینی چاہیے اور جسکے حصول کیلئے ہمیں کمر بستہ رہنا چاہیے وہ اسلامی معاشرے کی ہمہ جہت مجموعی ترقی کا حصول ہے۔ اس کیلئے بھرپور اور دوررس منصوبہ بندی کی جائے۔ یہ انسانی وسائل کو انسانی ترقی کیلئے سرگرم کرنے سے ممکن ہے۔ یعنی انسان ہی اسکا محور ہے اور خود انسان ہی اسکا حصول کا ذریعہ ہے جو موجودہ وسائل کو بہترین انادز سے استعمال کرتے ہوئے ترقی کی منازل کو طے کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ ہمہ جہت ترقی مسلمانوں کی اقتصادی ترقی' پیداواری ترقی اور پیداوار کے متوازن استعمال اور معاشرے میں اس کی منصفانہ تقسیم 'لوٹ کھسوٹ اور ملاوٹ وبد عنوانی کو ترک کرنے سے ممکن ہے۔ اگر ایسا ہو سکے تو امت مسلمہ اقتصادی دباؤ سے نکل آیگی 'مسلمان ممالک میں خود کفالت کی صورت پیدا ہو سکے گی اور آپس میں ایکدوسرے کی ضروریات واحتیاجات کو پورا کرنا ممکن ہوگا۔

ہمارے پاس ہر نوع کے وسائل موجود ہیں جنہیں بہتر طور پر استعمال میں لا کر ہم اپنی تمام ضروریات زندگی احسن طور پر پوری کر سکتے ہیں۔ زرعی پیداوار کو ترقی دے کر اپنا پیٹ خود بھر سکتے ہیں۔ اپنے ملکوں میں تیار کردہ کپڑے سے اپنا تن ڈھانپ سکتے ہیں۔ اس طرح ہمیں بیرونی محتاجی سے چھٹکارا بھی ملے گا اور ہم اپنے قدموں پر بھی کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ بات ہمارے لئے باعث ندامت ہے کہ اسلامی ممالک کی اکثریت زرعی ممالک کی ہو اور پھر بھی آدھا یا آدھے سے زیادہ اناج ہم باہر سے منگوائیں۔ یہ ممالک لوہے کی صنعت میں ضروری مہارت واستعداد نہیں رکھتے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں لوہے کی اہمیت ۱۴۰۰ سال پہلے ہم پر واضح کر دی تھی:

وانزلنا الحديد فيه باس شديد و منافع للناس (الحدید ۵۷: ۲۵)

"اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں"

ہم نے یہ آیت بارہا پڑھی ہو۔ فيه باس شديد یہ ہمیں عسکری قوت حاصل کرنے کے لئے صنعتی ترقی پر ابھارتی ہے اور منافع للناس آیت کا یہ حصہ ہمیں مدنی صنعتوں (انسانی ضروریات کی فراہمی) میں دسترس حاصل کر کے لوگوں کے لئے نفع کا باعث بننے پر ابھارتا ہے لیکن ہم اس پہلو سے غور ہی نہیں کرتے۔

امت مسلمہ کے پاس ثروتوں کے لامحدود خزانے موجود ہیں۔ یہ خزانے امت کے میدانوں اور پہاڑوں میں 'اس کی وادیوں اور صحراؤں میں 'اس کے سمندروں اور دریاؤں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ہماری جغرافیائی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے اور بشری قوت (انسانی وسائل) بھی اپنی جگہ وافر ہے۔ ضرورت ہے تو اس بات کی کہ ہم ان بیش بہا قیمتی خزانوں کے صحیح استعمال کو جان جائیں اور انہیں درست

انداز سے زیر تصرف لا کر مجاہدانہ انداز سے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیں۔ پھر اس طرح زندگی بسر کریں کہ جس طرح ہم چاہتے ہوں نہ کہ اس طرح جئیں جس طرح ہمارے دشمن چاہتے ہیں (عزت کی زندگی نہ کہ ذلت کی، جیسے اب حال ہے)

۶۔ **منصفانہ معاشرے کا قیام:**

ترقی کے حصول کے لئے ہمیں معاشرتی ظلم وزیادتیوں کے خلاف بھی علم جہاد بلند کرنا ہوگا۔ یہ فساد اور ظلم وجور مسلمانوں کے معاشرے میں عام ہے۔ ہمارے لئے لازم ہے کہ عدل اجتماعی کو قائم کریں، جس سے حق دار کو اس کا حق ملنے کی ضمانت فراہم ہو یہاں تک کہ ہر بے روزگار کو بہتر روزگار، مزدور کو اچھی اجرت، بھوکے کو روٹی، مریض کو دوا، بے سہارا کو سہارا، بے لباس کو لباس، ہر محنت کرنے والے کو بہترین صلہ اور محتاج کو کفایت کرنے والا سلیقہ فراہم ہو جائے (حقیقی منصفانہ معاشرہ وجود میں لانے کی کوشش، ترقی اسلامی کی شش ہے، جس کا احیا اشد ضروری ہے۔

۷۔ **خواتین کی اہمیت:**

یہ بھی ضروری ہے کہ خواتین کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ان کو صحیح مقام و مرتبہ دیا جائے خواتین کی اہمیت اسلئے بھی ہے کہ خواتین معاشرے کا عددی لحاظ سے نصف حصہ ہیں۔ گھر اور معاشرے پر ان کے براہ راست مثبت یا منفی ہر دو طرح سے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مسلمان مردوں کیلئے ضروری ہے کہ خواتین کے ساتھ انکے اولین فریضے کی ادائیگی میں معاونت کریں جو گھر کی نگہداشت، خاوند کا خیال اور نسل انسانی کی تربیت کرنے کے اعلیٰ اعمال پر مشتمل ہے۔ اس میں دو رائے نہیں (جنہوں نے تجربات کرنے تھے، کر لئے پھر بھی یہی نتیجہ نکلا) کہ خواتین سے یہ مقام کوئی اور نہیں لے سکتا اور نہ ہی اسے درست انداز سے ادا ہی کر سکتا ہے۔ لہذا خواتین کے ساتھ بھرپور تعاون کیا جانا چاہیے تاکہ وہ اچھی بیوی، بہترین ماں اور مفید شہری ثابت ہو سکیں۔

ہمیں ضرورت و مجبوری میں ان کے کام کرنے کے حق کو بھی تسلیم کرنا چاہیے۔ اگر خود انہیں یا ان کے افراد خانہ کو ان کی معاونت کی ضرورت ہو تو وہ باہر جا کر کام کر سکتی ہیں جیسے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعے سے رہنمائی ملتی ہے جب کہ وہ بوڑھے تھے اور ان کی بیٹیاں بکریوں کو پانی پلانے کے لئے لے جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں اگر معاشرے کو ان کے کام کی ضرورت ہو جیسے کہ عورتوں کا بچیوں کو تعلیم دینا، عورتوں کا عورتوں کے علاج کے لئے تربیت لینا وغیرہ جیسے امور تو ان میں خواتین کو کام کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر خواتین کو درست مقام حاصل ہوگا تو اولاد کے ایام طفولیت بہتر گزریں گے، خاندان خوش وخرم رہے گا اور زندگی پرسکون بسر ہوگی۔

۸۔ منصفانہ سیاسی نظام کا قیام :

اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا اہداف اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ منصفانہ سیاسی نظام رائج نہ کیا جائے۔ وہ نظام جس سے تمام شہریوں کو ان کے صحیح حقوق حاصل ہو جائیں' جو انسان کے مقام و مرتبے اور آزادی رائے کا احترام کرنے کا ضامن اور انسانی جان و مال و عزت کا رکھوالا ہو۔ یہ ایسا نظام ہو جس سے روح شواریئت بیدار ہو اور خیر خواہی اور ذمہ داری کا جذبہ پروان چڑھے یہ نظام اسلام کے شرعی طرز سیاست پر مبنی ہونا چاہیے جس کا بنیادی مقصد امت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ ہو۔ یہ نظام جبر و استبداد کے نمائندہ حکمرانوں اور سازشی ٹولوں کا دفاع کرنے والا نہیں ہونا چاہیے بلکہ عوام کے مفادات کو پیش نظر رکھنے والا ہو۔ جس کے تحت اللہ کے قانون کو کسی تفریق کے بغیر سب پر یکساں نافذ کیا جائے جس میں اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق روا نہ رکھا جائے اور نہ ہی کسی سے امتیازی سلوک برتا جائے۔

۹۔ وحدت امت :

امت کے جسد پر ایک اور بھی گھاؤ ہے جسے جلد از جلد درست کرنے کی ضرورت ہے' اور وہ ہے "افتراق و اختلاف امت"۔ اس کا وحدت امت اسلامیہ کے نسخہ کیمیا سے علاج ہونا چاہیے' کیونکہ کٹی پھٹی اور بکھری امت کا کوئی مستقبل نہیں۔ کبھی یہ ایک تھی' اب مختلف اقوام کا مجموعہ بن چکی ہے جو الگ الگ گروہوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ یہ گروہ محض متفرق مجموعہ ہی نہیں ہیں بلکہ بارہا عملاً ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جاتے ہیں اور اس طرح خود ہی ایک دوسرے کے غیظ و غضب کا شکار ہوتے رہتے ہیں' جب کہ موجودہ دور میں مختلف الخیال اقوام پرانے اختلافات' نسلی امتیازات' مذہبی لڑائیاں اور علاقائی جھگڑے کم سے کم کرنے پر کمر بستہ ہیں' مشترکہ مصلحتوں کے باعث کھینچا تانیوں کے ایام سیاہ مسترد کر کے مختلف اتحاد اور مشترکہ منڈیاں وجود میں لا رہی ہیں یہاں تک کہ ان کے باہم شیر و شکر ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ جب کہ اس امت مرحومہ کا یہ حال ہے کہ ابھی باہمی تفرقے اور اختلاف و انتشار کا شکار ہے یاد رکھئے ہم اس وقت تک اپنے خلاف کی جانے والی عالمی سازشوں کا کامیابی سے مقابلہ نہیں کر سکتے جب تک ہم متحد و متفق نہ ہو جائیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم خود کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں منقسم رکھیں اور آج کی دنیا کے بڑوں سے ٹکر لینے کی قابلیت کو بھی پالیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پوری کی پوری امت مسلمہ مشترکہ ہدف پر متفق و متحد ہو جائے۔

۱۰۔ بیداری امت کی ضرورت :

ان اہداف کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانان عالم کو پھر سے بیدار کیا جائے۔ اس کیلئے موجودہ

معیار ایمان واخلاق کو اوپر اٹھانے کی سعی کرنے ہوگی یہاں تک کہ آج کے مادی مسلمان میں روحانیت کی بلندی و عظمت پھر سے جاگ اٹھے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ صرف مادی ترقی امت مسلمہ کے احیائے نو کا سامان نہیں کر سکتی۔ البتہ مادیت وروحانیت کے باہم اشتراک سے یہ ترقی ضرور ممکن ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے ہمیں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کی سوچ اور فکر کو بلند کرنا ہوگا اس کے ساتھ ساتھ بلند اہداف کا تعین اور امید کی فضا تیار کرنا بھی ضوری ہے۔ اس کے لئے دور حاضر کے مسلمان کی تہذیبی' اخلاقی اور نفسیاتی تربیت 'انسان مطلوب کے اعلیٰ معیار پر کی جانی چاہیے۔ ایسے افراد تیار کرنا ہوں گے جو ہوائے نفس کی غلامی سے آزاد ہوں' جو علاقائیت سے سحر زدہ نہ ہوں' جنہیں شرکی چکا چوند دھوکا نہ دے سکے۔ وہ پیش آمدہ مشکلات سے پریشان نہ ہوں بلکہ ان پر قابو پانے اور حق سچ پر پامردی سے ڈٹ جانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

اس اعلیٰ مقصد کے حصول کیلئے ان تمام اداروں کو باہم مل کر فضا تیار کرنی ہوگی جو تربیت انسان میں موثر کردار رکھتے ہوں جن میں مدرسہ اور مسجد' اخبارات ورسائل اور ریڈیو' ٹیلی وژن اور فلم' سب شامل ہیں۔ الغرض تمام ادارے اس فرض کی ادائیگی میں شریک ہوں تاکہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان' اسلام کے سچے پیغام اور آخرت کے دائمی گھر' سب کی آبیاری ہو سکے۔ ہمیں ایسے ایمان کیلئے کوششیں کرنی ہوں گی جس سے بہترین و مثبت اور مفید عملی ثمرات ظاہر ہوں' فاضلانہ اخلاقیات جنم لیں اور بندگی رب' تعمیر دنیا اور بنی نوع انسان کے فائدے کی کوئی صورت سامنے آسکے۔ یہ ہیں وہ دس اہم نکات جنہیں پیش نظر رکھ کر ہم بحیثیت امت ترقی کر سکتے ہیں۔ ہم مادی' روحانی' تہذیبی' بشری ہر نوع کے خزانوں سے مالامال ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اکیسویں صدی میں ہم اپنی عظمت رفتہ کو پا کر پھر شوکت ورفعت کو بحال کر سکیں تاہم یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب امت مسلمہ کو ایسی نئی قیادت نہ جائے جو خلوص نیت' عزم مصمم اور عمل پیہم سے اپنا مقام حاصل کرنے کی جدوجہد کرے یہ بھی ضروری ہے کہ ان گزارشات کو ہماری ثقافتی و تعلیمی پالیسیوں کی بنیاد بنایا جائے۔ ہمارا دینی اور عمومی میڈیا اس کی مناسب تشہیر کرے اور خاندان و مدرسہ' عوام وحکمران غرض ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد اسکے حصول کیلئے ممد و معاون بن جائیں اور مل جل کر بھر پور جدوجہد کی جائے۔ (بشکریہ ترجمان القرآن لاہور)

> فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے!
> کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

حضرت مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی
نائب مہتمم دارالعلوم کراچی

امت مسلمہ کی معیشت اور اسلامی خطوط پر اس کا اتحاد

نئی صدی کا ظہور پورے عالم میں فکر و عمل کے نئے افق کھول رہا ہے' ہمارے لئے مسلم امہ ہونے کی حیثیت سے اپنے اہم مسائل اور مشکلات پر غور کرنا' ان کے رخ متعین کرنا' اور آنے والے وقتوں کے بین الاقوامی مسائل حل کرنے کیلئے اپنی حکمت عملی وضع کرنا ایک لائق تحسین عمل ہے' میں موتمر العالم الاسلامی کا شکر گزار ہوں کہ مجھے ایسا پروقار فورم (Forum) مہیا کیا کہ جس میں ان مسائل پر گفتگو کر سکتا ہوں۔

انیسویں صدی سیاسی استبداد کی صدی تھی' جس میں یورپی طاقتور اقوام نے ایشیائی اور افریقی ممالک بشمول اسلامی ممالک پر اپنا تسلط جمایا ہوا تھا' موجودہ صدی نے جواب اپنے آخری سانس لے رہی ہے مغربی استعمار کی طرف سے آزادی کے تدریجی عمل کا مشاہدہ کیا ہے' اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہی وہ صدی تھی' جس میں بہت سے اسلامی ممالک نے یا تو طاقت کے بل بوتے پر یا پرامن طریقوں سے آزادی حاصل کی' تاہم اپنی سیاسی آزادی کے حصول میں واضح کامیابی کے باوجود ہم اب تک علمی' معاشی اور منصوبہ سازی کے میدانوں میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے' یہی وجہ ہے کہ اب تک مسلم امہ سیاسی آزادی کے صحیح ثمرات سے لطف اندوز نہیں ہو سکی ہے۔

اب مسلم دنیا نئی صدی کو اس امید کیساتھ دیکھ رہی ہے کہ انشاء اللہ یہ اس کیلئے مکمل اور حقیقی آزادی لیکر آئیگی۔ جس میں مسلمان دنیا کی مختلف اقوام کے درمیان اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کریں اور قرآن کریم اور حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں وضع کردہ اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزارنے میں آزاد ہوں۔

تاہم یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ امید صرف خوابوں اور خواہشات سے پوری نہیں ہو سکتی' اپنے اس محبوب مقصد کے حصول کے لئے ہمیں اجتماعی زندگی کے تمام میدانوں میں اپنے رویہ کو بدلنا ہو گا' اور جس قدر ہم نے سیاسی آزادی کے حصول کے لئے کوششیں کیں اس سے زیادہ ہمیں اپنی مکمل آزادی کے حصول کی کوششیں کرنی ہوں گی' ہمیں اپنے لائحہ عمل اور منصوبوں پر از سر نو غور کرنا ہو گا' ہمیں خوب

غور و فکر کے ساتھ مرتب کردہ پلاننگ اور منصوبہ سازی کی ضرورت ہوگی، ہمیں اپنے متعین اور واضح مقاصد کے لئے اجتماعی قوت ارادی انقلابی اقدامات اور ایک پرجوش پروگرام کی ضرورت ہوگی۔

جس موضوع کے بارے میں مجھے چند الفاظ پیش کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہ موضوع "امت مسلمہ کی معیشت کا اسلامی خطوط پر اتحاد" ہے اس مختصر مضمون میں جو ایک مختصر نوٹس پر تیار کیا گیا ہے احقر اپنے آپ کو ایسے دو نکات تک محدود رکھے گا جو ہمارے لئے امت مسلمہ ہونے کی حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہیں۔

خودساختہ انحصار

یہ بات ہر کس و ناکس جانتا ہے کہ تقریباً تمام مسلم ممالک کا سماجی اور معاشی میدانوں میں دوسروں پر انحصار اس امت کا ایسا معاشی مسئلہ بن چکا ہے کہ جس سے آج تمام مسلم امت دوچار ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اکثر مسلمان ممالک، مغربی ممالک یا بین الاقوامی (بلکہ حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو مغربی) مالیاتی یا تمویلی اداروں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لے رہے ہیں، اور بعض ممالک یہ بھاری مقدار میں سودی قرضے کسی ترقیاتی منصوبوں کے بجائے اپنے روزمرہ کے اخراجات کیلئے لے رہے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ تشویشناک امر یہ ہے کہ اپنے سابقہ سود کی ادائیگی کیلئے حاصل کر رہے ہیں، جس سے ان کے حاصل کردہ قرضوں کا سائز خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔

بیرونی قرضوں پر انحصار ہماری ایک ایسی بنیادی بیماری ہے جس کی وجہ سے ہماری اقتصادی زندگی اس درجہ متاثر ہو چکی ہے کہ قومی خود اعتمادی تقریباً مفقود ہوتی جارہی ہے، اور اس نے ہمیں اس بات پر مجبور کر رکھا ہے کہ ہم اپنے قرض دہندوں کے مطالبات کے آگے بلکہ بعض اوقات ایسے مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کردیں جو ہمارے اجتماعی مفادات کے خلاف ہیں۔ یہ بات بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ قرض دہندہ قرضے دینے سے قبل مقروض پر اپنی شرائط عائد کردیتے ہیں، یہ شرائط ہمیں مستقل غیر ملکی دباؤ میں رکھتی ہیں، اور اکثر ہمیں اپنے حقیقی مقاصد کے حصول سے روکتی ہیں اور اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ ہم اغیار کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں، خلاصہ یہ کہ غیر ملکی قرضوں کے برے نتائج اتنے واضح ہیں کہ محتاج بیان نہیں ہیں۔

قرضہ لینا اسلامی تعلیمات کی رو اس قدر ناپسند فعل ہے کہ اس میں شدید مجبوری اور سخت ضرورت کے بغیر مبتلا نہیں ہونا چاہیے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کے اس عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایسے شخص کی نماز جنازہ ادا کرنے سے انکار فرمادیا جو اپنا قرض ادا کئے بغیر وفات پاگیا تھا۔

مزید براں مسلمان فقہا کرام نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آیا کسی مسلمان ملک کے حکمران کیلئے جائز

ہے کہ وہ غیر مسلموں کی طرف سے پیش کردہ تحفے قبول کرے؟ اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ صرف اس صورت میں جائز ہے جب ان تحفوں کی وجہ سے امت مسلمہ کے مفاد کیخلاف کسی قسم کا دباؤ نہ ہو' یہ جواب تحفے قبول کرنے کے بارے میں دیا گیا ہے' اب آپ اس سے خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرضے لینے کا جواب کیا ہوگا؟

اسلامی اصولوں کا مطابق بیان کردہ یہ ہدایات اس بات کا مطالبہ کرتی ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے سختی اور تنگی کے زمانہ میں بھی غیر ملکی قرضے لینے سے انکار کرنا چاہیے۔ لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ موجودہ قرضے ہمارے وسائل (Resources) کی قلت کے باعث پیدا نہیں ہوئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی جتنے آج مالدار ہیں اس سے قبل مسلمان کی پوری تاریخ میں اتنے مالدار کبھی نہیں رہے' آج انکے پاس قدرتی وسائل کے عظیم خزانے موجود ہیں' دنیا کے اہم دفاعی واقتصادی اہمیت کے حامل مقامات ان کے قبضے میں ہیں' وہ دنیا کے بیچوں بیچ واقع ہیں' وہ مراکش سے انڈونیشیا تک ایسی جغرافیائی زنجیر میں جڑے ہوئے ہیں کہ انکے درمیان سوائے اسرائیل اور ہندوستان کے کوئی ملک حائل نہیں ہے وہ دنیا کا تقریباً پچاس فیصد تیل پیدا کرتے ہیں' دنیا کی خام مال کی برآمدات میں تقریباً چالیس فیصد حصہ ان کا (مسلمانوں کا) شمار کیا جاتا ہے۔ ان تمام حقائق کے علاوہ مسلمانوں کی وہ تمام نقدر قوم جو مغربی ممالک میں امانت یا سرمایہ کاری کی غرض سے رکھی گئی ہیں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ خود اپنے اوپر عائد تمام دیون (Loans) اور واجبات (Payables and dues) کی ادائیگی کیلئے مکمل کافی ہیں۔

اسلامی ترقیاتی بینک کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اسلامی ترقیاتی بینک (IDB) کے رکن ممالک کے بیرونی قرضہ جات کا مجموعہ 618.8 بلین ڈالر ہے جبکہ دوسری طرف مسلمانوں کے مغربی ممالک میں رکھے ہوئے اثاثے اور امانتیں (Deposits) اس سے کہیں زیادہ ہیں (۱) یہ بات ظاہر ہے کہ ان اثاثوں اور امانتوں کا کوئی ٹھوس ریکارڈ نہیں ہے کیونکہ ان کے مالکان متعدد وجوہات کی بناء پر انہیں ظاہر نہیں کرتے ہیں' البتہ معاشی ماہرین کا خیال ہے کہ خلیج کی جنگ (Gulf War) کے بعد عرب مسلمانوں نے اپنے ۲۵۰ بلین ڈالر نکال کر اپنے ممالک میں جمع کرائے تھے ان کے علاوہ مسلمانوں کے مغربی ممالک میں جمع شدہ اثاثوں اور امانتوں کا تخمینہ تقریباً ۸۰۰ سے لیکر ۱۰۰۰ بلین ڈالرز کے درمیان ہے (۲) اس بات کا عملاً

---

(۱) IDB Jeddah Report 1996, Table 01

(۲) The News International, Karachi. 18-10-1997, p-15

مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی ہی جمع کردہ رقم کا ایک حصہ خود ہی زیادہ سودی قیمت پر قرض لے رہے ہیں۔ اور اگر بالفرض ان تخمینی اعداد و شمار کو مبالغہ آمیز سمجھا جائے تب بھی اس حقیقت سے شاید ہی کوئی منکر ہو سکتا ہے کہ اتنی بڑی رقموں کو اگر اپنے پاس ہی رکھ کر صحیح طریقے سے مسلمان دنیا پر استعمال کیا جاتا تو امت مسلمہ کبھی چھ سو بلین یا اس سے زائد قرضے لینے پر مجبور نہ ہوتی۔

اس زاویہ سے اگر جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ غیر ملکی قرضوں پر انحصار در حقیقت ہمارا خود ساختہ ہی ہے جسکے بارے میں ہم کسی دوسرے پر الزام نہیں لگا سکتے ہم نے کبھی بھی ان عوامل کو دور نہیں کیا جو ہمارے سرمائے کی باہر منتقلی کے ذمہ دار ہیں ہم نے اپنے لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، ہم نے اپنے آپ کو موجودہ ظالمانہ اور بد عنوان (Corrupt) نظام محصولات سے چھٹکارا نہیں دیا، ہم کبھی سرمایہ کاری کیلئے ایک پر امن فضاء قائم کرنے کے قابل نہیں ہوئے ہم نے کبھی اپنے ممالک کو ایک مضبوط سیاسی نظام عطا نہ کیا ہم نے کبھی بھی اپنے مجموعی سرمایہ سے بہترین طریقوں سے استفادہ کرنے کے مواقع پر غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی مزید بر آں مجموعی طور پر ہم اسلامی اتحاد کے جذبات کو سرگرم اور امت مسلمہ کی طاقت کو متحرک کرنے میں ناکام رہے۔

یہ افسوسناک صورتحال نئی صدی کی خوشی میں مہنگی تقاریب وغیرہ منعقد کر لینے سے ٹھیک نہیں ہو سکتی، ہمیں سنجیدگی کے ساتھ وقت کے چیلنج کو قبول کرنا ہوگا، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے ہمارے معاشی اور سیاسی پہلے قائدین کو غیر ملکی انحصار سے نجات دلانے کیلئے ایسے ذرائع اور طریقے تلاش کرنے ہوں گے جو ہمارے پاس پہلے ہی سے دستیاب ہیں، جس چیز کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلم امہ کی باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لئے نئی پالیسیاں وضع کریں، قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے۔

انما المومنون اخوة فاصلحوا بين اخويكم واتقوا الله لعلكم ترحمون"

"تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

قرآن و سنت کی تعلیمات اور احکام اس اصول کی تاکید کرتے ہیں کہ تمام مسلم امہ کو یک جان ہو کر کام کرنا چاہیے، جغرافیائی حدود انہیں مختلف مقاصد اور مختلف اقوام کے اندر منقسم نہیں کر سکتیں، سیاسی و جغرافیائی حدود صرف کسی ملک کے انتظامی و داخلی امور نمٹانے کے لئے برداشت کی جا سکتی ہیں، لیکن تمام مسلم ممالک کو خصوصاً ان کا اپنے مشترک مقاصد کے لئے بقیہ دنیا کے مقابلے میں یک جان اور یک رخ ہو کر رہنا چاہیے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ سرمایہ داری نظریہ ایک طرف تو طلب اور رسد کو سرگرم کرنے کیلئے اصول عدم مداخلت (Laisez fair) کا اعلان کرتا ہے تو دوسری طرف مندرجہ بالا غلط ذرائع کاروبار کی اجازت دے کر ان کا قدرتی عمل میں مداخلت کرتا ہے' سرمایہ داری ایسی اجارہ داریاں (Monopolies) پیدا کرکے اپنے جابرانہ فیصلے عوام الناس کو اس میں شریک کرنے کے بجائے ایک متعین شرح سے سود دیتے ہیں اور پھر اس سود کو بھی وہ دوبارہ اپنی پیداوار کے اخراجات کی مد میں قیمتوں میں اضافہ کرکے واپس وصول کر لیتے ہیں۔

مجموعی سطح پر اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مالدار لوگ کھاتہ داروں (Depositors) کی رقموں کو اپنے نفع کیلئے استعمال کرتے ہیں اور حقیقت میں ان (Depositors) کو کچھ ادا نہیں کرتے' کیونکہ وہ سود جو وہ مالیاتی اداروں کو ادا کرتے ہیں' وہ صارفین جیسے عوام الناس سے ان کی پیداواری قیمت میں اضافہ کرکے واپس لے لیتے ہیں' اسی طرح جوا' ہزاروں لوگوں کی دولت چند ہاتھوں میں مرتکز کرنے کا ایک بہت بڑے ذریعہ اور کمائے بغیر دولت کے حصول کی لالچ اور طمع کو بڑھانے کا ایک تباہ کن محرک ہے' سٹہ کے معاملات بھی فطری بازاری عمل کو ڈسٹرب کرنے اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں' خلاصہ یہ کہ حلال اور حرام کا امتیاز نہ رکھنے والا نظام معاشرے پر پڑنے والے برے اثرات سے لاپرواہ ہو کر ہر قسم کی تجارتی سرگرمیوں کے لئے کھلا ہوا ہے۔

اسلام نہ صرف بازاری طاقتوں کو قبول کرتا ہے بلکہ ان کو ایک ایسی میکانیت (Mechamism) مہیا کرتا ہے' جس کی وجہ سے وہ اجارہ داریوں کی رکاوٹوں کے بغیر اپنی قدرتی طاقت کیساتھ عمل جاری رکھتے ہیں' صحت مند پیداوار اور مساویانہ تقسیم کی فضا برقرار رکھنے کیلئے اسلام معاشی سرگرمیوں پر دو قسم کے کنٹرول عائد کرتا ہے۔

پہلی قسم کے کنٹرول سے اسلام نے تجارت اور کمائی کے عمل کو کچھ ایسے مخصوص اور پروقار طریقہائے کار کے ساتھ متعین کر دیا ہے جو بالکل وضاحت کا ساتھ حلال اور حرام کے درمیان امتیاز کرتے ہیں کہ یہ طریقے اجارہ داریوں کو روکنے اور غلط اور غیر اخلاقی کمائی اور معاشرے کے اجتماعی مفادات کے خلاف تجارتی سرگرمیوں کو ختم کرنے کا سبب بنتے ہیں' جدید اقتصادی ضروریات کے سیاق میں جہاں عام لوگوں کی چشمیں ترقی کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں' اسلامی طریقہائے تمویل مثلاً سود کے بجائے مشارکہ اور مضاربہ کا استعمال عوام کو ترقی کے پھل میں بلاواسطہ شریک اور حصہ دار بناتے ہیں' جس کی وجہ سے معاشرے میں ایک متوازن طریقے سے خوشحالی آتی ہے۔ اور امیر و غریب کے درمیان فرق کم سے کم ہو جاتا ہے۔

دوسرے قسم کا کنٹرول زکوٰۃ وصدقات اور کچھ دوسرے مالیاتی ذمہ داریاں عائد کرنے کے ذریعہ عمل میں لایا گیا' اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حلال آمدنی بھی دوبارہ ایسے لوگوں کو تقسیم کی جائے جو تجارت کے بھرپور مواقع میسر نہ آنے کی وجہ سے اپنی ضروریات کیلئے نہیں کما سکے' خلاصہ یہ کہ دولت کو مستقل گردش اور پھیلاؤ میں رکھنے کیلئے اور دولت کو محدود مرکوز کرنے کے مواقع ختم کرنے کیلئے غلط اور ناجائز آمدنی کے راستے مسدود کر دیئے گئے اور زکوٰۃ' صدقات اور وراثت کے ضابطے وضع کئے گئے۔

چونکہ موجودہ صدی میں دنیا سوشلزم کا زوال اور سقوط بھی دیکھ چکی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کے زخم بھی ابھی تک مندمل نہیں کر پائی ہے۔ لہذا اب مسلمانوں کیلئے یہ بہترین موقع ہے کہ دنیا کو قرآن وسنت سے مستنبط اصول واحکام کی طرف دعوت دے' جو دو انتہاؤں کے درمیان ایک پرامن اعتدال فراہم کرتے ہیں لیکن ہمارے لئے ایک پریشان کن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اسلامی نظام کے اصول ابھی تک صرف نظریاتی ہیں' جو ابھی تک عملی شکل میں ہمارے سامنے نافذ نہیں' یہاں تک کہ مسلمان ممالک نے بھی ابھی تک اپنی معیشت کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کی سعی نہیں کی ہے' ان میں سے اکثر اب تک سرمایہ دارانہ نظام کی اتباع کر رہے ہیں اور وہ بھی ایسے ناپختہ اور ادھورے طریقوں پر جنکی وجہ سے انکی اقتصادی حالت ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے اور بدقسمتی سے واضح اسلامی اصولوں کی موجودگی کے باوجود مسلمان ممالک میں معاشی ناہمواری اور عدم مساوات مغربی ممالک کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔

یہ افسوسناک صورت حال ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتی' اگر ہم اپنے راستوں اور طریقہ کار کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیں گے تو انقلاب اور ردعمل کی جانب فطری عمل اپنے راستے ڈھونڈنے پر مجبور ہو جائے گا' اگر ہم ایسے انقلاب کے تباہ کن اثرات سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے معاشی نظام کو قرآن وسنت سے مستنبط اور ماخوذ معاشی نظام پر از سر نو استوار کرنا پڑے گا' اگر ہم اسلامی اصولوں کے مطابق کوئی نظام نافذ کرنے کے قابل ہو گئے ہیں تو نئی صدی کی آمد کے موقع پر یہ ہماری طرف سے انسانی برادری کے لئے ایک بہترین اور عظیم تحفہ ہوگا' مجھے امید ہے کہ اگر ہم اسلامی معیشت کے اصولوں کو اخلاص کے ساتھ ٹھیک ٹھیک نافذ کر دیں تو آج ہم بقیہ دنیا کو بھی پہلے کی بہ نسبت اسے قبول کرنے پر زیادہ آمادہ پائیں گے۔

مسلم خوابیدہ اٹھ' ہنگامہ آراء تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق' گرم تقاضا تو بھی ہو

حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی
ناظم اعلیٰ ندوۃ العلماء لکھنئو انڈیا

نئی صدی اور مسلمان

گزشتہ کئی صدیاں مسلمانان عالم کے حق میں سیاسی و معاشی لحاظ سے سخت حالات کی صدیاں رہی ہیں ان میں مشرقی قوموں اور خاص طور پر مسلمانوں کو ایک طرح سے بے چارگی مظلومیت اور مصائب کے حالات سے گزرنا پڑا' ان ہی حالات میں گزشتہ صدی کا آغاز ہوا جس میں مسلمان ملکوں کو یا جہاں مسلم حکومتیں رہی ہیں جیسا برصغیر ہندوستان کے علاقے ان کیلئے تو یہ دور آزمائشوں کا اور سامراجی طاقتوں کے ظلم وجور کو جھیلنے اور کسی حد تک مقابلہ کرنے میں گزرا اور برصغیر میں حالات کا سخت حصہ گزشتہ صدی سے قبل کی صدی میں سامراج سے گلو خلاصی کی انقلابی کوشش کی ناکامی سے شروع ہوا جس میں کئی کئی ہزار علماً کو پھانسی پر چڑھایا گیا اور ان کی جائیدادوں کو ضبط کیا گیا اور تمام عالی ہمت افراد کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی، ظلم اور جبر و ہمت شکنی کا یہ سلسلہ تقریباً نو دہائیوں تک جاری رہا۔ جس میں اصلاً ان کو انقلابی کوشش یعنی حصول آزادی کی کوشش کی بھرپور سزا دی جاتی رہی اور تقریباً یہی وہ عہد تھا جس میں دوسری طرف سامراجی ملکوں میں علم و تمدن ترقی پر ترقی کر رہا تھا اور ان کے اصحاب اپنے وسائل زندگی اور سیاسی اور اقتصادی تفوق کی بنیاد پر مشرقی ممالک کی قوموں کا پورا استحصال بھی کر رہے تھے۔

یہ سلسلہ مشرق میں ملائیشا انڈونیشیا سے لے کر مغرب میں مراکش تک پھیلا ہوا تھا' چنانچہ ان ممالک کی سامراج گرفتہ قوموں میں سے جو قومیں سر اٹھا سکتی تھیں ان کو ان کے آقاؤں کی طرف سے کچلنے اور آخری حد تک کمزور بنانے کی تدبیریں کی جا رہی تھیں اور ترکی جو مسلمانوں کے لئے گزشتہ کئی صدیوں سے طاقت و عظمت کی علامت بنا ہوا تھا' سیاسی اور اقتصادی بے عملی اور اسباب برتری میں کمزوری کا شکار ہو رہا تھا اور اپنی دشمن طاقتوں سے مات کھا رہا تھا بالآخر گزشتہ صدی صرف ربع گزری تھی کہ اس کی عظمت پارہ پارہ ہو گئی اور وہ مغربی طاقتوں کا دست نگر بن گیا اس طرح پورے عالم اسلام میں شکست خوردگی اور مایوسی کی کیفیت عام ہو گئی اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مغربی اقتدار کا لایا ہوا نظام تعلیم اپنی پس ماندہ محکوم قوموں کو علم و ہنر کے چشموں سے سیراب کرنے کے بہانے اپنے بنائے ہوئے نئے سانچے میں مشرقی فرزندان قوم کے دماغوں کو ڈھالنے لگا' اور اس نظام تعلیم کی راہ سے بننے والے

اکثر افراد مغرب کے پورے تابعدار بننے لگے اور اس طریقہ سے پورے مشرق میں جسمانی غلامی کے ساتھ ذھنی غلامی بھی عام ہو گئی ایسی صورت میں مشرقی ملکوں کا مستقبل بہت مبہم اور اس میں روشنی کی کرن مفقود نظر آنے لگی تھی، لیکن اس احساس مظلومیت وشکست خوردگی اور اپنے شاندار ماضی کی یاد نے امت مسلمہ کے فرزندوں کی ایک تعداد کو جن کے سرخیل علماءدین تھے شمالی افریقہ کے ممالک نیز بلقان کے خطہ اور برصغیر ہندوستان میں مسلم قائدین نے اپنی غیرت ملی کے تحت ممکنہ جدوجہد میں دریغ نہیں کیا اور اپنی قربانیوں سے سامراجی طاقتوں کو ہلا کر رکھ دیا دوسری طرف یہ مسلمانوں کے عظیم ماضی کی یادیں تھیں جو قوموں کی تاریخ میں عروج وزوال کے قدرتی عمل کے وجود میں آنے کی طرف اشارہ کر رہی تھیں یہ کہ کوئی قوم یا ملک کتنی ہی ترقی کر جائے بہر حال ان کی بھی ایک عمر ہوتی ہے اس کے اسباب زوال اپنا کام کرنے لگتے ہیں اس لئے مایوسی کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے پاس زندہ اور تابندہ آسمانی کتاب اور محفوظ راہنمائی کرنے والی مذہبی تعلیمات موجود ہیں' چنانچہ انہی کا سہارا لے کر اللہ کے کچھ بندے اپنی کوشش میں لگے ہوئے تھے' انہوں نے دو محاذوں پر جحت اختیار کر رکھی تھی ایک محاذ سامراجی اقتدار کو ختم کرنے کی جدوجہد کا تھا اور دوسرا محاذ سامراجی نظام تعلیم کی سامراجیت کا مقابلہ کرنے کے لئے ملت اسلامیہ کی دینی وثقافتی طور پر بقاؤ حفاظت کے لئے دینی تعلیم کے مراکز قائم کرنے کا تھا' تاکہ ملت کے نوجوانوں کو ذھنی غلامی سے بھی بچایا جاسکے چنانچہ ان کوششوں اور توجہات سے مختلف جگہوں پر ایسے حالات پیدا ہوئے جن سے مستقبل کی راہ کھلتی گئی اور مسلمانوں کے حیات نو کے اشارے ظاہر ہوتے گئے اور گزشتہ صدی مشکل سے نصف گزری ہوگی کہ یہ ممالک طوق غلامی سے خلاصی حاصل کرنے لگے اور ان کے ساتھ ذھنی وعلمی بیداری میں بھی اضافہ ہوا جس سے اسلامی طاقتوں کو مستقبل کے بہتر ہونے کی اچھی توقع قائم ہوئی' اس کی بناء پر مختلف اہل فکر کہنے لگے کہ اگلی صدی اسلام کی صدی ہوگی اور بعض اہل دانش یہاں تک کہنے لگے کہ ۲۱ ویں صدی مسلمانوں کی صدی ہوگی جس میں سامراجی طاقتوں کا مکمل زوال اور مسلمانوں کا عروج سامنے آئے گا اور ایسا خیال کرنا کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا کیونکہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی رہنمائی میں عہد اول کی مثالوں پر عمل کیا جائے تو غیر معمولی تغیر لایا جاسکتا ہے جیسا کہ اسلام کے ظہور کے بعد لایا گیا تھا کہ عرب مسلمان ترقی کر کے ۸ ویں صدی عیسوی اور ۱۴ ویں صدی عیسوی کے درمیان اقتدار اور اجتماعی وتعلیمی زندگی کے ہر میدان میں دوسری قوموں سے آگے اور علوم زندگی اور تحقیق وتدبر کے معاملات میں فائق رہے تھے یہ بات ان کو اس صلاحیت اور عمل سے حاصل ہوئی تھی جو کتاب اللہ اور تعلیمات نبویؐ نے ان کو عطا کی تھی لیکن بتدریج ان ہی مسلمان ملکوں میں ان تعلیمات کو اپنی زندگی کا دستور بنائے رکھنا اور اس کی رہنمائی میں

آگے بڑھنے کا اہتمام کرنا بتدریج کم ہوتا چلا گیا اور ترقی و قوت سے جو وسائل راحت' عزت اور منافع ان کو حاصل ہوئے تھے وہ ان ہی میں مشغول ہوتے چلے گئے' چنانچہ مسلمان من حیث القوم تعلیمات اسلام سے روگردانی اور عالمی میدان عمل میں پست ہمتی اور کمزوری اختیار کرنے پر عروج کے مقام سے گر کر زوال کے مقام تک پہونچ گئے جو آج سے دو صدی قبل پوری طرح عیاں ہو گیا تھا' لیکن ان کو یہ بات محترک بھی کرنے لگی تھی کہ سابق تاریخ کو دوبارہ تازہ کرنے کی کوشش ان کو پھر ان کے سابق مقام عظیم تک رواں دواں کر سکتی ہے اور یہی بات تھی کہ نئی صدی کا استقبال مسلمان ایک اچھی امید کے ساتھ کرنے لگے تھے۔

لیکن اب جبکہ نئی صدی کا آغاز ہو چکا ہے ہم عالم اسلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو امید کے ساتھ کسی قدر مایوسی بھی نظر آتی ہے امید تو اس بات سے ہے کہ اسلامی فکر کی توضیع اور سربلندی کے تقاضوں کے تذکرہ پر اچھا خاصا لٹریچر پڑھے لکھے طبقے میں پھیلا ہے اس سے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں کی اسلامی آبیاری ہوتی ہے' خاص طور پر نوجوانوں میں اس سے اچھا فکر و حوصلہ اور جذبہ پیدا ہوا ہے اور انہوں نے مسلمانوں کی سربلندی کے لئے جو کوششیں کیں ان کے بھی اچھے نتائج سامنے آئے جس کے اثر سے جو خاص بات دیکھنے میں آ رہی ہے وہ یہ کہ آج سے چالیس پچاس سال پہلے دین اور حمیت دین کے حامل زیادہ تر صرف عمر رسیدہ اور بوڑھے لوگ ہوا کرتے تھے' اور مغربی تمدن کے سامنے خود سپردگی اور احساس کمتری زیادہ تر نوجوانوں میں نظر آتی تھی اب اس کے برعکس دینداری اور اسلام کی حمیت کا جذبہ خاص طور پر نوجوانوں میں اور ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے اور مذہبی لٹریچر اور دین کی ضرورت کے احساس نے مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک خاصی تعداد کو متاثر کیا ہے اور مسلمانوں کی عمر رسیدہ نسل میں بھی اس کے اثرات نظر آ رہے ہیں' دعوت و سیاست کا کام بھی اچھے پیمانے پر کیا جا رہا ہے اور اسلامی حمیت و تاریخ ماضی کی عظمت کے احساس نے مسلمانوں میں جوش سا پیدا کر دیا ہے جس کو دیکھ کر مغربی اور اسلام دشمن طاقتوں میں بڑی تشویش اور اسلام بیداری کو روکنے کے لئے بڑی فکر اور توجہ پیدا ہو گئی ہے اس کو دبانے اور کچلنے کے لئے جگہ جگہ ظلم اور سخت گیری اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ بگاڑنے کی بھرپور کوشش کی جانے لگی ہے' لیکن اس نے ایک حد تک اسلام کی حمیت اور جوش کو کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دیا ہے' دوسری طرف مغرب کے دانشور اور اہل سیاست چونکہ اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کے اسی دینی جذبہ کو سمجھتے ہیں' چنانچہ وہ دیگر مختلف تدابیر سے بھی اس کو دبانے اور ختم کرنے کے لئے لگے ہوئے ہیں اور ایسا عمل اقتصادی اور سیاسی دباؤ اور دھوکہ اور فریب سے ذہنوں کو راہ راست سے ہٹانے کی تدبیروں سے کیا جا رہا ہے اور اس کے لئے ایسا اسلوب اختیار کیا جا رہا ہے

کہ اس کو سمجھنا بعض وقت بہت مشکل ہو جاتا ہے' انہی تدابیر میں ایک تدبیر مسلمانوں کے مختلف گروپوں میں جوش پیدا کر کے آپس کا ٹکراؤ پیدا کر دینا ہے۔

ادھر گزشتہ بیس سال میں مسلم ممالک کی کئی آپسی جنگوں میں یہی مقصد کارفرما رہا ہے اور اب جبکہ پوری دنیا کو تنہا ایک حکومت کے تحت لے آنے کی کوششیں جاری ہیں جس کا سربراہ یہود نواز امریکہ ہے، مسلم دشمنی کے مقاصد کو بڑی تقویت مل جانے کا اندیشہ ہے اس سے بچاؤ کے لئے دو باتوں کی بڑی ضرورت ہے' ایک تو یہ کہ مسلمانوں کے دینی و اسلامی جوش کو اسلام دشمن طاقتوں کے مکارانہ استحصال سے بچایا جائے اس کیلئے گہری نظر اور حالات وواقعات سے وسیع واقفیت کی ضرورت ہے دوسری بات جسکی شدید ضرورت ہے وہ یہ کہ مغرب کو جن وسائل پر زیادہ قابو حاصل ہے اسمیں ایک عسکری اور دوسرے اقتصادی وسائل میں ان پر قابو پانا اصلاً مسلمان حکومتوں کا کام ہے اور وہ اس وقت اس سلسلہ میں بالکل ناکارہ ثابت ہو رہی ہیں اور بظاہر ابھی جلدی وہ اس پر قابو نہ پا سکیں گی اس میں مسلم عوام اپنے جذبہ وہمت اور غیرتِ دینی کے اثر سے کچھ کر سکیں تو وہ الگ بات ہے لیکن اس کا بہت زیادہ نتیجہ خیز ہونا دشواری رکھتا ہے البتہ تعلیم اور ابلاغ ایسا ذریعہ ہے کہ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان اپنی کمزوری کو دور کرنا چاہیں تفوق پیدا کرنا چاہیں تو یہ زیادہ دشوار نہیں ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم علمی وفکری میدان میں تفوق پیدا کریں اور اس کی صلاحیت عوام میں عام کریں جسکے ذریعہ ہم طاقت واثر کے بہت سے وسائل پر قابو پا سکیں گے اپنے مخالفین کی رائے پر اثر انداز ہو سکیں گے اور اسلام کے پیغام اور اسکی انسانیت نوازی وحق پرستی کو انکے ذہنوں میں بٹھا سکیں گے اور اس طرح ہم اگر اپنے مخالفین کے دانشور طبقہ کو متاثر کر سکیں گے تو یہ ہماری بہت بڑی جیت ہوگی کیونکہ قوموں اور ملکوں کی قیادت دانشور طبقہ ہی کرتا ہے اور اس کیساتھ ساتھ ابلاغی وسائل کو ہم اپنے قابو میں لا سکیں یا متوازی ذریعہ ابلاغ جو عالمی سطح پر اثر ڈال سکتا ہو اس میں امتیاز پیدا کر سکیں تو ہمارے دشمنوں کی طرف سے حقائق کو مسخ کرنے اور مسلمانوں کے چہرہ کو بگاڑنے کی جو سازش بڑے پیمانہ پر چل رہی ہے اس سازش کو ہم ناکام بنا سکتے ہیں اس طریقہ سے ہم رائے عامہ جو موجودہ دور میں بڑی غیر معمولی طاقت سمجھی جاتی ہے اس کو اپنا معاون اور ہمدرد بنا سکتے ہیں' لیکن یہ باتیں ایسی ہیں کہ ہم کو جذباتیت سے بلند ہو کر حکمت کے ساتھ اور وسیع طرقہ سے اپنانا ہوگا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس میں بڑی کوتاہی ہوئی ہے اور اس کوتاہی کا سلسلہ جاری ہے اور ہم اس کوتاہی کو دور کرنے کی طرف ویسی توجہ نہیں دے رہے ہیں جیسی دینا چاہیے تھی اسلئے ہم کو اس طرف خصوصی توجہ کرنا ہے۔

مسئلہ اس وقت بہت سنگین بن جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علمی وابلاغی محاذ پر مخالفین

اسلام سرگرم ہیں اور ہماری طرف سے اس کو اہمیت نہیں دی جارہی ہے اور بعض وقت ہم ایسی جذباتیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس سے ہمارے مقصد کو کوئی دیرپا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور دشمن اس سے اپنا دیرپا فائدہ اٹھالیتا ہے اگر ہم کو اس صدی کو اسلامی صدی بنانا ہے تو جوش و جذبہ کی بیداری قائم رکھتے ہوئے علمی و دعوتی بیداری پر بھی زیادہ توجہ صرف کرنا ہوگی بلکہ جوش پر ہوش کو غالب کرنا ہوگا لیکن اس کیساتھ ساتھ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم کو اپنی انفرادی زندگیوں میں اس اعلیٰ کردار کو بحال کرنا ہوگا کہ جو دوسروں پر اثرانداز ہونے اور اور معاملات کو صحیح رخ دینے میں اہم ترین کام انجام دیتا ہے اور جو اسلام کے متعلق حسن ظن پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے اور اسلام کو سرعت کیساتھ دنیا میں پھیلنے کا فائدہ دراصل ایسے ہی اعلیٰ کردار کی بنأ پر ہوا ہے اور دراصل ہمارے دنیاوی زوال کی تاریخ بھی ہمارے اسلامی کردار و سیرت میں زوال پیدا ہونے سے جڑی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "

وانتم الاعلون ان کنتم مومنین "

"تم سب سے بلند رہو گے اگر تم ایمان والے ہوئے"

لہذا مسلمانوں کی سربلندی دراصل انکے اسلامی کردار و سیرت سے وابستہ ہے اسکے بغیر عزت و سربلندی حاصل نہیں ہو سکتی اور اس کردار و سیرت کو پیدا کرنے کیلئے ہم کو دعوتی کام بڑے وسیع اور مخلصانہ پیمانہ پر کرنا ہوگا اس کے بغیر نہ ہمارا حال اچھا ہو سکتا ہے اور نہ ہمارا مستقبل شاندار ہو سکتا ہے' موجودہ صدی میں ہماری عظمت کا انحصار اسی پر ہے کہ ہم ان وسائل قوت و اثر کو اختیار کریں جن سے مغرب نے مشرقی قوموں کو غلام بنایا ہے اور علم و تعلیم و ذرائع ابلاغ اور وقت کے مطابق حکمت عملی اور اس کے ساتھ بلکہ اس سے بھی زیادہ اعلیٰ اسلامی حوصلہ اور کردار اختیار کریں جن سے آراستہ ہونے پر اولین اسلامی عہد کی اعلیٰ ترین مثال اور دنیا کی قوموں کے مقابلہ میں سب سے بلند و بالا عہد بنا تھا اللہ تعالیٰ ہم کو ان باتوں کی صحیح توفیق عطا فرمائے۔

مولانا حامد الحق حقانی سمیع
مدرس جامعہ دار العلوم حقانیہ

افغانستان کی تازہ صورتحال اور عالم اسلام کی مجموعی حالتِ زار اور مستقبل کے بارے میں مولانا سمیع الحق صاحب کا تفصیلی انٹرویو

اکیسویں صدی کے نمبر کے سلسلے میں حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کی ایک خصوصی تحریر شائع کرنے کا پروگرام تھا لیکن نئی صورتحال اور عالمی حالات میں تبدیلی کے پیش نظر آپ کا وہ تفصیلی انٹرویو یہاں پیش کیا جارہا ہے جو آپ نے ملک کے دو ممتاز اردو اخبارات روزنامہ "جنگ" "اوصاف" اور امریکہ کے معروف چینل "CBS" کو دیئے۔ان کی اختصار کے ساتھ تلخیص پیش کی جارہی ہے۔ ...... (ادارہ)

روزنامہ اوصاف کا افتتاحیہ

اکوڑہ خٹک کا دارالعلوم حقانیہ برصغیر میں اپنی نوعیت کا اوحد علمی ادارہ ہے جس کے علم وفضل کی دھاک پوری دنیا پر ہے اور اس کی بہادری کا لوہا شرق وغرب اور شمال وجنوب مانتے ہیں۔ تل ابیب' واشنگٹن' ماسکو اور دہلی اس کے خوف سے لرزاٹھتے ہیں۔ عالم اسلام کو اسی درالعلوم نے طالبان جیسی طاقت عطا کی۔ اسی دارالعلوم کے مہتمم مولانا سمیع الحق کی سربراہی میں پاکستان اور افغانستان کے دفاع کی جنگ لڑی جارہی ہے اور حکومت پاکستان نے انہیں نقض امن کا تحت نظر بند کر دیا ہے۔ اس نظر بند دینی وسیاسی رہنما کے انٹرویو کے لئے ہمارے میاں طاہر محمود اور عابد ظہور ملک سرگرم ہوئے اور اکوڑہ خٹک میں انہوں نے مولانا سے تاریخی انٹرویو کیا جس کا ملکی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ حوالہ دیا جاتا رہیگا یہی تاریخ ساز انٹرویو آپکی نذر کیا جاتا ہے۔

اوصاف: مولانا! آپ نے کہا کہ یہ پاکستان اور افغانستان کے بقا کی جنگ ہے تو کیا پاکستان کو بھی اسی طرح کے خطرات درپیش ہیں جیسے افغانستان کو ہیں؟

مولانا سمیع الحق: پاکستان کو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بھی زیادہ خطرات درپیش ہیں۔ اس پر تو قیامت گزرنا تھی گزر گئی۔ وہاں کیا رکھا ہے امریکہ کو وہاں سے کیا ملے گا۔ نہ کوئی بلڈنگیں اور نہ کارخانے ہیں ان کا دس لاکھ کا ایک میزائل دس روپے کے خیمے پر گرتا ہے۔ اس کا ٹارگٹ یہ سارا علاقہ ہے جنوبی ایشیا میں وہ قدم جمانا چاہتا ہے

اس کا مقصد ہے کہ پورے علاقے کو کنٹرول کرے اس کے بڑے مقاصد ہیں ایک تو سیاسی مقاصد ہیں بالادستی پوری دنیا پر سپر ورلڈ آرڈر کے تحت، دوسرے اقتصادی مقاصد ہیں، بہت بڑے ذخائر ہیں ان علاقوں میں معدنیات گیس پیٹرول اور کچھ ایٹمی ذخائر۔ سائنس دانوں نے مجھے بتایا کہ کچھ خاص اور اہم ترین قسم کی معدنیات زیر زمین ہیں۔ علاقہ سنٹرل ایشیاء اور افغانستان کا علاقہ بھرا ہوا ہے وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح خلیجی ریاستوں اور جزیرۃ العرب میں اڈے بنا کر ان کو کنگال کر دیا ہے اسی طرح اس علاقے میں بھی اڈے بنائے۔ گویا اس طرح اس نے ایک ورلڈ ٹریڈ سنٹر اڑا کر دس ورلڈ ٹریڈ سنٹر بنانے کا منصوبہ بنایا ہے پوری قوت اور ذخائر ان کے ہاتھ میں ہوں گے۔ چین کو یہ کنٹرول کریں گے ایران سے ایک ایک کر کے بدلہ لیں گے ایران جو امریکہ مخالف ملک ہے وہ ان کے زیر اثر نہیں آرہا تھا۔ وہ پھر بھی اپنے راستے میں پاکستان کو کچھ رکاوٹ سمجھتے ہیں افغانستان جو جہاد کا مرکز تھا ایک قوت تھی۔ ہماری مغربی سرحدیں محفوظ ہو گئی تھیں۔ روسیوں کی سازشوں سے پختونستان اور بھارتی سازشوں سے ہم محفوظ ہو گئے تھے۔ ادھر سے ہمیں کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ہمارے لئے آہنی دیوار بن گئے تھے اسے توڑ کر پاکستان کو کنٹرول کرنا چاہتے ہیں اس کا ایک مقصد پاکستان کا دینی تشخص بھی ہے ہم اسے اسلام کا قلعہ کہتے ہیں اور یہ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ نے اسے ایٹمی قوت بنا دیا ہے۔ ایٹمی قوت اللہ نے بنایا ہے پاکستانی قوم کا کمال نہیں ہے۔ سائنس دانوں کا بھی کمال ہے لیکن اللہ نے انہیں اتنی توفیق دی ورنہ ہمارے سائنس دانوں نے تو ایک ڈھب کی سائیکل بھی نہیں بنائی آج بھی چین کی سائیکل ہمارے ہاں بہتر مانی جاتی ہے۔ ان حالات میں اللہ نے ہمیں ایٹمی طاقت دی۔ اس نے امت مسلمہ کو ایک ہتھیار دینا تھا۔ مسلمان یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نہتے تھے بے بس تھے کافروں کو تو سب کچھ دیا اور ہمیں ہتھیار بھی نہ دیا۔ اللہ نے اتمام حجت کر دی اب اس کی حفاظت کرنا اور جنگ لڑنا تو ہمارا فریضہ ہے۔

اوصاف: ایٹمی تنصیبات پر ان کا کنٹرول ابھی نہیں ہوا؟

مولانا سمیع الحق: مختلف محاذوں پر لڑائیاں چل رہی ہیں ابھی تک مکمل کنٹرول ان کا نہیں ہوا۔

اوصاف: مزار شریف اور کابل کو خالی چھوڑنے کی حکمت عملی کیا ہے؟

مولانا سمیع الحق: یہ تو خانہ جنگی کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ ہے وہاں تقسیم در تقسیم کا عمل ہے پھر جنوبی بن جائے یا شمالی بن جائے اور کابل ایک آزاد شہر ہو یوں نہیں ہو سکتا۔ افغانستان میں ایسا ہونا ممکن نہیں کہ برلن کی طرح آزاد شہر ہو۔ باہر سے وہ کوئی تسلط قبول نہیں کرتے۔ یہ سازشیں ناکام ہو جائیں گی اگر سارے شہر بھی ان کے ہاتھ آجائیں تو کوئی پریشانی نہیں ہے کیونکہ سوویت یونین نے بارہ سال قبضہ رکھا تو گوریلا جنگ تو گوریلا جنگ ہے اس میں وہ خود بھاگیں گے اور انہیں کوئی ٹھکانہ نہیں مل سکے گا۔ سارے شہر روس کے ساتھ تھے۔ کابل، قندھار، ہرات وغیرہ سب شہر اس کا قبضہ میں تھے لیکن آخر کار اسے بھاگنا پڑا تو جب روس وہاں نہیں ٹھہر

سکا تو یہ کیا ٹھہریں گے؟ اب گنجان شہروں کو بچانے کے لئے طالبان کی حکمت عملی واضح ہے وہ آسانی سے ہار ماننے والے نہیں۔ عربی میں کہتے ہیں کہ "جنگ تو داؤ پیچ کا نام ہے" ہمارا میڈیا مضبوط ہوتا تو ہم یہ جنگ جیت چکے ہوتے۔ ایک الجزیرہ نے کچھ کام کیا ہے۔ مزار شریف ایک کھلا میدان ہے وہاں جب امریکی فوجیں بمباری کر رہی تھیں تو طالبان کیلئے مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح پانسہ پلٹ دیں کیونکہ بمباری کے ذریعہ شمالی اتحاد کی فوج کو تحفظ دیا جا رہا تھا۔ شمالی اتحاد تو ان کا ٹٹو ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں تک اس نے بھاگنا ہے اگر شمالی اتحاد قبضہ کر سکتا تو امریکہ سے ہدایت لینے کی کیا ضرورت تھی؟ وہاں متبادل حکومت کی کوئی صورت نہیں ہے حالانکہ پاکستان وغیرہ نے کوشش بھی کی تھی لیکن طالبان ہی کامیاب ہوئے۔ قبائلی لسانی اور نسلی تعصبات بہت زیادہ ہیں۔ اس وقت بھی طالبان مجبوراً آئے تھے وسیع البنیاد حکومت اس وقت بن جاتی تو طالبان کسی صورت نہ آتے اور یہ خوش تھے لیکن زمینی حقائق کے اعتبار سے اس وقت یہ ممکن نہیں ہے اب صرف یہ ہوگا کہ پورے افغانستان کا شیرازہ بکھر جائے گا تمام صوبوں میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی دو دو تین تین میل پر پھر پھاٹک لگ جائیں گے غنڈے کمانڈر پھر عصمتیں تار تار کریں گے اور امن ختم ہو جائے گا اسلئے افغان عوام اس قدر شدید امریکی بمباری کے باوجود طالبان کے خلاف نہیں ہوئے امریکہ کا خیال تھا کہ افغان عوام کھڑے ہو جائیں گے کہ تمہاری وجہ سے ہم پر بمباری ہو رہی ہے مجھ سے بار بار پوچھا گیا کہ افغان عوام کیوں نہیں اٹھتے۔ یہ کرسٹینا لیمب بڑی تیز ہے یہاں بیٹھی رہی ہم نے سختی سے روکا کئی کئی گھنٹے تفتیش کے انداز میں سوالات کرتی رہی۔ میں نے کہا اگر افغانستان کے عوام نہیں اٹھتے تو تمہیں کیا تکلیف ہے؟ میں نے اسے بتایا کہ عوام جانتے ہیں اگر طالبان کی چھتری ان کے سر سے ہٹ گئی تو خیر نہیں ہے۔ پھر سو سو جنازے روزانہ اٹھیں گے کئی دفعہ تو ان جنازوں کو اٹھانے والا کوئی نہیں ہوتا

اوصاف : لگتا ہے کہ تقسیم افغانستان کا کوئی فارمولا طے ہو گیا ہے؟

مولانا سمیع الحق : امریکہ کی پہلے دن سے کوشش تھی کہ افغانستان میں کوئی مستحکم اور اسلامی حکومت قائم نہ ہو کیونکہ ایسی کوئی بھی حکومت اینٹی امریکہ ہوگی۔ شمالی اتحاد پر پورا اعتماد ان کو نہیں ہے خود ربانی کی ساری ہمدردیاں روس اور پیوٹن کے ساتھ ہیں۔ اگر ان کی حکومت قائم ہو بھی گئی تو روس ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ ایران ان کے ساتھ چمٹا رہے گا۔ امریکہ کو کھل کھیلنے کا موقع نہیں ملے گا لہٰذا امریکہ افغانستان کو تقسیم کرنا چاہے گا تا کہ کسی ایک جگہ وہ مضبوط ہو کر بیٹھ سکے اونٹ خیمے میں سر ڈالنا چاہتا ہے یہ ایک بہت بڑی سازش ہے اس میں پاکستان کو بہت نقصان ہوگا اگر قومیت، نسلی اور لسانی سطح پر ایک دفعہ تقسیم ہو گئی تو جو علاقے ہماری سرحدوں کے ساتھ ہیں اس کے اثرات صوبہ سرحد اور بلوچستان اور قبائل پر پڑیں گے۔ الحمد للہ اب قومیت کا جن بوتل میں بند ہے قوم پرست پھر اٹھ کھڑے ہوں گے بہت بڑی مصیبت پاکستان کے لئے آنے والی ہے یہ صرف ان لوگوں کی بے بسی کی وجہ سے ہے۔ وہ عفریت جسے ہم نے بوتل میں بند کیا وہ سب (پختونستان وغیرہ) ایک بار پھر ابھر

آئے گا وہ کہیں گے کہ ادھر فارسی وان ہیں اور ادھر پختون۔ اسلام تو نسل پرستی کا قائل ہی نہیں۔ طالبان نے تفریق ختم کردی تھی ان کی حکومت حقیقی معنوں میں وسیع البنیاد تھی اس میں ازبک بھی تھے تاجک تھے۔ فارسی بولنے والے اور پختون بھی تھے اگر یہ حالات بنتے ہیں تو خدانہ کرے امریکہ کوشش کرے گا کہ پختون اس کے ساتھ مل جائیں۔ سرحد' بلوچستان اور قبائل سب سے ہم ہاتھ دھو بیٹھیں گے پھر ایک پنجاب ہوگا تو امریکہ بھارت کو کہے گا کہ آؤ مشرق سے جو ان کی مرضی میں آئے گا بھارت کے ذریعے کروائیں گے۔ مغربی سرحدیں محفوظ نہ رہنے کی صورت میں مقابلے کی سکت نہیں رہے گی سندھ کے پہلے سے انہوں نے نقشے بنائے ہوئے ہیں' میں اب بھی حکومت سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ خدا کے لئے ٹھنڈے دل سے سوچے اور پالیسی پر نظر ثانی کرے اور اپنے فیصلے واپس لے۔

اوصاف: آئی ایس آئی نے طالبان تحریک کو سپورٹ کیا اب اس نے بھی پالیسی بدل لی ہے؟

مولانا سمیع الحق: پاکستان کی حکومت اور آئی ایس آئی نے 20 سال بہت بہتر پالیسی چلائی تھی اس کو ناکام نہیں کہا جاسکتا۔ اگر وہ اس قدر مدد نہ کررہے ہوتے اور کھڑے نہ ہوتے تو یہاں روس آچکا ہوتا۔ پاکستان کی آزادی اس وقت ہی سلب ہو چکی تھی۔ پاکستان اور افغانوں نے مل کر اس وقت بڑی قربانی دی اس میں افواج پاکستان اور آئی ایس آئی کا بہت بڑا کردار ہے۔ بعد میں آئی ایس آئی والوں نے بہت کوشش کی کہ افغان گروپ لیڈروں کو اکٹھے بٹھایا جائے۔ نواز شریف دور میں ہم لوگ بھی شریک تھے اور ان کو مکہ معظمہ بھی لئے گے۔ خانہ کعبہ میں ان سے حلف لئے گئے۔ ان ساری کوششوں کو جہادی لیڈروں نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ پھر طالبان آگئے طالبان آئی ایس آئی کی وجہ سے نہیں آئے۔ مجھے ساری صورتحال معلوم ہے اس کے پیچھے کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ جب تک مستحکم حکومت کے قیام میں کامیابی نہیں ملی پھر طالبان تو بدامنی' بدنظمی کو کنٹرول کرنے گئے تھے وہ تو ایک علاقے میں گئے تھے کہ ظلم وستم کو روک دیں یہ تصور نہیں تھا کہ دور تک جانا پڑے گا۔ اللہ نے اس قوم پر رحم کرنا تھا تو یہ لوگ آگے نکلے عوام نے ساتھ دیا۔ اسلحہ کے ڈھیر لگادیے کہ ہمیں ان ظالموں سے نجات دلادو اس طرح اللہ نے انہیں پھیلایا وہ بغیر گولی چلائے کابل تک پہنچے۔ مجھے نہیں پتا کہ آئی ایس آئی والوں کی اس وقت پالیسی کیا ہے۔ میں نے جنرل مشرف سے ملاقات میں کہا تھا کہ ہم نے بیس سال تک قربانی بھی دی۔ پاکستان نے انصار مدینہ کی یاد تازہ کردی۔ ایک سپر پاور کو شکست دیدی بیس سال تو انہیں بچانے میں لگ گئے ایک مگرمچھ کے منہ سے بچا کر اب ہم انہیں اس سے بڑے مگرمچھ کے منہ میں ڈال دیں۔ دنیا کہے گی کہ یہ کیسے فیصلہ کرنے والے لوگ ہیں میرے خیال میں آئی ایس آئی بے بس ہوگی یا حکومت کے دباؤ میں ہوگی ورنہ اسے سوچنا چاہیے تھا کہ طویل ترین جدوجہد پر پانی پھیرا جارہا ہے ملک کی سلامتی داؤ پر لگ گئی ہے۔ میں نے ابتداء میں کہا تھا کہ اصل خطرہ تو ہمیں ہے افغانستان تو کھنڈر تھا۔ ہمارے پاس ایٹمی صلاحیت ہے افرادی قوت ہے۔ اللہ نے وسائل دیئے

ہیں تو ہم کیوں دب گئے ہیں اس لئے ہم زیادہ پریشان ہیں اس لئے شدت سے چاہتے ہیں کہ یہ جنگ لڑی جائے یہ ملک کی بقا کی جنگ ہے۔ پاکستان کی تخلیق بڑی مشکل سے ہوئی ہے۔ جغرافیہ پر پہلے یہ کہیں موجود نہیں تھا۔ اس کے لئے ڈیڑھ سو برس جنگ لڑی گئی انگریز کو نکالا گیا پھر لاکھوں کروڑوں انسانوں نے قربانی دی نظریہ کی بنیاد پر یہ ملک بنا۔ اب اگر نظریہ درمیان سے نکل جائے اور امریکہ کا تسلط ہو جائے تو پھر اسے کوئی جوڑ نہیں سکے گا۔ بغاوتیں جنم لیں گی، کوئی کہے گا کہ امریکہ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے کوئی کہے گا کہ رہیں گا کوئی افغانستان کے ساتھ جڑے گا۔ ایم کیو ایم کی طرح الگ الگ ریاستیں بنانے کے منصوبے بنائیں گے۔ اب پتہ نہیں یہ پالیسی تبدیل کر دی گئی ہے ایسے لگتا ہے کہ کچھ جرنیلوں کی خواہش تھی کہ ہمیں طالبان سے نہ لڑوایا جائے۔ وہ طالبان یا افغانستان سے کسی طور ٹکر نہیں لینا چاہتے۔ دو بھائی، مسلمان باہم برسرپیکار ہو جائیں اور ہماری زمین سے جہاز اڑیں اور مسلمانوں پر بمباری کریں۔ میرا خیال ہے کہ ان کو سبکدوش کرنے میں بھی امریکہ کا کردار ہے تو یہ بھی بے بس ہیں یہ فیصلے نہیں کرتے ان پر فیصلے اوپر سے آتے ہیں ہم تو ایک کالونی بن گئے ہیں امریکہ کہتا ہے کہ خیراتی ادارے بند کر دو۔ الرشید ٹرسٹ بند کر دو۔ فلاں کو تبدیل کر دو فلاں جگہ فلاں جنرل بٹھاؤ۔ افغان سفیر کو نہ بلاؤ پاکستان کے ائیر بیس امریکہ کے کنٹرول میں ہیں۔ اس کا حکم چلتا ہے جرنیلوں کی اکھاڑ پچھاڑ بھی اس کے حکم سے ہوتی ہے تو یہ سلسلہ چلتا رہے گا انہیں موقع دیا گیا اور ہم ان کے احکامات کی تعمیل میں ہی لگے رہے۔

اوصاف: کیا دینی جماعتوں کو انتخابی سیاست میں حصہ لینا چاہیے اور مغربی جمہوریت کے نظام کا حصہ بننا چاہیے، منہج نبوی کیا ہے؟

مولانا سمیع الحق: اصل طریقہ تو انقلابی ہے کہ ہم اسلام کی بالادستی کے لئے لڑیں۔ لوگوں نے کہا کہ پارلیمانی زمانہ ہے جمہوریت کا دور ہے تو ہم نے پچپن سال تک آزمایا ہے اس میدان کو یہ نہیں کہ میدان سے ہٹ گئے۔ پہاڑوں میں چلے گئے اور تلوار اٹھالی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس وقت پارلیمانی جدوجہد شروع کی۔ قرار داد مقاصد پاس کروائی۔ انتخابات میں ہم حصہ لیتے رہے۔ ہم نے ہر میدان آزمالیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اس طریقے سے کچھ حاصل کر لیں گے۔ میرا تیس سالہ تجربہ ہے پارلیمانی نظام کا، پارلیمنٹ میں اسلامی ترامیم کی جنگ لڑتا رہا۔ اتنا فائدہ ہوا ان بزرگوں کی جدوجہد کا کہ دستور کا اسلامی تشخص بچ گیا۔ ورنہ شیخ رشید جیسے لوگ موجود تھے بلایے سوشلزم جو بالکل سوشلسٹ بنانا چاہتے تھے پھر قادیانی مسئلہ آیا تو کامیابی حاصل ہوئی۔ اس حد تک تو کافی کامیابیاں ملیں مجلس شوریٰ میں ہم نے اسلام کی تین سال تک جنگ لڑی وہ ادارہ بالکل دارالعلوم بن گیا تھا اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ 85ء تک سینٹ اور اسمبلی میں جاتے رہے۔ میں بھی گیا میں تو اس نتیجے پر پہنچا کہ کچھ نہیں ہو گا اس جدوجہد سے اسمبلیوں میں جاتے تھے ہم کوئی انقلابی تبدیلی نہیں لاسکیں گے یہ نظام جوں کا توں رہے گا یہ سب اسے تحفظ دیتے ہیں اس حوالے سے کوئی بھی پوزیشن (حکومت) اور اپوزیشن نہیں ہے۔ یہ دونوں ایک

نظام سے لپٹے ہوتے ہیں جس میں طبقاتی اور سامراجی ہتھکنڈوں کو تحفظ ملتا ہے وہی جو جیل کا نظام ہے اس نظام کو انہوں نے ملک پر مسلط کیا ہوا ہے ہری پور جیل کے قوانین باہر بھی چل رہے ہیں اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ لوٹ کھسوٹ اور جاگیر دارانہ سسٹم ہے چند خاندانوں کی اجارہ داری ہے میں تو پچاس سال سے ان لوگوں کو یہی کہتا رہا ہوں کہ خدا کے لئے کوئی متبادل سوچو۔ اس چکر میں مت پڑو یہ سب برائی کے محافظ ہیں۔

اوصاف : اتنا عرصہ آپ اتمام حجت کرتے رہے ہیں؟

مولانا سمیع الحق : اور کوئی راستہ ہمارے سامنے نہیں تھا۔ افغانستان میں تو دشمن قابض ہو گیا تھا ان کی مجبوری تھی کہ اب ان کا حق ہے کہ اپنا نظام لائیں۔ میں دینی جماعتوں کو اکثر کہا کرتا ہوں کہ تم انقلابی سیاست اختیار کرو۔ پہلے مرحلے پر تمام دینی جماعتیں اکٹھی ہو جائیں۔ ایک پلیٹ فارم پر انتخابات کے لئے ایک موقف ہو' دلوں میں بھی کھوٹ نہیں ہونا چاہیے سات یا آٹھ دینی جماعتوں' جو ہیں ان کا ایک ہی انتخابی نشان ہو' ایک ہی امیدوار اور ایک ہی ایجنڈا ہو۔

اوصاف : کیا دینی جماعتیں ایک لیڈر پر اکٹھی ہو سکتی ہیں؟

مولانا سمیع الحق : ایک لیڈر پر متفق ہوں یا نہ ہوں' جدوجہد تو مشترکہ ہو گی اس طرح ہم سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں استعمال ہونے سے بچ جائیں گے۔ سیاسی جماعتیں ہمیں ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتی ہیں۔ کبھی مسلم لیگ اور کبھی پیپلز پارٹی' یہ ہمارے کندھوں پر بندوق رکھ کر آگے آتے ہیں اس کے بعد ذلیل و خوار کر کے لات مار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تم لوگوں کا سیاست سے کیا کام' جاؤ منبر و محراب سنبھالو' حکومت کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔ آخر کار وہی حکومت آتی ہے جو بیرونی مفادات کی محافظ بنتی ہے۔ اوصاف : کیا یہ اتحاد ممکن ہے؟

مولانا سمیع الحق : ممکن ہے جی' اگر اتنے تلخ تجربوں کے بعد بھی آنکھیں نہ کھلیں تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔ دفاع افغانستان کونسل بنائی ہے' میری کوشش تھی کہ ہم کسی ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو جائیں اس سے پہلے بھی میں نے کئی کوششیں کی ہیں مجھے بڑا تجربہ ہو چکا ہے مثلاً متحدہ شریعت محاذ بنایا تھا شریعت بل کے زمانے میں۔ اس میں بھی میں نے تمام دینی جماعتیں اکٹھی کی تھیں پھر ملی یکجہتی کونسل بنائی وہ بھی اسی کمرے میں بنی۔ میں نے سب کے سامنے جھولی پھیلائی تھی' سنی' شیعہ' اہل حدیث' اس وقت ملک میں قتل عام جاری تھا۔ بیرونی طاقتیں ہمیں ذلیل و خوار کر رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ یہ ایک دوسرے کو مار مار کر ذلیل ہو جائیں اور لادینی قوتوں کا راستہ کھل جائے امام بارگاہوں اور مساجد پر بھی حملے کئے گئے ایک دوسرے کے خون کے پیاسوں کو ایک چھت کے نیچے بٹھایا۔ تین چار سال یہ اتحاد خوب چلا پھر سیاسی سازشی عناصر بیچ میں آ گئے۔ اتنی مار کھانے کے بعد اور جب امریکہ کا خطرہ بھی سر پر ہو تو دینی قوتوں کو اکٹھے ہو جانا چاہیے۔

اوصاف : قاضی صاحب! طالبان طرز حکومت کے حق میں دلیل دیتے ہیں کہ ہر ملک کے اپنے جغرافیائی

تقاضے ہوتے ہیں۔ تاریخی اور روایتی اعتبار سے نظام حکومت مختلف ہو سکتا ہے آپ کے خیال میں طالبان طرز حکومت پاکستان میں چل سکتا ہے؟

مولانا سمیع الحق: طالبان کے نظام کو لوگوں نے ہوا بنا دیا ہے۔ مغربی میڈیا نے اسے متشدد نظام کے طور پر پیش کیا ہے طالبان نے افغانستان میں عین اسلامی نظام نافذ کیا ہے۔ بدامنی تھی، افراتفری اور غنڈہ گردی کا راج تھا۔ طالبان نے خواتین کی عصمتیں محفوظ بنائیں۔ پہلے ایک فرلانگ تک بیٹی باپ کے ساتھ اور بیوی شوہر کے ساتھ نہیں جا سکتی تھی، غنڈے اٹھا لیتے تھے۔ طالبان نے تیزی سے فیصلے کئے کوئی ظلم نہیں کر سکتا۔ اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ بھی عام شہریوں جیسا سلوک کیا جاتا۔ ایک مرتبہ آئی جی ٹریفک کی گاڑی نے ایک شہری کی گاڑی کو ٹکر مار دی۔ آئی جی نے کہا چلو قاضی کے پاس چلتے ہیں جس کی غلطی ہو گی اسے سزا ملے گی۔ آئی جی کی غلطی ثابت ہو گئی اور اسے جرمانہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ معافی بھی مانگنی پڑی۔ ہمارے ہاں طاغوتی طاقتوں کا عدالتی نظام ہے سالہا سال سے خاندان پھنسے ہوئے ہیں تو ہم ایسے نظام کو بدلیں گے نہیں؟ اسلام تو کہتا ہے کہ فوراً مفت انصاف مہیا کیا جائے۔ امن قائم کرنے کے لئے حدود، اسلامی تعزیرات نافذ کرنا ہوں گی۔ بے حیائی اور فحاشی کو ختم کرنا ہے ایسا تو کوئی اسلام نہیں جس میں یہ سب منکرات ہوں۔ طالبان اور مسلمانوں کا اسلام ایک ہے۔ اسی اسلام کو یہاں بھی نافذ کریں گے۔ انہوں نے کیا وحشت اور درندگی پھیلائی؟ سکرٹ پہن کر پھرنے والی عورتوں کو ایسا کرنے سے منع کیا گیا کہ یہ غلط ہے؟ ہم بھی اسلام آباد کی سڑکوں پر کسی کو فحاشی کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ کیسا اسلام ہو گا جس میں منکرات کی اجازت دی جا سکے قرآن میں حکم ہے "نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو" اسلامی حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ فحاشی، برائی اور ظلم و جبر کو روکے پتہ نہیں ہم کس چیز میں ماڈریٹ ہونا چاہتے ہیں ہم عورتوں کو کام کرنے کی اجازت دیں گے۔ اسلام حجاب میں خواتین کو کام کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ افغانستان میں عورتوں کو بہت زیادہ آزادی حاصل ہے۔ 80 فیصد عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ کام پر جاتی ہیں۔ افغانستان کی خواتین کو مونیکا لیونسکی بننے کی اجازت تو نہیں دی جا سکتی۔ ان کے ذہنوں میں بدتمیزی، بے حیائی اور مخلوط معاشرے کے تصورات رچے بسے ہیں وہ ایک مادر پدر آزاد سوسائٹی ہے جس سے ان کے سنجیدہ حلقے خود نالاں ہیں۔ ایسا ماڈرن اسلام میرے ذہن میں تو کوئی نہیں، قاضی صاحب کے ذہن میں کوئی خاکہ ہو تو خدا کرے کہ وہ تفصیل کے ساتھ پیش کر سکیں۔

اوصاف: فوج سے کسی صلاح الدین ایوبی کی توقع ہے؟

مولانا سمیع الحق: امریکہ چاہتا ہے کہ ہماری فوج کا اسلامی تشخص ختم ہو جائے، ہماری قوم کا فوج کے ساتھ جو محبت اور ایمان کا رشتہ ہے وہ نہ رہے اور لوگوں کا اعتماد ختم ہو جائے۔ امریکہ نے سازش میں شریک کر کے بڑی حد تک اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے لوگوں کی وہ وابستگی اب شاید نہیں رہی اس لئے ہم جنرل صاحب سے کہتے ہیں خدا کے لئے اپنی پالیسیاں بدلیں، ہم نے بہت بڑا رسک لیا ہے۔ مستقبل میں بھی پاکستانی افواج سے عالم اسلام کی وہ

وابستگی اور امیدیں بر قرار نہ رہ سکیں گی جو اس سے پہلے تھیں وہ سوچیں گے کہ انہوں نے اپنے بھائیوں کے خلاف کافروں کے لئے دروازہ کھول لیا ہے یہ اپنے ملک کی حفاظت کیا کریں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پاک فوج کا دینی تشخص اور بھی بڑھ جائے اور پاکستان کو الجزائر بننے سے روک دیا جائے۔

اوصاف: لشکر اپنے سپہ سالار کے مطابق ہی عمل کیا کرتا ہے؟

مولانا سمیع الحق: اس کا اثر پڑتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے فوجی بھائیوں کے دل خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ جنرل صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ دو لفظ افغان بھائیوں کے حق میں بھی کہہ دیتے۔ امریکہ کی شان میں ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف کے حوالے سے ٹیلی ویژن پر کہا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ کیا وہ کیا۔ ٹھیک ہے کشمیر کے حوالے سے انہوں نے ہمت دکھائی لیکن اس وقت تو اس مریض کو ہمدردی چاہیے تھی جو بستر پر پڑا ہے۔ ایک جملہ ہی کہہ دیتے کہ افغانوں پر ظلم بند کرو، نہتے عوام پر بمباری کی مذمت کی جاتی اور چاہیے تھا کہ امریکہ کو بمباری بند کرنے کو کہا جاتا اس کا ہاتھ روکا جاتا۔ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں کی گئی۔

اوصاف: فوج تو ڈسپلن کی پابند ہے وہ کیا کر سکتی ہے؟

مولانا سمیع الحق: ہم یہ نہیں کہتے کہ فوج کچھ کرے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے دباؤ سے یہ پالیسی بدل دے۔ خدا کرے جنرل پرویز مشرف خود اپنی پالیسی پر نظر ثانی کر کے واپس آجائیں۔ مستقبل میں جو ہونے والا ہے وہ انتہائی شرمناک ہے۔ شمالی اتحاد کی صورت میں بھارت نواز ٹولے کو مسلط کیا جا رہا ہے یہ پاکستان دشمن قوتیں اسے ایک لمحے کو بھی تسلیم نہیں کرتیں یہ بھارت نواز رشید دوستم اور جنرل فہیم نے کیا کچھ نہیں کیا' یہ لوگ وحشی درندے ہیں۔ جنرل فہیم نے یہاں بچوں کی بس اغوا کی تھی۔ بھارت کہہ رہا ہے کہ وہ ان کی مدد کے لئے اپنی فوج بھیجے گا جو لوگ بھارتی فوج کے کندھوں پر سوار ہو کر آئیں گے وہ ہمارے دوست ہوں گے یا دشمن؟

اوصاف: احادیث مبارکہ میں "خراسان" کا ذکر آیا ہے یہ کون سا علاقہ ہے؟

مولانا سمیع الحق: یہ سارا علاقہ خراسان کہلاتا تھا' ہرات' غزنی اور بلخ اسی کا نام "خراسان" تھا۔ احمد شاہ ابدالی مرحوم نے سب سے پہلے لفظ "افغانستان" استعمال کیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید ایسا وقت آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی بڑی تبدیلی لائے۔ اس کی وجہ یہ بھی لگتی ہے کے ساری بڑی طاقتیں اللہ تعالیٰ نے یہاں مٹاتی ہیں۔ کھینچ تان کر ان طاقتوں کو افغانستان کے کنویں میں پھینک دیا گیا۔ انگریز بھی وہاں جنگ ہار چکا ہے اور سوویت یونین بھی۔ اب امریکہ کا ظلم واستبداد اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کا آخری انجام افغانستان میں دنیا کو دکھادے۔ اللہ کرے کہ یہاں سے اسلام کی روشنی اٹھے آثار تو یہی بتاتے ہیں۔

اوصاف: احادیث مبارکہ میں "نصرت مہدی" کیلئے روانہ ہونے والے جس لشکر کی نشاندہی کی گئی ہے وہ کیا طالبان ہیں؟ مولانا سمیع الحق: ہم بالکل یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتے یہ ایک شکل بھی ہو سکتی ہے۔ شاید

آئندہ کوئی اور صورت پیدا ہو جائے۔

اوصاف: کیا "معرکۃ المعارک" شروع ہو چکا ہے؟

مولانا سمیع الحق: بظاہر حالات تو ایسے ہی ہیں اس سے پہلے تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ عالم کفر کسی اسلامی ملک کے خلاف اتنی قوت کے ساتھ متحد ہوا ہو۔ پہلے یہ آپس میں لڑتے تھے۔ روس کسی ملک کے خلاف کاروائی کرتا تو امریکہ اس ملک کی پشت پر کھڑا ہوتا امریکہ کی کسی کاروائی کو روس روکتا تھا۔ عراق اور لیبیا کے معاملے میں روس نے مدد کی اور جہاں کہیں روس گیا وہاں امریکہ مقابلے میں آ گیا۔ اس سے پہلے یہ کبھی کسی اسلامی ملک اور امت مسلمہ کے خلاف ایک نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے جنگیں کسی ایک ملک کے خلاف ہوتی رہیں۔ موجودہ جنگ بظاہر افغانستان کے خلاف ہے لیکن اسے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا نام دیا گیا ہے۔ دہشت گردی ان کے نزدیک اسلامی جذبہ جہاد ہے گویا اس نے اسلام کو مٹانے کا اعلان کر دیا ہے اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ روس' امریکہ' برطانیہ' بھارت اور اسرائیل سب ایک ہو گئے ہیں' یہی "معرکۃ المعارک" ہے۔ اس سے بڑا "معرکۃ المعارک" کیا ہو سکتا ہے۔ پورا عالم کفر شیر و شکر ہو چکا ہے۔ اور ہمارے 55 اسلامی ممالک کے منافق حکمران بھی ان کے ساتھ ہیں۔ اسلام پر اس سے زیادہ کڑا اور نازک وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

اوصاف: کیا موجودہ عہد کو امت مسلمہ کا آخری حصہ کہا جائے؟

مولانا سمیع الحق: بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ یہ فیصلہ کن جنگ ہو گی۔ کفر و الحاد کی ساری طاقتیں قوت و اتحاد کے باوجود ملیامیٹ ہو جائیں گی اور پھر اسلام کی "نشاۃ ثانیہ" کا آغاز ہو گا۔

اوصاف: ایران' پاکستان' اور افغانستان کا ایک علاقائی اسلامی اتحاد ہو سکتا ہے؟

مولانا سمیع الحق: ایران اب بھی محسوس کر رہا ہے کہ اس نے جو پہلے کیا وہ وقتی مفادات کے تحت کیا۔ اب وہ اپنی پالیسی پر نظر ثانی کر رہا ہے۔ ایران' امریکہ مخالفت کے باعث' کبھی بھی شمالی اتحاد کی مدد نہیں کرے گا وہ شمالی اتحاد کی بلا شرکت غیرے حکومت کی حمایت بھی نہیں کرے گا۔ افغانستان کی تقسیم سے تمام پڑوسی ممالک کے لئے مسائل پیدا ہوں گے جس طرح پاکستان کو مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا اسی طرح ایران کو بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم سب' نہ ختم ہونے والی خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔ ایران کی پالیسی ان حالات میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ میں پہلے بھی ایرانی عوام اور ایرانی سفیر سے کہتا رہا ہوں کہ طالبان سے تمہارے جھگڑے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ تمہارا ایک امریکہ مخالف پوز ہے۔ اسلام پر ہم سب متفق ہیں۔ تم اپنا نظام چلاؤ' انہیں اپنا نظام چلانے دو۔ طالبان نے شیعہ حضرات کے خلاف کسی کاروائی کو برداشت نہیں کیا گیا۔ وہاں پر شیعہ ہونے کی بنا پر کسی کو کوئی سزا نہیں دی گئی نہ ہی فرقہ وارانہ فساد ہوا بلکہ گزشتہ محرم میں ماتمی جلوسوں اور مجالس کی نہ صرف اجازت دی گئی بلکہ ان کی حفاظت کے لئے دستے بھی تعینات کئے گئے۔ ایران کو اب چاہیے کہ وہ افغانستان کے خلاف اختلافات ختم کر کے ایک جائے۔ امریکہ طالبان اور ایران کا مشترکہ دشمن ہے۔

اوصاف: پاکستان کا ایٹمی پروگرام محفوظ ہے؟ کہنے والے کہتے ہیں کہ ہماری ایٹمی تنصیبات پر امریکی آکر بیٹھ گئے ہیں؟ مولانا سمیع الحق: ایٹمی تنصیبات محفوظ ہونی چاہئیں۔ ایٹمی پروگرام کی حفاظت ہمیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اب ایسی خبریں آرہی ہیں امریکہ کہہ رہا ہے کہ ہم آپ کو ایٹمی تنصیبات کی حفاظت کی تربیت دیں گے۔ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ اسرائیل اور امریکہ نے ایک سازش تیار کر رکھی ہے کہ اس حکومت کے جانے پر ہم ایٹمی پروگرام اپنی تحویل میں لے لیں گے۔ یہ تمام خبریں ہمارے ایٹمی پروگرام کے غیر محفوظ ہونے کی نشانیاں ہیں۔ موجودہ حالات میں ہم جب امریکہ کے ساتھ کھڑے ہوں تو ہمیں اس کی دوستی بھی نبھانا پڑے گی ان کی شرائط مانیں گے تو یہ تنصیبات محفوظ نہیں رہیں گی۔ ہم نے حکومت کو بتایا ہے کہ ایٹمی اثاثوں کی حفاظت امریکہ دوستی میں نہیں ہوسکتی۔ ان کو محفوظ رکھنے پر اگر دشمنی ہمارا مقدر رہے تو یہ ہمیں قبول ہے۔ خطرناک اژدھا سے دوستی کے نتائج تو ہمیں بھگتنا پڑیں گے۔ ایٹمی قوت ملکی سلامتی کے لئے ہوتی ہے اور اگر یہ اثاثے ہی محفوظ نہ رہے تو پھر بقا اور سلامتی کیسی؟ ایٹمی قوت کے ہوتے ہوئے اگر ہم کمزور ہیں تو ایسے ایٹم بم کا ہم کیا اچار ڈالیں گے؟ یہ کوئی کھانے کی چیز تو نہیں ہے۔ ایٹمی تنصیبات کو بہر حال خطرات لاحق ہوگئے ہیں۔

اوصاف: اسامہ کے پاس ایٹم بم ہے؟ مولانا سمیع الحق: میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اگر کفار کے پاس ایٹم بم ہے تو ہمارے پاس کیوں نہیں ہونا چاہیے اس میں اچنبے کی بات کیا ہے؟ امریکہ اگر ہمیں ختم کرنے کے لئے ایٹم بم استعمال کرتا ہے تو کیا ہم خود کو بچانے کا حق نہیں رکھتے؟ ہمارا ایٹم بم کیوں اسلامی ہے؟ ہندوؤں' امریکیوں' یہودیوں' چینیوں اور روسیوں کے پاس بھی تو ایٹم بم ہیں۔ ان کو مذہبی نام کیوں نہیں دیئے جاتے؟ ایٹم بم تو حفاظت کی چیز ہے۔ اگر امریکہ کی جھولی میں اس لئے بیٹھ جایا جائے کہ بھارت ہمارے خلاف کاروائی کرے گا تو یہ بات یاد رکھیں ہندوؤں میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ ہماری طرف میلی آنکھ سے دیکھ سکیں۔ انہیں پتا ہے ہمارے پاس ایٹم بم ہے وہ کبھی حملہ نہیں کریں گے۔ امریکہ نے افغانستان میں کیمیائی ہتھیار استعمال کئے ہیں۔ اب وہ اپنی دہشت گردی کے خلاف جاری مہم میں کسی اور ملک کے خلاف بھی یہ ہتھیار استعمال کرسکتا ہے۔ اس کے نزدیک مسلمان انسان ہی نہیں ہیں۔ اپنی حفاظت کے لئے مسلمانوں کو ایٹمی قوت نہ صرف رکھنی چاہیے بلکہ بوقتِ ضرورت استعمال بھی کرنی چاہیے۔ امریکی قوم اس وحشت اور درندگی کے خلاف کیوں اٹھ کھڑی نہیں ہوتی؟ کیا انہیں نظر نہیں آرہا کہ بے گناہ انسان مر رہے ہیں اور پھر وہ اپنے آپکو مہذب قوم بھی کہتے ہیں کیا تہذیب یہی تقاضا کرتی ہے؟ امریکہ پر قیامت ٹوٹے تو انہیں پوری دنیا جہنم نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کا قیمہ کیا جارہا ہے اور وہ ٹس سے مس نہیں ہورہے۔ یہ اب کی بات تو نہیں ہے۔ سالہا سال سے یہ ظلم جاری ہے۔ امریکی یہ سب کچھ اپنے ٹی وی چینلز اور انٹرنیٹ پر دیکھ رہے ہیں ان کی خاموشی اور اپنی حکومت کی مدد کی فراہمی (ٹیکسوں کی صورت میں) سب سے بڑا جرم ہے۔ اس جرم کی سزا انہیں قدرت دے گی۔ عراق میں 80 ہزار بچ

سالانہ امریکی حکومت قتل کر رہی ہے۔ اعداد و شمار یہ ہیں کہ افغانستان میں بھی ایک لاکھ بچے آئندہ چند دنوں میں مر جائیں گے۔ ان معصوم پھولوں کی موت امریکی عوام کے دلوں میں کیوں لرزہ طاری نہیں کرتی؟ دیکھا جائے تو اصل میں تشدد پسند امریکی عوام ہیں۔ وہ ظلم اور بربریت کو پسند کرتے ہیں۔ کیا ایسی قوم کو سزا نہیں ملنی چاہیے؟ فلسطین میں ماؤں کی گود میں بچوں کو گولیوں سے اڑا دیا جاتا ہے۔ اپنا حق مانگنے والوں پر ٹینک چڑھا دیے جاتے ہیں اور امریکی قوم انہیں مالی مدد فراہم کرتی ہے۔ کشمیر میں بھارت معصوم لوگوں کو قتل کر رہا ہے اور قاتل بھارت امریکہ کا بہترین دوست ہے۔ ہم امریکی قوم کے خلاف چارج شیٹ پیش کرتے ہیں۔ امریکی یا تو اپنی حکومت کو ٹیکس دینا بند کر دیں اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں یا پھر نتائج بھگتنے کو تیار رہیں۔

اوصاف: حکمرانوں کا کہنا ہے کہ ہم نے افغانستان کے خلاف امریکہ کا ساتھ دے کر پاکستان اور تحریک آزادی کشمیر کو بچا لیا۔ کیا کشمیر کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا؟ مولانا سمیع الحق: کشمیر تو ہمارے ہاتھ سے گیا۔ انہوں نے اس جنگ کا نام "دہشت گردی" رکھا ہوا ہے۔ یہ لفظ بہت وسیع المعنی ہے۔ "دہشت گردی" کی تعریف بھی وہی کریں گے۔ جس میں ان کا مفاد ہو۔ کہاں دہشت گردی ہو رہی ہے' کہاں دہشت گردی نہیں ہو رہی۔ اس میں تمیز کرنا بھی ان کا کام ہے وہ جو مرضی کریں دہشت گردی نہیں' مسلمان اگر کہ اپنے دفاع کے لئے ہاتھ بھی ہلائیں تو وہ دہشت گردی ہے۔ چیخنا' چلانا اور اپنا حق مانگنا اسی زمرے میں آئے گا۔ "الرشید ٹرسٹ" افغانوں کو روٹی مہیا کرے' مدرسے لوگوں کو تعلیم دیں یہ سب بھی ان کے نزدیک "دہشت گردی" ہے۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا لا سلسلہ ہوگا اس مہم کی آڑ میں جہاں جہاں بھی مسلمان احتجاج کر رہے ہیں ان پر جنگ مسلط کر دی جائے گی۔ کشمیر میں مسلمان مزاحمت کر رہے ہیں کافروں کی دہشت گردی کے خلاف لیکن عتاب کا نشانہ مظلوم ہی بنیں گے۔ اس لحاظ سے کشمیر تو گیا۔ وہاں کی جہادی تنظیموں کے خلاف کاروائی ہوگی۔ سات لاکھ ہندو فوج کشمیریوں کے سینے پہ بیٹھی ہوئی ہے وہ "دہشت گردی" نہیں۔ کولن پاول نے بھارت میں بیان دیا تھا کہ واشنگٹن سے سری نگر تک "دہشت گردی" کے خلاف جنگ لڑیں گے۔ اس کا سیدھا سا مطلب ہے کہ وہ جہادی تنظیموں کو ملیامیٹ کر دیں گے۔ کشمیری عوام کو آزادی کے لئے جدوجہد کی بھی اجازت نہیں۔ وہ افغانستان کے بعد ایک ایک کر کے سب پر ہاتھ ڈالیں گے۔ ہندو کو انہوں نے کہا کہ چند دن خاموش رہیں۔

اوصاف: "دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک" میں دنیا کے کن کن علاقوں سے لوگ حصول تعلیم کیلئے آتے ہیں؟

مولانا سمیع الحق: بنیادی طور پر تو پاکستان اور افغانستان کے مسلمان تعلیم حاصل کرتے ہیں ان دونوں ممالک کی سرحدیں باہم ملی ہوئی ہیں اور افغانستان میں تعلیم کا کوئی نظام بھی نہیں ان کو یہ ادارہ قریب ترین پڑتا ہے۔ وہاں کے کئی علما میرے والد صاحب مرحوم کے شاگرد تھے۔ افغانستان کے سرکردہ علما کی اکثریت نے اسی دار العلوم سے علم حاصل کیا۔ اکا دکا دوسرے ممالک سے بھی آتے ہیں عرب ممالک اور وسطی ایشیائی ریاستوں سے۔ امریکہ

نے اسے بہت بڑا "وار سکول" قرار دے رکھا ہے۔ یورپین اس دار العلوم کو بار بار دیکھنے آتے ہیں۔ ہمیں کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ انہیں دار العلوم نہ دیکھنے دیا کریں۔ میں نے کہا ہم ایک کھلی کتاب ہیں یہ آئیں اور دیکھیں یہاں قرآن پاک اور سنت کی تعلیم دی جاتی ہے یہاں جنگی تربیت نہیں دی جاتی' کوئی طالب علم چاقو تک نہیں رکھتا۔ برطانوی صحافی "رابرٹ فسک" نے اپنے اخبار "انڈیپنڈنٹ" میں میرا بوا عجیب نقشہ کھینچا' دار العلوم کو "وار سکول" قرار دیا۔ اخبار میں ایک نقشہ دیا گیا جس میں "دار العلوم" کو تیر کے نشانات کے ذریعے تل ابیب' چیچنیا اور کشمیر سے ملایا گیا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس جنگی سکول سے فلسطین' چیچنیا اور کشمیر میں گوریلا جنگ لڑی جا رہی ہے۔ یہ لوگ اسلام کی تعریف Terrorism کر رہے ہیں۔ یہاں قرآن پاک' حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہم اسلام کا جذبہ جہاد و حمیت پھیلاتے ہیں اصل خطرہ انہیں ہمارے نصاب سے ہے۔ آج کالج' یونیورسٹیوں میں اسلامی نصاب رائج کر دیا جائے تو وہ اسے بھی "دہشت گردی' قرار دیں گے۔ وہ نصاب سے جہاد کی آیات خارج کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہاں سے ہم کہیں بھی خود سے طلبا کو نہیں بھیجتے۔ فارغ ہونے کے بعد اپنی مرضی سے جہاں جانا چاہتے ہیں' چلے جاتے ہیں۔ افغانستان پر عذاب آیا تو یہاں سے فارغ التحصیل طلبہ اٹھے انہوں نے تو اٹھنا ہی تھا۔ یورپی اقوام سے میں کہتا ہوں کہ آپ پر آج کوئی عذاب آجائے تو کیا وہاں کے لوگ نہیں اٹھیں گے؟ ہر کسی کو اپنی قوم کو بچانے کا حق حاصل ہے۔

اوصاف: یورپ والے "دار العلوم" سے سنکیانگ کی طرف بھی ایک تیر کھینچتے ہیں؟

مولانا سمیع الحق: آپ نے بہت اہم بات کی۔ انہوں نے بڑی کوشش کی کہ سنکیانگ کے معاملے پر مسلمانوں کو چین کے ساتھ لڑا دیا جائے۔ انہوں نے خود کئی تنظیمیں پیدا کیں کہ وہاں جا کر گڑبڑ پیدا کریں ہمارے مجاہدین کو ترغیب دی گئی وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان' چین اور ایران آپس میں متصادم ہو جائیں۔ الحمد للہ ہم نے یہ کوششیں کامیاب نہ ہونے دیں' طالبان نے خاص طور۔ انہوں نے سوچا کہ ہمیں کیا پڑی ہے وہ عہد کئے ہوئے ہیں کہ کسی ملک کی طرف توسیع پسندانہ نظروں سے نہ دیکھیں گے۔ تاجکستان' ازبکستان اور چین' کسی بھی جگہ تو انہوں نے مخالفت نہ کی' وہ تو اپنے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ سنکیانگ میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے اور وہاں جو بہت مظالم ہوئے ہیں وسط ایشیاء میں بھی مسلمان بیدار ہو رہے ہیں۔ کسی کو وہاں ابھارنے کی ضرورت نہیں۔

اوصاف: کہا جاتا ہے کہ طالبان نے بہت جلد اپنی پالیسیوں سے دنیا کو اپنا مخالف بنا لیا۔ ایران کے ساتھ محاذ آرائی' مجسموں کو توڑنا اور پھر پاکستان میں بھی ان کے حوالے سے بڑے خدشات پیدا ہوئے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

مولانا سمیع الحق: انہوں نے محاذ آرائی نہیں کی وہ ایران کا ساتھ بھی دوستی کا ہاتھ بڑھاتے رہے۔ ان سے یہی توقع رکھتے رہے کہ وہ ہماری مدد کریں۔ ہم سے نہ لڑیں۔ ہمارا اندرونی مسئلہ ہے اسے سنبھالنے میں مدد فراہم کریں۔ ہم ایران میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتے تو ایران کو کیا تکلیف ہے۔ ہم اس سرزمین سے پیدا ہوئے

اور اسے امن کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں۔ پاکستان کا تو احسان مند رہے گا۔ وہ آج تک جو کچھ کرتے رہے کراچی میں قونصل خانہ بند کیا گیا لیکن طالبان نے کہا کہ پاکستان نے ہماری حفاظت کیلئے بند کیا ہے۔ سنٹرل ایشیاء کا حکمرانوں کیلئے مسئلہ یہ ہے کہ وہ ساری اسلامی ریاستیں ہیں۔ ہندوستان میں اسلام وہاں سے آیا۔ ہمارا سارا کلچر' تمام بڑے مشائخ الحدیث انہیں علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ امام بخاری 'امام ترمذی 'امام ابو داؤد 'امام مسلم' بخاری فقہ طب 'فلسفہ سارے علوم وہاں سے آئے ہیں۔ ان عظیم نشانیوں کو انہوں نے مٹا دیا تھا مسلمان مسلمان ہوتے ہیں اب انکے تسلط سے نکلے ہیں وہ خود اسلام کی طرف لوٹ رہے ہیں انہیں خدشہ ہے کہ اگر دین اسلام افغانستان میں نافذ رہے اور یہ لوگ قدم جما گئے تو پورے خطے پر اس کے اثرات پڑینگے۔ دعوت اور نظریہ کو روکنا تو کسی ملک کے بس میں نہیں ہے۔ اسلام کی روشنی تو چاروں طرف پہنچے گی۔ وہ اس چراغ کو بجھا دینا چاہتے ہیں اب ایسا نہیں ہوگا۔ نشاۃ ثانیہ ہوگی۔ لوصاف : کہا جاتا ہے کہ طالبان کی پالیسیوں میں لچک نہیں۔ آپکا کیا خیال ہے؟

مولانا سمیع الحق : ان کی پالیسیوں میں بہت زیادہ لچک ہے جب تک صریحاً زیادتی نہ ہو تو کسی کو نہیں پکڑتے جن صحافیوں کو پکڑا وہ ایجنٹ تھے پھر بھی انہیں چھوڑ دیا گیا۔ عیسائیت پھیلانے والوں کو پکڑا۔ اسلام کسی اور مذہب کی تبلیغ کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ ہماری بھوک اور افلاس سے فائدہ اٹھا کر ہمارے ایمان پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ گھناؤنی اور گری ہوئی حرکت ہے انہیں روٹی دو اور ان کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کرو۔ ان مبلغین کو اپنا مقدمہ لڑنے کا پورا حق دیا گیا تھا۔ اب فیصلہ کرنے والے تھے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ انہیں چھوڑنے والے تھے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ انہیں چھوڑنے والے تھے (یہ انٹرویو عیسائی مبلغین کی رہائی سے پہلے کیا گیا تھا) ارتداد پھیلانے والوں کو اسلامی تعزیرات کے حوالے سے سزا دی جاتی ہے۔ ان کی سزا موت نہیں ہے اگر مسلمان اپنا مذہب چھوڑ دے تو اسے قتل کرنے کا حکم ہے وہ انہیں ڈرا دھمکا کر چھوڑ دیں گے۔ ہم تبلیغ کرتے ہیں امریکہ اور برطانیہ چاہیں تو ہم ان کے ملکوں میں نہیں کریں گے۔

اوصاف : اسلام جنگ میں بچوں 'بوڑھوں اور عورتوں کی جان کو تحفظ دینے کا حکم دیتا ہے۔ اسامہ بن لادن نے اپنے کچھ انٹرویوز میں گیارہ ستمبر کے واقعے کی حمایت کی ہے تو آپ کیا کہتے ہیں؟

مولانا سمیع الحق : یہ بہت حساس مسئلہ ہے۔ ہم حالت جنگ میں ہیں عالم کفر کے ساتھ ہم جنگ میں ہیں۔ گیارہ ستمبر سے پہلے ہی انہوں نے ہمارے خلاف جنگ شروع کر رکھی ہے۔ کشمیر 'چیچنیا' بوسنیا اور فلسطین میں وہ اسرائیل کی پشت پر ہے' چیچنیا میں روس مار رہا ہے لیکن اسے امریکہ کی شاباش حاصل ہے انہوں نے اس حوالے سے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے گیارہ ستمبر کو ایک واقعہ ہوا صحیح طرح سے معلوم بھی نہیں کہ کس نے یہ کیا ہے۔ میرا اب بھی یقین ہے کہ ان کے اندر سے کچھ لوگوں نے کیا ہے۔ یہ ان کی اپنی پلاننگ تھی۔ وہ عالم اسلام کے خلاف جنگ شروع کرنا چاہتا تھا۔ اسرائیل کا مسجد اقصیٰ پر قبضہ کرنے کا جو منصوبہ ہے امریکہ نے اس سے نظر

ہٹا کر اس کی مدد کی۔ جنگ میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ پشتو میں کہا جاتا "جنگ میں گڑ نہیں بانٹا جاتا" جنگ کی حالت میں یہ تمیز نہیں ہو سکتی کہ کون گناہگار ہے اور کون معصوم۔ اس حوالے سے یہ حکم ہے کہ "دار الحرب" سے مسلمان نکل جائیں۔ یورپ اور امریکہ کے مسلمانوں کو بھی اس "دار الحرب" میں نہیں رہنا چاہیے۔ کیونکہ ہماری انکے ساتھ کئی سالوں سے جنگ جاری ہے اگر مسلمان وہاں خود کو محفوظ محسوس نہیں کرتے تو ہجرت کر جائیں۔

اوصاف: آپ نے کہا کہ جنگ میں بے گناہ بھی مارے جاتے ہیں۔ امریکہ میں بے گناہ مسلمانوں کو گیارہ ستمبر کے بعد مارا جا رہا ہے تو کیا امریکہ بھی ایسا کرنے میں حق جانب ہے؟

مولانا سمیع الحق: امریکہ نے خود مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ شروع کرنے کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ یہ اسلام و کفر کی جنگ کا آغاز ہے۔ افغانستان میں ہزاروں لوگ مر رہے ہیں اور ہجرت کر رہے ہیں لیکن اس کا علاج تو ہمارے پاس نہیں ہے وہ تو بے گناہ تارکین وطن کو نشانہ بنانے کے لئے کوئی بہانہ تو بنائے گا۔

اوصاف: جنرل پرویز مشرف نے 11 ستمبر کے واقعے کے بعد افغانستان کے حوالے سے جو پالیسی اپنائی اسے انہوں نے وقت کا تقاضا قرار دیا۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

مولانا سمیع الحق: انہوں نے ایٹمی پروگرام بچانے کی بات کی تھی مگر بچ جاتا تو اچھا ہوتا۔ اب تو عملی کاروائی شروع ہو چکی ہے ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ امریکہ دروازہ توڑ رہا ہے اور توڑنے کے بعد اندر داخل ہوگا پھر کوئی چیز نہیں بچے گی تم ڈٹ جاؤ' امریکہ کا ہاتھ پکڑو اور دروازہ توڑنے سے منع کرو اور اس جنگ میں کم از کم شرکت نہ کرو لیکن پرویز مشرف کو ملا کیا؟ ایٹمی صلاحیت پر امریکہ کی نظریں ہیں بجو اس جاری ہیں' ایٹمی پروگرام کو غیر محفوظ قرار دیا جا رہا ہے یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کسی کی معصوم بیٹی کو موضوع سخن بنایا جائے۔ ہمارے ایٹم بم کی عصمت ضروری تھی۔ کولن پاول اور رمز فیلڈ ہمیں ہماری عصمت کی حفاظت کے طریقے بتا رہے ہیں کیا چیز رہ گئی ہماری سالمیت کی جہاد کشمیر کے بارے میں کہتے ہیں کہ دہشت گردی ہے سب سے بڑی بات یہ کی گئی کہ ہمیں اقتصادی امداد ملے گی اور قرضے معاف ہوں گے اس بات کی بھر پور تشہیر کی گئی قرضے کہاں معاف ہوئے؟ ایک ارب ڈالر امداد کا اعلان ہوا۔ پہلے 800 ملین ڈالر کی بات کی گئی شاید پھر کہیں گے کہ وہ بھی اسی میں شامل ہے۔ ایف سولہ کی بات چھیڑنے سے انہوں نے منع کر دیا ہے۔ ایک ارب ڈالر تو ہمارے ایف سولہ کے بنتے ہیں وہ بھی نہیں دیں گے اور ایک ارب ڈالر پر پوری قوم کی سلامتی داؤ پر لگائی جا سکتی ہے؟ فرض کریں کہ دنیا میں مسلمان ایک ارب ہیں گویا امت محمدی کے ہر فرد کی قیمت ایک ڈالر لگائی گئی ہے یعنی ایک ارب ڈالر دے دو اور سب کو اپنی غلامی میں لے لو اور پھر باری باری عراق' لیبیا' اور پاکستان نشانہ بنائے جائیں گے۔ جنرل پرویز مشرف نے میری آپ کی ہم سب کی قیمت لگائی ہے وہ بھی ملے گی نہیں ' ابھی وعدہ ہے جو ایفا نہیں ہوگا۔

اوصاف: مولانا صاحب! تو پھر کیا پرویز مشرف نے غداری کی ہے؟

مولانا سمیع الحق : دیکھیں میں یہ نہیں کہتا کہ انہوں نے غداری کی ہے شاید ہمارے درمیان نکتہ نظر کا اختلاف ہے ہم بھی چاہتے ہیں کہ ملک کسی طرح بچ جائے جنرل پرویز مشرف امریکی رعب اور لالچ میں آگئے۔ وہ سمجھے کہ ہمارے اقتصادی مسائل کا حل امریکہ کے ساتھ تعاون میں ہے ان پر امریکی دہشت حاوی ہوگئی کہ وہ سپر پاور ہے، ہمیں ملیامیٹ کر کے رکھ دے گا یہ جنرل صاحب کی غلط فہمی ہو سکتی ہے انہوں نے شاید سوچا ہو گا کہ اس طرح ملک بچ جائے گا ایک اسلامی ملک کے سربراہ مملکت کے طور پر اللہ نے انہیں عزت دی ہے تخت پر بٹھایا ہے انہیں ناشکری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم نے بروقت کہا کہ انہیں امریکی رعب میں نہیں آنا چاہیے تھا یہ یقین اور ایمان رکھتے کہ سپر پاور اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وہی ہمیں بچا سکتا ہے۔

اوصاف : آپ کو اب بھی جنرل پرویز مشرف سے کوئی امید ہے؟

مولانا سمیع الحق : وہ جھک گئے ہیں' ہیبت میں آگئے ہیں' لالچ میں آگئے ہیں وہ عالمی برادری کے ساتھ کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔ عالمی برادری تو کافروں کی ہے تو کیا وہ ہماری برادری ہے؟ ہماری برادری تو امت محمدیہ ہے' اسلام ہے' افغانستان ہے' کشمیر ہے' فلسطین ہے۔ وہ ہماری برادری نہیں بلکہ ہمارے دشمنوں کا گروپ ہے بدقسمتی سے پرویز مشرف نے اندھے کنویں میں چھلانگ لگائی ہے جتنا ہاتھ پاؤں ماریں گے اور گرتے جائیں گے اور ملک کو بھی ساتھ لے گئے ہیں۔ ملک کے بچاؤ کے لئے بہت بڑی جنگ لڑنا ہوگی۔ یہ جنرل صاحب کے خلاف نہیں بلکہ ملک کے بچاؤ کے لئے ہوگی۔ ہماری جدوجہد سیاسی نہیں ہے لہٰذا اسے سیاسی رنگ نہ دیا جائے ہم تو ملک کی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں ہمارے نزدیک ملک کی سلامتی داؤ پر لگ گئی ہے۔ افغانستان کی بربادی پاکستان کی بربادی ہے۔ پاکستان و افغانستان کا دفاع ایک دوسرے سے وابستہ ہے' تقدیر وابستہ ہے۔

اوصاف : کیا آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف کی نیت ٹھیک تھی؟

مولانا سمیع الحق : نیت کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن کام غلط تھا غلط ہے اور ملک کے لئے تباہ کن ہے اللہ کرے کہ یہ بات ان کی سمجھ میں آجائے ان کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ واپس آجائیں۔

روزنامہ جنگ کے سوالات

جنگ : اسلام کے ابتدائی زمانے میں جنگ کے جو اصول وضع کئے گئے تھے ان میں عورتوں' بچوں اور معصوم شہریوں کے قتل سے گریز کا کہا گیا تھا ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بھی بے گناہ لوگ مارے گئے آپ اسے دہشت گردی کہیں گے یا جہاد؟ مولانا سمیع الحق : کسی ملک کے ساتھ حالت جنگ نہ ہو تو پھر کسی کو سوئی چبھونے کی بھی اجازت نہیں ہے اسلام کے معنی سلامتی کا دین ہے۔ یہ نقشہ عام حالات کا ہے لیکن آج کے حالات میں پورا عالم اسلام دہشت گردی کا شکار ہے عراق کا حال دیکھیں وہاں بچے مر رہے ہیں کشمیر اور فلسطین میں کھلے عام دہشت گردی ہو رہی ہے اور مسلمانوں کو اعلانیہ جنگ میں ڈال دیا ہے ایسی صورتحال میں رد عمل میں مجبوراً سب

کچھ جائز ہے اگر امریکہ دار الحرب ہے تو پھر وہاں جو مسلمان رہتے ہیں انکو خود ان حالات کا خیال کرنا چاہیے اور اپنی جان و مال کی خود حفاظت کرنی چاہیے اب جیسا افغانستان کے حالات ہیں تو ہم تو یہ نہیں دیکھتا کہ وہ کس پر گرتا ہے

جنگ : آپ امریکہ کو دار الحرب قرار دے رہے ہیں تو کیا وہاں سے مسلمانوں کو ہجرت کرنی چاہیے ؟

مولانا سمیع الحق : اب جب عملاً جنگ جاری ہے تو جوابی رد عمل سے کسی کو روکا تو نہیں جا سکتا اگر مسلمان اپنی حفاظت کیلئے ضروری سمجھتے ہیں تو امریکا سے ہجرت کریں یا پھر اپنی حفاظت خود کریں 'فقہا اس کی مثال ایسے دیتے ہیں کہ ایک بار میدان جنگ میں کافروں کو مارا جا رہا تھا تو ایک کافر مسلمان کے سینے سے چمٹ گیا اب یہاں پر اسلام کہتا ہے کہ ہماری مجبوری اور بے کسی ہے کہ اس کافر کو مارنا ہے' چاہے مسلمان کو ہی مارنا پڑے گولی چلانی پڑے گی البتہ اس صورت میں مسلمان کی موت کو شہید تصور کیا جائے گا۔

جنگ : کیا ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ دہشت گردی تھی یا نہیں ؟

مولانا سمیع الحق : اگر یہ دہشت گردی تھی تو امریکا کو اس کے عوامل تلاش کرنے چاہئیں۔ دیکھیں یہ دہشت گردی ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا آدھے گھنٹے کے اندر ہی اسامہ بن لادن کو ملزم بنا دیا گیا۔ یہ دہشت گردی امریکا اور یہودیوں نے خود کی ہے۔ جنگ : اس وقت حکومت کا کہنا ہے کہ "سب سے پہلے پاکستان" جس کا مطلب یہ ہے کہ قومی مفاد کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے' ہر اسلامی ملک کے ملی مفادات بھی ہیں مصر کے' ایران کے' سعودی عرب کے' اپنے اپنے مفادات ہیں تو پاکستان اپنے قومی مفاد کا خیال کیوں نہ رکھے ؟

مولانا سمیع الحق : قومی مفاد تو ایک وسیع المعانی لفظ بن چکا ہے کہ جمہوری حکومت ختم کرنا ہے تو قومی مفاد کا نام دیا جاتا ہے' کرپشن کے نام پر لوگوں کو پکڑا جاتا ہے تو قومی مفاد کے نام دے دیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو جہاد میں بٹھا کر بیرون ملک بھیجا جاتا ہے تو اسے بھی وسیع تر قومی مفاد کا نام دیا جاتا ہے۔ حب الوطنی کے ہم سب قائل ہیں پاکستان کو بچانا ہم عین عبادت سمجھتے ہیں پاکستان ایک اسلامی نظریے کی بنیاد پر بنا ہے ہم کہتے ہیں کہ سب سے پہلے پاکستان نہیں سب سے پہلے وہ نظریہ ہے جس کی بنیاد پر پاکستان بنا تھا تو ہماری نظر میں سب سے پہلے اس نظریے کو بچانا ضروری ہے ہم سمجھتے ہیں کہ حکومت کی موجودہ پالیسی سے ہماری دفاعی صلاحیت اور معاشی حیثیت امریکہ کے قبضے میں چلی جائے گی۔ ہمیں بنا بنایا انہیں نہیں دینا چاہیے تھا جو مصیبت سر پر آن پڑی تھی اس کا استقامت سے مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ امریکہ کی دوستی سے دشمنی بہتر ہے حکومت والے کہتے ہیں کہ ہمیں ایٹم بم کو بچانا تھا۔ اگر مشکل وقت میں یہ ہمارے کام نہیں آئے گا تو کیا ہمیں ایٹم بم کا اچار ڈالنا تھا۔ جنگ : کہا جا رہا ہے کہ جہادی تنظیمیں پاکستان کے مفاد میں نہیں ہیں اور یہ جہاد بالآخر فساد بن گیا۔

مولانا سمیع الحق : کشمیر میں سات لاکھ بھارتی فوج کو جہادی تنظیموں نے ہی روک رکھا ہے میں نے جنرل مشرف کو بھی کہا تھا کہ جہادی تنظیموں کو اللہ کا احسان سمجھو کہ فوج یہاں کھا پی رہی ہے اور وہاں نوجوان جانیں قربان

کر رہے ہیں۔ آپ کا کچھ بھی خرچ نہیں ہو رہا' یہ جہادی تنظیمیں ختم کر کے ہندو فوج کو آزاد کرنے کے مترادف ہو گا دوسری طرف مغربی سرحد افغان جہاد کی وجہ سے محفوظ ہو گئی تھی اور ہم ایک جان دو جسموں کی مانند تھے' امریکا نے ہماری یہ سرحد بھی غیر محفوظ کر دی ہے۔ امریکہ ہمیں چکی کے دو پاٹوں میں پیسنا چاہتا ہے۔ ان کی عقل پر پردہ پڑا ہے یہ اتنی بات بھی سمجھ نہیں رہے' میں ذاتی طور پر جنرل مشرف کو غدار نہیں سمجھتا لیکن ان کی پالیسیوں کو غلط سمجھتا ہوں۔

جنگ : یہ فرمائیں کہ کیا پاکستان کے اندر بھی جہاد جائز ہے؟

مولانا سمیع الحق : پاکستان کے اندر لڑنے کے لئے ہم جمہوری طریقے استعمال کرتے ہیں ہم ہتھیار نہیں اٹھاتے' حکمرانوں کو ہم من مانی بھی نہیں کرنے دیتے' ایوب خان کو ہم نے پر امن جمہوری جدوجہد سے ہٹایا' بھٹو کے ساتھ بھی یہی کیا گیا اب بھی کوئی حکمران ایسا رویہ اپناتا ہے تو اس کے خلاف پر امن تحریک چلنی چاہیے اس ملک کا کوئی بھی جرنیل ہماری تحریک کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جنگ : تو آپ مسلح جدوجہد کی ضرورت نہیں سمجھتے؟

مولانا سمیع الحق : ہم مسلح جدوجہد کی ضرورت نہیں سمجھتے یہ ہماری پر امن تحریک سے ہی چلا جائے گا۔

جنگ : جہاد افغانستان ہو یا جہاد کشمیر اس میں بریلوی اور مکتبہ ء شیعہ فکر کے لوگ کم کیوں ہیں؟

مولانا سمیع الحق : دیوبند کی تاریخ ایسی ہے کہ ہم برائی کے ساتھ کمپرومائز نہیں کرتے خدا کرے کہ دوسرے بھی اس بات کو محسوس کریں میں سمجھتا ہوں کہ بریلوی بھی اس جدوجہد میں ہمارے ساتھ شریک ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی ہر لمحہ ہمارے ساتھ ہیں ان کا کہنا ہے کہ فوج کے اندر سے ہی کوئی صلاح الدین ایوبی نکلے گا پھر مجھے کہا کہ مولانا آپ سمجھ گئے (ہنستے ہوئے) میں نے کہا مولانا آپ نے بہت اعلیٰ بات کی ہے خدا کرے وہ عملی طور پر شریک ہوں (سوچ کرر کتے ہوئے) یہ شریک ہیں بھی بس خدا کسی کو زیادہ توفیق دے دیتا ہے اور کسی کو کم۔

جنگ : آئی ایس آئی نے 20 سال افغان پالیسی چلائی جسمیں آپ بھی شریک کار رہے یہ پالیسی تو مکمل ناکام رہی؟

مولانا سمیع الحق : 20 سال میں افغان پالیسی مکمل طور پر کامیاب رہی ہم نے ایک سپر پاور کو شکست دی تھی پاکستان نے افغانستان میں بڑا موثر کردار ادا کیا' پاکستان نہ ہوتا اور ۱۵ لاکھ افغان جانیں قربان نہ کرتے تو روس ہم سب کو روند چکا ہوتا۔ بلوچستان کا علاقہ بھی روس کے قبضے میں ہوتا اور روس گرم پانیوں تک پہنچ چکا ہوتا اور خلیجی ممالک پر بھی اس کا کنٹرول ہوتا۔ خرابی افغان لیڈروں کی طرف سے آئی۔ پاکستان کا رویہ بہت مثبت رہا۔

جنگ : یہ تو نہیں کہ پاکستان کسی کی زیادہ حمایت کرتا ہو؟ مولانا سمیع الحق : نہیں! پاکستان نے پوری کوشش کی کہ افغانستان میں امن اور صلح قائم ہو لیکن یہ سات آٹھ گروپوں میں بٹے ہوئے تھے' طالبان میں خوبی یہ ہے کہ ان میں گروپ نہیں ہیں وہاں پر بس ایک ہی امیر المومنین ہے کوئی اپوزیشن نہیں ہے۔

جنگ : یعنی جمہوریت نہیں ہونی چاہیے؟ مولانا سمیع الحق : جمہوریت میں تو ہر ایرا غیرا اٹھ کر بات

کرتا ہے۔ یہ شیطانی جمہوریت ہے وہاں سارے فیصلے مشاورت سے ہوتے ہیں۔

جنگ : مہاتما بدھ کے مجسمے کو گرانا کیا درست تھا؟ مولانا سمیع الحق : وہ تو اسلئے گرائے گئے کہ ۷۰، ۷۰ بچے کیمپوں میں مر رہے تھے تو طالبان نے کہا کہ ان پتھروں کو مارو دیکھو ان کی چیخ نکلتی ہے یا نہیں' بے جان پتھروں پر تو چیخ نکلتی ہے اور جاندار چوں کے مرنے پر آواز تک نہیں نکلتی۔ افغانستان کے ہندو اور سکھ قسم کھا کے کہتے ہیں کہ ہم اب اطمینان سے سوتے ہیں۔ جنگ : جہاد کشمیر کے حوالے سے کہا جا رہا ہے کہ وہاں پر افغانستان جیسے حالات ہیں وہاں پر بھی کوئی متحدہ قیادت نہیں ہے خدشہ ہے کہ وہاں پر افغانستان کی طرح کی انار کی نہ پھیل جائے۔ مولانا سمیع الحق : ہمیں ابھی سے اس پر نظر رکھنی چاہیے۔ ہمیں بھی یہ پریشانی ہے کہ جتنے گروپ زیادہ بنیں گے اتنی ہی پیچیدگیاں بڑھیں گی۔ ایک افغان لیڈر عبدالرب رسول سیاف نے مجھے کہا کہ کشمیری لیڈروں کو لینڈ کروزر میں نہ بیٹھنے دینا کیونکہ اگر یہ ایک بار گاڑی میں بیٹھ گئے تو پھر کبھی اس سے نہیں اتریں گے۔ افغانستان کے سات لیڈر اپنے آپ کو شہنشاہ سمجھتے تھے۔ حکومت کو ابھی سے ان کو متحد کرنا چاہیے لیکن اس ڈر سے کہ انار کی پھیلے گی جہاد کو ختم تو نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے ضیاء الحق مرحوم سے بھی کہا تھا کہ گروپوں کو کم کرو اسوقت انار کی کو روکا جا سکتا ہے۔ جنگ : اخبارات میں کہا جا رہا ہے کہ پاکستان کی افغان پالیسی اس قدر خراب تھی کہ طالبان کے بعد پورے افغانستان میں ہمارا کوئی دوست نہیں ہو گا؟

مولانا سمیع الحق : طالبان کے علاوہ پہلے بھی ہمارا کوئی دوست نہیں تھا' درمیان میں جو افغان حکومت آئی تھی اس نے ہمارے سفارتخانوں پر حملے کئے تھے۔ ربانی' احمد شاہ مسعود اور دوستم نے کیا کچھ نہیں کیا؟ ظاہر شاہ نے پختونستان کا مسئلہ کھڑا کیا' شمالی اتحاد کی حکومت آئی تو وہ پاکستان مخالف ہی ہو گی۔

جنگ : جدید دنیا سے روشناس لوگوں کو ڈر ہے کہ مولانا سمیع الحق اور طالبان ہمیں غاروں کی دنیا میں واپس بھیجنا چاہتے ہیں؟ مولانا سمیع الحق : اسلام ترقی کا دین ہے۔ اسلام سائنس ٹیکنالوجی' کمپیوٹر اور ہوائی جہاز وغیرہ کا حامی ہے یہ سب چیزیں مسلمانوں نے دنیا میں روشناس کرائیں مغرب کو پتھروں کی دنیا سے اسلام نے نکالا۔ یونیورسٹیاں ان کو اسلام نے دی ہیں سرجری بھی اسلام نے دی ہے۔ اسلام کیسے ان چیزوں کی مخالفت کر سکتا ہے۔ جنگ : کہا جاتا ہے کہ جس بات پر بھارت ناراض ہو لازمی طور پر وہ بات پاکستان کے حق میں ہوتی ہے امریکا کی حمایت کے فیصلے سے بھارت بہت پریشان ہے۔

مولانا سمیع الحق : انڈیا ناراض تو نہیں ہے امریکا اور بھارت نورا کشتی لڑ رہے ہیں بھارت نے امریکا سے کہا ہے کہ افغانستان اور پاکستان کو لڑا دو افغانستان میں امریکی گماشتے بیٹھ جائیں گے۔ ہماری مغربی سرحد ختم ہو جائے گی۔ سارا کام تو بھارت کی منصوبہ بندی کے مطابق ہو رہا ہے۔

جنگ : مولانا! پاکستان کی اہمیت میں تو اضافہ ہوا' ہمیں اقتصادی فوائد حاصل کرنے چاہئیں؟

مولانا سمیع الحق : کوئی اقتصادی فائدہ حاصل نہیں ہوا پاکستان کو تو اجرتی قاتل بنا دیا گیا ہے جب تک اس کی ضرورت ہوگی اسے استعمال کیا جائے گا پورا عالم اسلام اور امت مسلمہ پاکستان سے ناراض ہے۔

جنگ : ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ پشتون سیاست کے گرد گھوم رہا ہے۔ قاضی حسین احمد، فضل الرحمان، سمیع الحق اور نوابزادہ نصر اللہ سب پشتون ہیں پنجابیوں کو بھی مروانا چاہتے ہیں۔

مولانا سمیع الحق : دیکھیں پشتونوں نے ہمیشہ آزادی، غیرت اور ملی حمیت کا زیادہ احساس کیا ہے۔ آفاق احمد بھی، پنجابی ہیں سب لوگ شریک ہیں اسے پشتون مسئلہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ پاکستان کی آزادی اور بقا کا مسئلہ ہے۔

جنگ : کیا اس ساری صورتحال میں پاکستان میں جمہوریت کی منزل دور نہیں ہو جائے گی۔

مولانا سمیع الحق : جنرل مشرف کے روڈ میپ سے جو جمہوریت آئیگی اس سے تو جمہوریت کا نہ آنا بہتر ہے۔

جنگ : کہا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی کو آپ کی قیادت پر تحفظات ہیں؟

مولانا سمیع الحق : ہمارے سامنے تو کسی نے کچھ نہیں کہا بلکہ قاضی صاحب اور سب نے مل کر مجھے دفاع پاکستان وافغانستان کونسل کا چیئرمین بنایا تھا کسی نے کہا کہ جماعت اسلامی سولو فلائٹ پر یقین رکھتی ہے اور وہ کسی اتحاد میں تبھی شامل ہوتی ہے جب سب کچھ جماعت اسلامی کے ہاتھ میں ہو۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی متبادل تجویز آتی ہے، کوئی سپریم کونسل بناتا ہے تو میں اس کیلئے تیار ہوں، ہمارے اندر کوئی جھگڑا نہیں ہے لیکن کسی شخص نے کہا کہ قاضی صاحب خوش نہیں ہیں تو میں نے متبادل تجویز دی تھی۔ جنگ : آپ افغانستان کی جنگ کا کیا مستقبل دیکھتے ہیں؟ مولانا سمیع الحق : افغانستان کی جنگ سے امریکا کا زوال ہوگا یہ شہداء کے لئے جنت اور امریکا کے لئے جہنم ہے یہ امریکا کا آخری ظلم اور جبر ہوگا۔ جنگ : بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ افغانستان پہلی دیوبندی ریاست ہے اسلئے اس سے آپ کی جذباتی وابستگی ہے؟

مولانا سمیع الحق : (جذباتی لہجے میں) خدا کی قسم! اگر یہ بریلوی ریاست ہوتی تو تب بھی میں اس کا ساتھ دیتا میرے ذہن میں یہ خیال تک بھی نہیں آیا اگر اسلامی ریاست ہو تو ہم اسکے دفاع کیلئے ضرور اٹھ کھڑے ہوتے۔

جنگ : سعودی عرب اور لیبیا یا دوسرے اسلامی ممالک کے مقابلے میں کیا آپ افغانستان کو بہتر اسلامی ملک تصور کرتے ہیں؟ مولانا سمیع الحق : جن حالات میں انہوں نے اسلامی قوانین کو نافذ کیا ہے اور مرکزیت قائم کی ہے اس میں، میں انہیں بہتر سمجھتا ہوں۔

جنگ : بعض لوگ کہتے ہیں کہ طالبان کو امریکی پیسے سے آئی ایس آئی نے بنایا۔

مولانا سمیع الحق : یہ غلط پروپیگنڈہ ہے۔ ۳۰، ۴۰ لوگ ظلم اور بربریت کے خلاف اٹھے کمانڈر ظلم کر رہے تھے ایک کم بخت نے لڑکے کے ساتھ شادی کی اور ٹینک پر بٹھا کر برات قندھار سے لے کر آیا اس پر طالبان نے کہا کہ یہ تو ظلم کی حد ہے۔ جنگ : اگر آپ صدر پاکستان ہوتے تو آپ کیا کرتے؟

مولانا سمیع الحق : امریکا کے سامنے ڈٹ جاتا۔ جنگ : اگر ایٹم بم چلانا پڑتا تو وہ بھی چلا دیتے؟

مولانا سمیع الحق : ایٹم بم کھانے کے لئے تو نہیں بنایا یہی تو مغرب کو تکلیف ہے کہ ان کو ضرورت پڑی تو یہ ضرور چلائیں گے۔ جنگ : فوج میں حالیہ تبدیلیوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

مولانا سمیع الحق : امریکا اور جنرل صاحب نے یہ تبدیلیاں کر کے اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ کوئی ان کی پالیسی سے سر موانحراف نہ کرے۔ وگرنہ تبدیلیوں سے دو تین دن پہلے یہ جرنیل افغانستان کے بارے میں بڑے متحرک تھے وہاں وفود بھیج رہے تھے۔

سی بی ایس کے سوالات

س۔ کیا آپ یہاں اسلام کو پھیلانے کی تعلیم دے رہے ہیں؟

ج۔ ہم اسلام سیکھتے بھی ہیں اور دنیا کو سکھانا بھی چاہتے ہیں ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام ساری بنی نوع انسانیت کیلئے رحمت فلاح اور بھلائی کا دین ہے امن کا پیغام قرآن نے اسلام کو عربوں کے ساتھ یا کسی خاص نسل کے ساتھ مخصوص نہیں کیا۔ جہاں بھی خدا مخاطب کرتا ہے کسی آیت میں تو ایہا الناس کہتا ہے تو ہمارا عقیدہ ہے کہ دعوت اور پیغام پوری بنی نوع انسانیت کیلئے ہے تو اس تک پہنچ جائے اور جب پوری بنی نوع انسانی اس پیغام کو سمجھ لے گی اور اس پر جمع ہو جائے گی تو ساری دنیا امن اور سلامتی کا گہوارہ بن جائے گی رنگ و نسل اور علاقوں کی ساری تفریقیں ختم ہو جائیں گے۔ ہمارے پیغمبر نے فرمایا ہے کہ سارے انسان اللہ تعالیٰ کا ایک کنبہ ہے الخلق عیال لله فی الارض ایک فیملی کی طرح ہم سارے بنی نوع انسان ہیں۔

س۔ کیا آپ خود کو ملیٹرین (جنگی) سمجھتے ہیں؟

ج۔ اسلام میں جنگ کا مفہوم نہیں ہے اسلام کا معنی ہے سلامتی دینا۔ اسی طرح ایمان ہے کہ ایمان والوں کو مومن کہتے ہیں تو ایمان امن سے نکلا ہے۔ امن دینے والا۔ peace اور اسلام بھی سلامتی سے نکلا ہے یعنی اس کے زبان سے ہاتھ سے ہر قسم کے ضرر سے ہر انسان اپنے آپ کو محفوظ سمجھے گا۔ ہمارے پیغمبر محمد ﷺ نے فرمایا ہے کہ مومن وہ ہے جس سے ساری بنی نوع انسانیت اپنے آپ کو محفوظ سمجھے کہ المومن من امنه الناس علی دمائهم واموالهم کہ میرا خون' میرا مال' میری عزت و آبرو محفوظ رہے گی۔ جنگ کی حالت اس وقت آتی ہے جب کوئی مسلمانوں کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتے اس کی آزادی کو اس کے قومی سالمیت کو ختم کرنا چاہے اب جب ہم اپنے فریڈم کے لئے اٹھتے ہیں تو وہ ہمارا قومی فریضہ ہوتا ہے۔ افغانستان میں جنگ ہوئی تو یہ مسلمانوں نے نہیں کی یہ سوویت یونین نے ان پر مسلط کیا اور پورے برصغیر میں جو ہماری جدوجہد ہوئی آزادی کی وہ انگریز نے آکر ہم پر قبضہ جمانے کی وجہ سے ہوئی میں آپ کو پچھلی ایک صدی کی مثال دیتا ہوں کہ کسی مسلمان ملک ایک انچ پر بھی جارحیت نہیں کی صرف یہ جدوجہد کر رہے ہیں کہ ہم آزاد رہیں۔

س۔ آپ ایک مذہبی جماعت کے رہنما کے طور پر سیاست میں حصہ لیں گے ؟

ج۔ ہم تو ہر وقت سیاست میں ہیں ہماری سیاست عبادت ہے یعنی سیاست کو ہم عبادت سمجھتے ہیں یہ ہماری سیاست خود ایک جہاد ہے جس چیز سے لوگ ڈرتے ہیں جہاد تو اس کا معنی یہ ہے کہ خرابیوں کے اصلاح کے لئے کوششیں ظلم کے خلاف کرپشن کے خلاف برائیوں کے خلاف جنگ کرنا جہاد کا مفہوم اور لغت جو ہے جہد سے ہے۔ جدوجہد مفہوم اس کا یہ ہے ہماری سیاست یہ ہے کہ ہر وقت ہم جدوجہد میں لگے ہوں گے۔

س۔ واشنگٹن میں لوگوں کو خدشہ ہے کہ پاکستان اب نیوکلیئر طاقت بن چکا ہے تو خدشہ ہے کہ اگر یہاں کچھ تبدیلی آئی تو جو نیوکلیئر صلاحیتیں ہیں وہ مذہبی رہنماؤں کے ہاتھ میں چلی جائینگی اور اس سے بڑی گڑبڑ ہو جائیگی

ج۔ آپ ان سے کہیے کہ جب انڈیا کے ہاتھ میں نیوکلیئر پاور تھا وہاں انتہائی بدترین قسم کے سیاسی لوگ جو مذہب کے علمبردار تھے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ بی جے پی واجپائی کی حکومت انتہاپسندانہ بنیاد پرست گورنمنٹ ہے اور اسرائیل جو ہم پر انتہائی ظالمانہ جارحیت کر رہا ہے چین اور روس جو آپ کے خلاف بھی تھا اور ہمارے خلاف بھی مذہب کا بھی دشمن تھا تو آپ کو چین کے ایٹم ہم سے یہ خطرہ نہیں محسوس ہوا اور روس جو کہ کیمونزم کا علمبردار تھا اور وہ سارے مسلمانوں کو ختم کرنا چاہتا تھا آپ کو یہ خطرہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ تشدد میں آکر ہم استعمال کر دے گا اب بھارت میں انتہائی متعصب ہندو اور اسرائیل جیسی متعصب حکومت جو جزیرۃ العرب کے لئے ناسور بنا ہوا ہے اس سے آپ کو یہ خطرہ نہیں ہے تو ہمیں حیرت ہے کہ خطرہ صرف ہم سے کیوں محسوس ہو رہا ہے ہم نے تو کہیں ایٹم ہم نہیں استعمال کیا امریکہ نے خود استعمال کیا۔ ناگاساکی اور ہیروشیما میں ہمیں بہت دکھ ہوا کہ ہم نے اسلامی ہم کی اصطلاح سنی کیونکہ ہم تو نہ مسلمان ہوتا ہے نہ عیسائی۔ تو میرے خیال میں اگر ہمارے ہاتھ میں ہم آجائے گا تو آس پاس سارے اطراف محفوظ ہو جائیں گے اسلام نے بہت بڑی شرائط حدود مقرر کئے ہیں کہ ایک چھری بھی غلط استعمال نہ ہو۔ اگر کوئی چاقو بھی مذاق میں آپ پر لہرائے تو حضور ﷺ نے کہا اس سے ایمان کو خطرہ ہے۔

س۔ اگر بن لادن قتل ہو گیا یا پکڑا گیا تو پاکستان کا کیا ردعمل ہو گا؟

ج۔ اصولی طور پر تو یہ افغانستان کا اندرونی معاملہ ہے لیکن آپ لوگوں نے اسامہ کو اتنا بڑا ہیرو بنا دیا ہے کہ اس وقت پوری امت مسلمہ کے ایک ارب مسلمانوں کو تکلیف ہو گی اور اگر خدانہ کرے اسامہ کو کچھ ہو گیا تو پھر بھی تمام مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھیں گے یونہی دنیا میں امریکی مفادات کو خطرات ہوں گے ہمیں مذہب یہ تعلیم دیتا ہے کہ غیر مسلم اور غیر ملکی لوگ انتہائی محترم ہیں ان کی جان و مال کی حفاظت ہم پر لازم ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ ایک شخص کے جرم میں دوسرا بے گناہ مارا جائے لیکن یہ بات پھر فتوی اور مسئلہ کی نہیں ہو گی کہ جب آگ بھڑک اٹھے تو پھر اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ پھر سیاست آجاتی ہے۔

س۔ اگر اسامہ بن لادن پر حملہ کیا گیا تو امریکہ کے اس خطہ میں پرابلم ختم ہو جائیں گے ؟

ج۔ امریکہ کے اس خطہ میں مسائل بہت زیادہ بڑھ جائیں گے کیونکہ امریکہ کی دشمنی مکمل کر سامنے آجائے گی۔ اسامہ ایک طرح سے حالتِ جنگ میں ہے امریکہ اس کے خلاف بر سر پیکار ہے اسامہ سمجھتا ہے کہ امریکہ نے میرے ملک کو غلام بنا رکھا ہے تو اس حالت میں دشمن سب کچھ کرتا ہے ہم جنگ میں بمباریاں کرتے ہیں پورے شہر کے شہر تباہ ہوتے ہیں ایک دوسرے کے ہزاروں افراد کو قتل کرتے ہیں تو اگر ایسی کوئی حرکت ہو بھی گئی تو وہ جنگ کی حالت تیز ہو جائے گی اب اس کا توڑ یہ ہے کہ جنگ ختم کی جائے جنگ کا علاج یہ نہیں ہے کہ جنگ اور بھڑکائی جائے۔

س۔ امریکہ سمجھتا ہے تو ثابت بھی کرے گا ؟

ج۔ اس طرح تو عالم اسلام کی بہت بڑی اکثریت صاف بات ہے کہ کھل کر امریکہ کو دہشت گرد سمجھتی ہے۔ اسرائیل کے ذریعہ کشمیر کے ذریعہ 'مشرقی تیمور کے ذریعے اور افغانستان عراق 'لیبیاء سوڈان ان سب کے ذریعہ سے امریکہ دہشت گردی کرتا ہے اور یہ تمام ممالک آپ نے ہائی جیک کئے ہیں اور ہم بالکل بے دست وپا ہیں کوئی چینج (تبدیلی) اپنے ملک کے نظام میں ہم نہیں لا سکتے اپنے وسائل ہمارے کنٹرول میں نہیں ہیں تو آپ ایک فرد کو دہشت گرد سمجھتے ہیں اور دنیا پورے امریکہ کو۔

س۔ جیسا کہ آپ نے کہا تو اگر امریکہ اسامہ کی دہشت گردی ثابت کردے تو کیا آپ اسکی حمایت سے دستبردار ہو جائیں گے۔

ج۔ امریکہ ایک فریق ہے اسامہ بھی فریق ہے ہم کہتے ہیں کہ کوئی غیر جانبدار عدالت جو کہ امریکی اثر سے آزاد ہو اور ہم سب کو اطمینان ہو جائے کہ واقعی یہ آزاد ہے اسطرح تو آپکی عدالتوں نے جاتے ہی ایمل کانسی کو سزا سنوا دی یکطرفہ سب کچھ ہوا۔ س۔ آپ اسامہ کو کیسا سمجھتے ہیں ؟

ج۔ ہم اس کو مسلمانوں کا بہت بڑا ہمدرد خیر خواہ اور آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والا ہیرو سمجھتے ہیں۔ آپ ابراھم لنکن کو کیا سمجھتے ہیں۔ اپنی جنگ آزادی لڑنے والوں امریکہ کو بنانے والے کو ہیرو سمجھتے ہیں اسی طرح ایک شخص نے روس کے خلاف جا کر آرام اور راحت سب کچھ قربان کیا فریڈم کیلئے 'کسی ظالم حکومت کو حق نہیں ہے کہ کسی غریب ملک کو گرفت میں لے اگر ایسے لوگوں کے آپ اور ہم سب قدر نہ کریں دنیا کو درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ تو دنیا جہنم بن جائے گی۔

س۔ یہ جو آپ نے کہا کہ اگر امریکہ نے جارحیت کی تو اس کا ردعمل خوفناک ہو گا تو کیسے خوفناک ہو گا ؟

ج۔ سب سے بڑے خوفناک نتائج تو یہ ہیں کہ تقریباً ایک ارب مسلمان اس کشمکش سے نکل جائیں گے کہ امریکہ اچھا ہے یا برا ایک بہت بڑی تعداد یہ سمجھتی ہے کہ امریکہ ہمارے ساتھ نہیں 'ہمارا خیر خواہ نہیں ہے اور

کچھ لوگ اب بھی ایسے ہیں کہ وہ امریکہ کی دوستی کو ضروری سمجھتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں ایک ارب مسلمانوں کی دوستی سے ہاتھ دھوبیٹھنا کتنا بڑا نقصان ہے پھر لازماً ہر جگہ امریکی جان ومال کو خطرات لاحق ہو جائیں گے جسے آپ دہشت گردی کہیں گے۔

س۔ آپ سمجھتے ہیں کہ امریکی حکومت پاکستان سے کہہ رہی ہے کہ آپ جیسے لوگوں کا قلع قمع کردیا جائے۔

ج۔ ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ ایسا کر رہا ہے کیونکہ آئے دن ان کے بیانات بھی آجاتے ہیں فارن آفس کے لوگوں کے کہ وہ ایسے ہیں ویسے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ خوب سمجھتا ہے کہ کسی مدرسہ میں دہشت گردی یا جنگی تربیت نہیں ہو رہی ہے البتہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان مدرسوں کی تعلیم سے اسلامی سپرٹ زندہ ہے جہاد کا جذبہ زندہ ہے۔ تو جان بوجھ کر ان کو بدنام کر رہے ہیں۔ کلنٹن کا جب پاکستان کا دورہ تھا تو میں نے مذاق میں کہا تھا کہ کلنٹن پاکستان کے جس مدرسہ میں چاہے اچانک وزٹ کر سکتا ہے خود آکر دیکھ لے یہ ہمارا دارالعلوم ہے اسکو آپکے پریس والے وار ئیر سکول لکھتے ہیں لیکن اس کی کوئی باؤنڈری نہیں ہے چوبیس گھنٹہ کھلا ہے ہر وقت لوگ آتے جاتے ہیں۔ اور نماز کے وقت ٹریفک رکتی ہے نماز کیلئے لوگ آتے ہیں۔ ہم ان طالبان کو چاقو رکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ اور پاکستانی سکولوں یونیورسٹیوں میں ان کے پاس پستول اور کلاشنکوفیں بھری ہوتی ہیں ہاسٹلوں میں۔ اس پورے دارالعلوم میں کسی کیساتھ آپ کو پستول نہیں ملے گا۔ ابھی آپ نے ٹرین کی آواز سنی۔ ٹرین کو گزرتے ہوئے دیکھا ساری ٹریفک دارالعلوم کے اندر سے گویا گزر رہی ہے ٹرین بھی اور جی ٹی روڈ پر تمام ٹریفک تو کیا یہ لوگ جنگلوں اور صحراؤں میں بیٹھے ہوتے ہیں کہ ٹریننگ حاصل کریں۔ افغانستان کے طالبان کو جنگی تربیت خود روس نے دی ہے پچھلے ۱۵۔ ۲۰ سال میں انہوں نے آنکھیں کھلیں تو آگ اور خون ٹینکوں میں اور بکتر بند گاڑیوں بمباری میں ان کی آنکھیں کھلی ہیں انہوں نے ہر چیز وہاں سیکھی ہے جب ضرورت پڑتی ہے۔ تو وہاں جا کر ہتھیار اٹھالیتے ہیں ان کو ٹریننگ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

س۔ آپ نے کہا کہ امریکہ دباؤ ڈال رہا ہے پاکستان پر تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی صورتحال بھی آسکتی ہے کہ امریکہ آپ کی گورنمنٹ کو اتنا مجبور کرے کہ آپ کے مدرسے بند کردے۔

ج۔ ہمارے مدرسے بند نہیں ہو سکتے ہیں مدرسہ بلڈنگ کا نام نہیں ہے عمارتوں کا اور کلاس روموں کا انگریز کے دور میں بھی انہوں نے پابندی لگائی تو ایک استاد درخت کے نیچے بیٹھ جائے گا اور پانچ دس محلے کے بچے جمع ہو کر وہی دینی تعلیم حاصل کریں گے وہ جو آپ چاہتے ہیں کہ وہ چیز ختم ہو جائے وہ نہیں ختم ہو سکتی ہے۔ یہاں ٹیچر تنخواہ کے لئے کام نہیں کرتا اور طالب علم عہدہ منصب اور دنیاوی فائدے کیلئے علم حاصل نہیں کرتا میرا خیال ہے کہ دیگر ممالک اور پاکستان میں آپ کو فرق محسوس کرنا چاہئے الجزائر، ترکی، مصر وغیرہ اور پاکستان میں فرق ہے۔ یہ بہت بڑا احساس علاقہ دوڈھائی سو برس سے لوگ جنگ سے گزرے ہیں اور اسلامی اقدار سے

بہت، سخت وابستہ رہے ہیں اسی طرح افغانستان کو کوئی حکومت دبا نہ سکی۔ اسی طرح پاکستان میں بھی کوئی طاقت ان چیزوں کو بند کرنے کی جرأت کرے گی تو وہ چند دن بھی حکومت قائم نہیں رکھ سکے گی۔

س۔ جب آپ بین الاقوامی جہاد کی بات کرتے ہیں تو آپ کا کیا مقصد ہوتا ہے؟

ج۔ ہم تو بین الاقوامی جہاد کی بات اس طرح کرتے ہیں کہ ہم کہتے ہیں کہ ہر ملک اپنے ملک کے تحفظ کے لئے جدو جہد کرے یہ ہمیں اسلام نے سبق سکھایا ہے ہے کہ کسی بھی اسلامی کنٹری (ملک) کو کوئی مصیبت آئے اس کے حقوق غصب ہو اس ملک کو غلام بنایا جارہا ہو تو تمام دنیا کے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس کی اخلاقی مدد کرے اور اگر ان کو ضرورت ہے تو جانی و مالی کسی قسم کی بھی مدد فرض ہو جاتی ہے۔ اسلام نے یہ تصور دیا کہ جس سرزمین پر دشمن کا قبضہ آیا پہلے اس کا فرض ہے اگر وہ خود سنبھال سکے اگر اس سے نہیں ہو سکتا تو پڑوس میں جو اسلامی ملک ہے اس پر لازم ہے اور پھر نہ ہو سکا تو اسکے ساتھ والے ملک پر یہاں تک کہ مغرب سے مشرق کے آخری سرے تم مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جائے گا۔ س۔ مسلح افراد کتنے ہیں؟

ج۔ مسلح افراد سے آپکی کیا مراد ہے؟ س۔ وہ افراد جن کے ساتھ اسلحہ ہوتا ہے اور لڑتے ہیں لیکن فوجی نہ ہوں؟ ج۔ جہاں تک افغانستان 'بلوچستان اور صوبہ سرحد قبائل وغیرہ ہیں یہ اسلحہ انکے کلچر میں شامل ہے وہ جنگ کے لئے نہیں ہے۔ جیسے ایک زیور استعمال ہوتا ہے یہ صدیوں کی روایات ہیں کہ وہ آنکھیں کھولتے ہی اسلحہ کا استعمال سیکھتے ہیں جنگ کے لئے تربیت و حکومت نے کسی کو دی ہے نہ مدارس دیتے ہیں۔ البتہ افغانستان پر روسی جارحیت کے دوران ۱۲ ۔ ۱۳ سال جہاد جاری رہا اس کے اثرات بہت سے لوگوں پر پڑے اسی طرح اگر کشمیر میں سات لاکھ بھارتی ظلم و ستم جاری رکھیں گے تو لازماً کئی تنظیمیں اور ادارے اپنی طرف سے کوشش کریں گے اپنے بچاؤ کے خیال سے کہ کل اگر بھارت آجائے تو تیار رہیں۔

س۔ کتنے لوگ مسلح ہوں گے؟ ج۔ ہمیں کوئی اندازہ نہیں ہے خاص سروے تو نہیں کیا ہے۔

س۔ کوئی اندازہ ہے؟ ج۔ تو کیا آپ صحافت سے زیادہ امریکی سی آئی اے کی ڈیوٹی پر ہیں۔ آپ جنرل پرویز مشرف سے ملے ہیں کیا آپ نے ان سے پوچھا تھا۔ مجھے تو پورے پاکستان میں کوئی ایک مدرسہ بھی معلوم نہیں ہے کہ جہاں جنگی تربیت دی جارہی ہے ہم نے تو حکومت کو بار بار چیلنج دیا ہے کہ ہمیں بتائیں کہ کونسا مدرسہ ایسا کر رہا ہے ہم خود جاکر اسکے ہاتھ پکڑیں گے یہ اسلامی تعلیم ایک سپرٹ اور جذبہ ہے آپ اس سے گھبرا رہے ہیں یہ جذبہ غلط جگہ استعمال نہیں ہونے دیں گے کوئی ہم سے امن سے رہے ہمارے حقوق کا تحفظ کرے اسکو جان و مال ہر چیز کی گارنٹی ہوگی۔ یہ غلط فہمیاں اگر یورپ اور امریکہ کے دل سے نکل جائیں تو میدان بہت صاف ہو جائیگا ان کو کھلے دل سے آنکھیں کھول کر دماغ کھول کر سٹڈی کرنی چاہیے کہ ہماری تعلیمات کا پیغام کیا ہے۔

مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری
(استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

اکیسویں صدی اور اسلام بیسویں صدی کے تناظر میں

بیسویں صدی عالم اسلام کے لئے سخت آزمائشوں، ناکامیوں، نامرادیوں، مظلومیت اور بے بسی کی صدی تھی۔ اس صدی میں عالم اسلام کے سینے میں اسرائیل کی شکل میں خنجر گھونپا گیا اور فلسطین کی سرزمین یہودیوں کے ناپاک عزائم کو بروئے کار لانے کے لئے انہیں دی گئی۔ برطانیہ، فرانس، امریکہ اور یورپ کی سازش سے مسلمانوں کی متحدہ طاقت و قوت کا مظہر خلافت عثمانیہ کو نہ صرف کمزور کیا گیا بلکہ الغائے خلافت کا اعلان کر دیا گیا، اور ترکی پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنادیا گیا جو اپنی اسلام دشمنی میں ممتاز کردار ادا کر سکتا تھا۔ اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اسلامی شعائر پر پابندی عائد کر دی گئی اور ترکی جو اسلام کے پرچم تلے عالم اسلام کی صدیوں قیادت کر چکا تھا اسے غیر اسلامی قرار دے دیا گیا۔ عالم اسلام کی متحدہ قوت کو پاش پاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ عرب ممالک کے حصے بخرے کئے گئے۔ اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور باجگذار سلطنتوں کی حیثیت سے زلہ ربائی کا موقع دیا گیا۔ بالشویک تحریک کے نتیجے میں عالم اسلام کا ایک بڑا حصہ سرخ طوفان کی نذر ہو گیا، سمرقند و بخارا جو کبھی عالم اسلام کی آماجگاہ اور علماء و مشائخ کا مخزن تھے ان کی خوانگاہ و مدفن بن گئے۔ یورپی طاقتوں نے عالم اسلام کو اس طرح اپنے شکنجوں میں کسنا شروع کیا کہ لگتا تھا کہ اب اسلام کا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اور مسلمانوں کا زوال حتمی اور قطعی ہو گا۔ ایک ایک کر کے سارے مراکز یورپ کی استعماری طاقتوں کے ہاتھوں میں چلے گئے۔

لیکن قضاء و قدر کے فیصلے عجیب ہوتے ہیں یاس و ناامیدی کے بطن سے امید کی کرن ظاہر ہوئی، مغرب کا طلسم ہوش ربا ٹوٹنے لگا ۱۹۴۷ء میں بر صغیر آزاد ہوا، اور اس کی آزادی کے ساتھ ہی استعماری طاقتوں کے شکنجے ڈھیلے پڑتے چلے گئے، ایک دو دہائی کے اندر اندر ساری اسلامی ریاستیں آزاد ہو گئیں۔ وہ مظلوم و مقہور تھیں، ان کا سرمایہ لوٹ لیا گیا تھا، یورپی درندوں نے انھیں کنگال کر کے چھوڑا تھا، زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم جس طرح بہت سی اخلاقی، ذہنی اور معاشرتی کمزوریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ عالم اسلام کے بیشتر ملکوں میں ان کمزوریوں کا ایک سیلاب سا آ گیا۔ اس کی وجہ سے بے اعتمادی کے ساتھ بد اعتمادی کو فروغ ہوا، منافقانہ سازشیں شروع ہو گئیں، سربراہان مملکت کا قتل اور نئے سربراہ کی

تاج پوشی نے امن وامان کا مسئلہ پیدا کر دیا اور بے شمار کمزوریوں کو جنم دیا۔ عام طور پر اسلامی ملکوں کے سربراہ وہ لوگ منتخب ہوئے جو مغربی طاقتوں کے ایجنٹ اور ان کے نمک خوار تھے، جن کی تربیت اسلام کے زیر سایہ نہیں ہوئی تھی بلکہ ان کی تعلیم وثقافت کا محور یورپ کے مسیحی تبشیری مراکز تھے۔ ان سربراہوں کی وجہ سے اسلام کو مزید آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلے جو قوم اپنے مشترکہ دشمن مغرب کے خلاف صف آرا ہو رہی تھی اب اس کی صفوں میں شگاف پڑنے لگا اور آپس کی چپقلشوں میں اضافہ ہوتا گیا، اسرائیل کی چھوٹی سی ریاست کے مقابلہ میں عربوں کی قوت کمزور پڑ گئی۔ اور وہ عربوں کی اسی کمزوری کی وجہ سے غرب اردن، غزہ کی پٹی اور گولان کی پہاڑیوں پر بھی قابض ہو گیا۔ اور سینا کا سارا علاقہ اس کے تصرف میں آ گیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے عربوں کو قدرتی دولت پٹرول سے نوازا تو حالات قدرے سدھرنے لگے، لیکن اس کے ساتھ ہی مغرب کی للچائی ہوئی نظریں عالم اسلام کے ان خطوں پر دوبارہ پڑنے لگیں، جو اس کے خوں آشام پنجوں سے ابھی آزاد ہی ہوئے تھے۔ مغرب نے استعمار کی دوسری راہ نکالی، عراق وایران کے مابین دس سال خون آشام جنگیں ہوئیں افرادی قوت کے ساتھ مادی طاقت سے بھرپور اور ایران وعراق دونوں بے شمار مسائل میں پھنس کر رہ گئے، ایران چونکہ امریکہ کا مخالف تھا لہٰذا عراق کو کھلے عام شاباشی دی گئی، عراق نے ذرا حوصلہ سے کام لیکر ایٹمی تنصیبات کا پلان مرتب کیا، اور اس سلسلہ میں روس اور دیگر ایٹمی ملکوں سے تعاون لیکر اپنے ایٹمی منصوبوں کو روبہ عمل لانے کی کوشش کی۔ لیکن امریکہ کو یہ بات کیسے بھاتی، اور اس کالے پالک اسرائیل اس کو کیسے برداشت کر سکتا تھا امریکہ نے ایک نئی حکمت عملی تیار کی جس کے ذریعہ وہ عراق کو کمزور کر کے کویت وسعودیہ کی قوت کو توڑ بھی سکتا تھا، چنانچہ صدام حسین کے ذریعہ کویت پر حملہ کرا دیا گیا، اور سعودیہ کو بندر بھبکیاں دی جانے لگیں، اور پھر تحفظ کے نام پر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ سعودیہ اور کویت میں امریکی بحری اڈے قائم کر دیئے گئے، اور استعمار کا ایک نیا دور شروع ہو گیا، عراق کی ایٹمی تنصیبات کو تحفظ کے نام پر سبوتاژ کر دیا گیا، عراق جو عربوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھا، اس کی قوت توڑ دی گئی، اور اس کے اردگرد حصار کو تنگ کیا جاتا رہا، کویت کی پہلی حالت بحال ہوئی، لیکن اس جنگ کے نتیجے میں وہ اس قدر ٹوٹ چکا کہ اس کے ذریعہ عالم اسلام میں جو تعلیمی، دعوتی اور جہادی سرگرمیوں کو قوت بہم پہنچ رہی تھی، وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، سعودی عرب جو ورلڈ بینک کو قرض دیا کرتا تھا، اسے نہ دیکر ورلڈ بینک سے قرض لینے پر مجبور کر دیا گیا، اور جنگ کے مصارف کے نام پر اس سے اتنا صرفہ وصول کیا گیا کہ وہ اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا، معاشی صورت حال کمزور ہو گئی، عوام پر نئے ٹیکس عائد کئے گئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، قرض کا سود الگ دینا پڑ رہا

ہے اس طرح یہ اسلامی ملک سودی لعنت میں گرفتار ہو کر رہ گیا۔ ان سب ناگفتہ بہ حالات سے دوچار عالم اسلام پسپرہ زیست بر قوس قزح کے حسن و جمال کا متمنی ہے، اپنے آپ کو صرف ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لانا ہی نہیں چاہتا بلکہ ایک طاقتور قوم کی شکل میں زندگی کا خوگر بھی ہے، ان آرزوؤں اور تمناؤں کی دہلیز پر اکیسویں صدی کے آفتاب کی کرنیں مسلسل پڑ رہی ہیں، حالات کروٹ لے رہے ہیں اور آج کسی ایسے محمود کی تلاش ہے جس نے ۵ راگست ۱۰۰۱ء میں پشاور کے میدان میں راجہ جے پال کو شکست دی، جس کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ پیادہ اور تین سو ہاتھیوں کی ٹڈی دل فوج تھی۔ صرف دس ہزار کی فوج کے ساتھ محمود غزنوی کی یلغار نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی، اور اسے ایسی شکست فاش دی کہ وہ غزنی میں آٹھ ماہ محبوس رہنے کے بعد جب پنجاب واپس آیا تو سلطنت کا سارا کام وکاج اور تخت و تاج اپنے بیٹے انندپال کے حوالے کرتا ہوا اپنی رسوائی کی تاب نہ لاکر آگ کے دہکتے ہوئے الاؤ میں کود گیا، اور ہمیشہ کیلئے جے پال کا فتنہ ختم ہو گیا، کاش آج بھی کوئی محمود ثانی پیدا ہو جو عالم اسلام کی صفوں میں وحدت پیدا کر کے اسلام دشمن طاقتوں کے نرغے سے ذہنی، فکری، معاشی، اور ثقافتی غلامیوں سے عالم اسلام کو آزاد کرائے۔

آج اجتماعیت کا دور ہے، ہر چیز کو اس کے سہارے فروغ دیا جا رہا ہے، ملکوں پر ہند شیں اسی نام نہاد اجتماعیت کی علمبردار تنظیم یو، این، او کے ذریعہ قائم کی جارہی ہیں لہذا عالم اسلام کو بنیادی طور پر اس کے بالمقابل اسی اجتماعی روح کے ساتھ میدان عمل میں آنا ہو گا۔ اکیسویں صدی کی دہلیز پر فتنوں اور آزمائشوں کا سیلاب امڈتا ہوا دکھائی دے رہا ہے، اور اس کی ہر لہر عالم اسلام کو چیلنج کر رہی ہے، اس صورت حال کی عکاسی بہت پہلے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ نے ان الفاظ میں کی تھی:

"اسوقت تقریبا تمام مسلمان ممالک (عالم اسلام) میں ایک ذہنی کشمکش اور شاید زیادہ صحیح الفاظ میں ایک ذہنی معرکہ برپا ہے جس کو ہم اسلامی افکار و اقدار اور مغربی افکار و اقدار کی کشمکش یا معرکہ سے تعبیر کر سکتے ہیں ان ملکوں کی قدیم تاریخ مسلم اقوام کی اسلام سے گہری وابستگی اور محبت اور جس نام پر جنگ آزادی لڑی اور جیتی گئی یا جس طاقت کے سہارے ان ملکوں کی آزادی کی حفاظت کی گئی سب کا دعویٰ ہے کہ اس سرزمین پر صرف اسلامی افکار و اقدار کا حق ہے، اور یہاں صرف اس مسلک زندگی کی پیروی جائز ہے جس کی اسلام نے دعوت دی ہے۔

لیکن اس کے برعکس جس طبقہ کے ہاتھوں میں اس وقت ان ممالک کی زمام کار ہے اس کی ذہنی ساخت، اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی ذاتی و سیاسی مصالح کا تقاضہ ہے کہ ان ممالک میں مغربی افکار و اقدار کو فروغ دیا جائے، اور ان ممالک کو مغربی ممالک کے نقش قدم پر چلایا جائے، اور جو دینی تصورات

قومی عادات، ضوابط حیات اور قوانین وروایات اس مقصد میں مزاحم ہوں، ان میں ترمیم و تنسیخ کی جائے، اور بالاختصار یہ کہ ملک و معاشرہ کو تدریجی طور پر لیکن عزم و فیصلہ کے ساتھ مغربیت کے سانچہ میں ڈھال لیا جائے۔

اسی سلسلہ میں بعض ممالک اس سفر کی متعدد منزلیں طے کر چکے ہیں، اور اپنی منزل مقصود پر یا تو پہنچ گئے ہیں، یا اس کے قریب ہیں، اور بعض ممالک ابھی دوراہے پر ہیں۔ لیکن آثار و شواہد صاف بتار ہے ہیں کہ ع دل کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا

میرے نزدیک یہی اس وقت مسلم ممالک (عالم اسلام) کا سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ ہے، یہ مسئلہ نہ فرضی ہے نہ خیالی، مسلم ممالک کی اندرونی کمزوریوں اور مغربی تہذیب کے نفوذ و استیلاء کی کیفیت نے (جس کی نظیر تہذیب انسانی کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی) ممالک کے مادی، سیاسی اقتدار سارے مسلم ممالک کے سامنے اس مسئلہ کو نہایت روشن سوالیہ نشان بنا کر کھڑا کر دیا ہے جس کا جواب سب کو دینا ہے اور اس کے بغیر کسی ملک کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی، مغربی تہذیب کے بارے میں یہ ممالک کیا رویہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے معاشرہ کو موجودہ زندگی سے ہم آہنگ بنانے اور زمانے کے ماہر تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کون سی راہ اختیار کرتے ہیں، اور اس میں کس حد تک ذہانت و جرأت کا ثبوت دیتے ہیں، اس سوال کے جواب پر اس بات کا انحصار ہے کہ دنیا کے نقشہ میں ان قوموں کی نوعیت کیا قرار پائی ہے، ان ملکوں میں اسلام کا کیا مستقبل ہے؟ اور وہ اس زمانے میں اسلام کے عالمگیر و ابدی پیغام کے لئے کہاں تک مفید ہو سکتے ہیں؟" (اسلامیت و مغربیت کی کشمکش ص ۱۱-۱۲)

اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب محمد اسد صاحب اپنی کتاب (Road to Makkah) میں یوں رقمطراز ہیں:

"عالم اسلام اور یورپ کبھی ایک دوسرے سے اتنے قریب نہیں ہوئے تھے جتنے آج ہیں، اور یہی قرب اس ظاہری اور پوشیدہ کشمکش کا باعث ہے جو آج ان دونوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد (مردوں، عورتوں) کی روحیں مغربی ثقافت کے اثر سے آہستہ آہستہ سکڑتی اور سمٹتی جارہی ہیں۔ اپنے اس گذشتہ احساس سے وہ دور ہوتے جارہے ہیں کہ معیار معیشت کی درستی اور اصلاح صرف انسان کے روحانی احساسات کی اصلاح و ترقی کا ایک ذریعہ ہے، وہ اسی ترقی کے مت کی پرستش کا شکار ہوتے جارہے ہیں، جس کی وجہ سے یورپ تباہ ہو رہا ہے، ان لوگوں نے دین کو واقعات و حوادث کے پیچھے کی ایک فرسودہ آواز سمجھنا شروع کر دیا ہے، اسلئے وہ بجائے بلند ہونے کے اور پست

ہوتے جارہے ہیں۔" (طوفان سے ساحل تک)

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

بیسویں صدی کے پس منظر میں اکیسویں صدی کے تعلق سے بہت سے سوال اٹھ رہے ہیں، کیا عالم اسلام مغرب کی دل ربائی ہی کرتا رہے گا یا کچھ کرنے کے لئے آگے بھی بڑھے گا؟ اسی طرح اکیسویں صدی میں کون سی فکر غالب ہوگی؟ کون سی تہذیب وثقافت کو فروغ ہوگا۔ آثار و قرائن اس بات کے شاہد ہیں کہ اب میدان عمل اسلام کی پکار ہے۔ مغربی تہذیب سے لوگ اوب گئے ہیں، مسیحیت کے اندر کوئی طاقت نہیں، دیگر ادیان کھوکھلے ہو چکے ہیں، لیکن اسلام ایسا دین، ایسی شریعت اور ایسا قانون ہے جس کے اندر قوت ہے، نمو ہے، جدید و قدیم اصطلاح اس کے لئے بے معنی ہے، وہ ابدی اور سرمدی ہے، اس کی تہذیب کی اساس حقائق ابدی پر ہے وہ ایک سدابہار درخت ہے جو کسی وقت بھی نمو کی طاقت اور برگ وبار لانے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوتا۔

لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ اکیسویں صدی عالم اسلام کے غلبہ اور اظہار کی صدی ہے۔ اب دنیا کے سامنے اسلام کے سوا کوئی متبادل نظریہ حیات نہیں، اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کا فسوں ٹوٹ چکا ہے، اور پوری دنیا مغربی تہذیب کے باد سموم سے نیم جاں ہو کر سرچشمہ حیات کی تلاش میں سرگرداں ہے، لیکن شیطانی قوتیں انسانیت کو گمراہی میں مبتلا رکھنے کیلئے ذرائع ابلاغ کا استعمال پوری قوت سے کررہی ہیں، اور بنی آدم اور صراط مستقیم کے درمیان مصنوعی فاصلے اور رکاوٹیں ڈال رہی ہیں۔

ان حالات میں وہ صالح جماعتیں اور دردمند افراد جو معاصر مغربی تہذیب کی ہمہ گیری کے باوجود اسلام سے غیر معمولی وابستگی رکھتے ہیں اسلام سے انکی وابستگی اس بات کیلئے مجبور کرتی ہے کہ وہ معاشرے کے جملہ مسائل کا حل اسلام کی ہدایت کی روشنی میں دریافت کریں، باطل کا سحر انہیں متزلزل تو نہیں کرتا لیکن معاصر عہد میں اسکی ہمہ گیری انھیں گوناگوں طریقے سے پریشان ضرور کرتی ہے۔

جو افراد روایتی ملی احساس زیادہ رکھتے ہیں وہ پوچھتے ہیں کہ نئی صدی میں داخلے کیلئے مسلمانوں اور مسلم ملکوں کے پاس کیا کیا ہونا چاہئے؟ ابھی تک ہم کیا کیا حاصل کر چکے ہیں؟ اور مزید کیا درکار ہے؟ ان سوالات و اضطرابات اور ان کے پس منظر پر جس قدر غور کیا جاتا ہے، یہی بات نظر آتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے ہزار درجہ مخلصانہ جذبہ کے باوجود اس فکر میں نقالی، کم نگاہی یا سطحیت کارفرما ہے۔ آج عالم اسلام میں اس فکر کے خلاف جو جدوجہد جاری ہے جسے فکر عصر حاضر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس کے دو بنیادی ہند ہیں، حقیقی معنوں میں وہ فکر اسلامی سے متصادم ہیں۔ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ:

۱۔ حیات انسانی روئے زمین پر مادے کی غیر معمولی، لا معلوم مگر اتفاقی اور حادثاتی عمل کا نتیجہ ہے، اس میں کسی خالق یا صناع کی کاریگری اور منشاء کا کوئی دخل نہیں۔ یہ ایک آزاد و بے لگام اور بے سنگ و میل سفر ہے۔ ماضی اور مستقبل کی یکساں لا معلوم تاریکیوں کے مابین۔

۲۔ انسانی عقل فیصلہ کرنے، خیر و شر کے مابین آزادانہ تمیز کرنے، مفید و غیر مفید کے مابین فرق کرنے اور اپنے لئے قدریں متعین کرنے کے اعتبار سے کافی ہے اور یہ عقل، عقل کل کا حکم رکھتی ہے۔

بلاشبہ یہ جاہلی فکر کوئی نئی چیز نہیں، ربانی فکر کے مقابلہ میں شیطانی فکر ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ ہاں عصر حاضر میں اس کا ظہور "نشأۃ ثانیہ" کہلاتا ہے۔ جواب گویا نقطہ کمال تک پہنچ رہا ہے۔

اکیسویں صدی کا یہ سب سے بڑا چیلنج ہے جو عالم اسلام کو درپیش ہے۔ اس کے خلاف جو افراد اور جماعتیں سرگرم ہیں، وہ تشویشناک حد تک انہیں بنیادوں پر کام کر رہی ہیں۔ جو اس فتنہ جدید کی اساس میں داخل ہیں۔ یہ فتنہ جدید دراصل سوچ کی وہ رو ہے جس کے تحت اسلامی افراد اور جماعتیں مغربی جاہلی نظام اور اس کی اساس میں جاہلی قدروں کی مخالفت اور انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی عملی جدوجہد میں جاہلی نظام کی ظاہری عمارت کو ڈھا کر اس کے آثار اور اس کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکے بغیر (لاشعوری طور پر) انہیں قدروں کی بنیادوں پر اسلامی نظام کو استوار کرنے کی عملی جدوجہد کی طرف پیش قدمی کرنے لگی ہیں یا اس کا ارادہ رکھتی ہیں اور ظاہر ہے اس اساس پر جدوجہد کے مطلوبہ نتائج خوش کن نہیں ہو سکتے۔ نتائج کا تعلق بنیاد و اساس سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ لہٰذا عالم اسلام کے مصلحین، محققین، باحثین اور مجاہدین کو اپنی بنیادوں "کتاب و سنت" کو پیش نظر رکھ کر کام کرنا چاہئے۔ "تمسک بالکتاب والسنۃ" یہ وہ شاہ کلید ہے جو ہر قسم کی گمرہی، بے قدری اور بے وزنی اور بے بضاعتی سے ہمیں نکال کر روشنی قدر و منزلت اور باوزن حقیقت شعار زندگی کی طرف لے جاتی ہے۔

اس کیلئے لازم ہے کہ عجلت پسندی سے کام نہ لیا جائے۔ منصوبہ بندی کے ساتھ ہر مرحلہ میں کام کو انجام دیا جائے۔ بعض اوقات عجلت کے پیچھے شدت شوق کا معصومانہ جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ شدت شوق بجائے خود بری چیز نہیں لیکن بعض اوقات شدت شوق بے لگام ہو جاتی ہے اور افراد یا جماعتیں اپنے فیصلے ایسے امور کو مد نظر رکھ کر کرنا شروع کر دیتے ہیں جو حقائق کے بجائے مفروضے ہوتے ہیں اور محض شدت شوق ان کی ایسی تعبیر کرتی ہے کہ وہ حقائق نظر آنے لگتے ہیں

اس کے ساتھ اس کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ ان چیلنجوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ وہ معاصر طاغوتی افکار سے مغلوب نہ ہو جائے۔ مغلوبیت انسان کو اپنی فکری اساس سے تہی دست کر دیتی ہے۔

اور بنیادی تبدیلی کے بغیر صرف ڈھانچے اور ساخت کی تبدیلی پر قانع ہونا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ اسکو انقلاب یا تبدیلی کا نام نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس کے ذریعہ چنوتیوں کا سامنا کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کا اٹل فیصلہ ہے:

ولا تهنوا و لا تحزنوا و أنتم الاعلون ان كنتم مومنين

(اور تم ہمت نہ ہارو اور نہ غم کرو اور تم ہی سربلند رہو گے اگر تم ایمان پر قائم رہنے والے ہو۔)

فلا تهنوا و تدعوا الیٰ السلم و انتم الاعلون ....

(سو تم ہمت نہ ہارو اور صلح کی طرف مت بلاؤ اور تم ہی غالب رہو گے۔)

مولانا محمد شہاب الدین ندوی
چیئرمین فرقانیہ اکیڈمی بنگلور۔ انڈیا

اکیسویں صدی عیسوی میں عالمِ اسلام کا کردار؟

اسلام ایک کامل اور ہمہ گیر دین ہے اور اس کی جامع تعلیمات ہر دور کیلئے راہ ہدایت اور منارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہیں، جن میں کسی قسم کا نقص یا عیب نہیں ہے۔ اسلامی تعلیمات ہر مشکل حالات میں اہل اسلام کی رہنمائی کے لئے بہت کافی وشافی ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر مسلمان دین ودنیا کی سعادت حاصل کر سکتے ہیں۔

عالم اسلام کا اتحاد وقت کی ضرورت

آج اسلام اور اسلامی دنیا کو جن بین الاقوامی خطرات اور چیلنجوں کا سامنا ہے وہ آندھی اور طوفان کی طرح عالم اسلام کی طرف بڑھ رہے ہیں اور اس کو گھیرنے اور اس کا استحصال کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح آج امت اسلامیہ کو اپنی تاریخ کے سب سے بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ لہذا اس نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے عالم اسلام کو متحد ہونے کی جتنی شدید ضرورت آج ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ کسی بھی قوم اور کسی بھی امت کو مضبوط بننے کیلئے معاشی، فوجی اور سیاسی میدانوں میں ترقی کرنا ضروری ہے، ورنہ وہ "طاقتور" قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ان میدانوں میں کمزوری ہی کی وجہ سے طاقتور قومیں اسے دبانے اور تنگ کرنے لگتی ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس میں دورائیں نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے آج عالم اسلام کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ ان تینوں میدانوں میں دیگر قوموں سے بہت دور ہے۔ اسی لئے ترقی یافتہ قوموں کو آج عالم اسلام میں در آنے اور کھل کر کھیلنے کا موقع مل رہا ہے اگر پوری ملت متحد اور سارا عالم اسلام ایک ہو جائے تو ترقی یافتہ یا مغربی ممالک کی سازشیں اور انکے ناپاک عزائم ومنصوبے خاک میں مل جائینگے۔ کیونکہ آج عالم اسلام قدرتی وسائل، زرخیز زمین اور عددی قوت سے مالامال ہے اور اسکے پاس ایک حد تک تکنیکی معلومات بھی موجود ہیں اور مال ودولت کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ لہذا اگر یہ تمام ممالک معاشی وسیاسی سطح پر ایک "بلاک" بن کر کام کریں تو اس سے حیرت انگیز نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں۔ اور وہ ایک نئی قوت بن کر ابھر سکتے ہیں جو سیاسی میدان میں اپنا ایک خاص وزن رکھنے والی ہوگی۔ اور پھر اسے دبانا یا مسلم ملکوں میں دراندازی کرنا کسی

کیلئے آسان نہ رہے گا۔

راہ کی مشکلات

لیکن آج عالم اسلام کو متحد کرنا ایک نہایت درجہ مشکل اور محنت طلب کام ہے، جسے بروئے کار لانا موجودہ حالات میں جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ آج پوری اسلامی دنیا متعدد گروہوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان میں قومیتوں اور زبانوں کا اختلاف بھی ہے اور تہذیب وثقافت اور طرز حکومت کا اختلاف بھی۔ اور پھر ہر ایک کی امنگیں اور خواہشات و میلانات بھی الگ الگ ہیں۔ لیکن اس وقت عالم اسلام پر جو خطرہ منڈلا رہا ہے اسکے پیش نظر ان ممالک کو جتنی جلد ہو سکے اپنے اختلافات کو نظر انداز کر کے باہمی تعاون کی غرض سے کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ضرور کر لینا چاہیے۔ اگرچہ مغربی قومیں مسلم ممالک کو متحد ہونے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش ضرور کریں گی، مگر انہیں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کی غرض سے متحد ہوئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج عالم اسلام میں اتحاد واتفاق قائم کرنا موجودہ دور کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور یہ اصلاح پسندوں کیلئے ایک بہت بڑا چیلنج بھی ہے، مگر یہ کام ناممکن یا محال نہیں ہے بلکہ اس دشوار مسئلے کو حل کرنے کیلئے مسلسل اور انتھک محنت کرنے کی ضرورت ہے اور اس کام کو مکمل کرنے کی غرض سے چند ذہین اور مستقل مزاج لوگوں کو پورے اخلاص اور فکر مندی کیساتھ اس مہم میں اپنے آپ کو وقف کر دینا چاہیے، ورنہ گوہر مقصود ہاتھ نہیں آسکتا۔

اسی طرح آج مسلم ممالک کو ذرائع ابلاغ یا میڈیا پر بھی زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آج مغربی پروپیگنڈہ میڈیا ہی کے بل بوتے پر چلایا جارہا ہے۔ چنانچہ موجودہ دور میں میڈیا پروپیگنڈے کا ایک بہت بڑا ہتھیار بن گیا ہے۔

عالم اسلام کا اتحاد کس لئے؟

آج روئے زمین پر پچاس سے زیادہ مسلم ممالک پائے جاتے ہیں، جو قدرتی وسائل اور زرعی پیداوار سے مالا مال ہیں۔ لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیچھے ہو جانے کے باعث وہ ان سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے۔ لہذا اس قدرتی دولت کو مغربی ممالک محض اپنی تکنیکی معلومات کے بل بوتے پر جی بھر کر لوٹ رہے ہیں، گویا کہ وہ انکی آبائی میراث ہو۔ اور اس مقصد کیلئے وہ مسلم ممالک میں تفرقہ ڈال کر انہیں باہم لڑانے کا کھیل بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ آج خلیجی ممالک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

اور اس سلسلے میں مغرب کا ایک کھیل یہ بھی ہے کہ وہ ہماری خام پیداوار دونوں ہاتھوں سے

بٹورنے کے باوجود ہمیں "پیسہ" دینے کے جائے صرف "ہتھیار" دیتا ہے، تاکہ ہم آپس ہی میں لڑتے رہیں۔ اگر پیسہ دیتا بھی ہے تو اسے اپنے ہی (مغربی) بنکوں میں جمع کرالیتا ہے، تاکہ ہم اس پیسے کا صحیح طور پر استعمال بھی نہ کرسکیں۔ اس طرح اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔ یہ وہ استعماری چالیں ہیں جن کی وجہ سے آج عالم اسلام بلبلارہا ہے۔ لہذا آج عالم اسلام کو مغرب کے اس طلسمی جال سے باہر نکلنے اور اپنے آپ کو پہچاننے کی ضرورت ہے اور اس کیلئے ایک منصوبہ بند عمل ناگزیر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد عظیم عالم اسلام کے اتحاد کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتا۔ لہذا آج اسلامی ملکوں کو اپنے تمام اختلافات بالائے طاق رکھ کر ایک دوسرے سے ہاتھ ملانا اشد ضروری ہے ورنہ آنے والا وقت ہمیں کبھی معاف نہیں کرسکتا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ آج مغرب سائنس اور ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر اپنی برتری جتانا اور کمزور قوموں پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے۔ لہذا مغرب کے اس جال سے باہر نکلنے کیلئے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی میں برتری حاصل کرنا موجودہ حالات میں "فرض عین" قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ مثل مشہور ہے کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے۔ مگر اس مقصد کیلئے ہمیں مغرب سے ہتھیار خریدنے کے جائے فنی اور تکنیکی جانکاری (مہارت) حاصل کرکے ہر قسم کے ہتھیار خود تیار کرنا ہوں گے تاکہ رفتہ رفتہ مغرب پر ہمارا انحصار کم سے کم ہوسکے اور ہم اپنی ضروریات میں خود کفیل بن جائیں۔ اور اس اعتبار سے مغرب کی تجارت پر بھی ایک کاری ضرب لگے گی۔ چنانچہ مغربی قومیں محض اپنی تاجرانہ ذہنیت کے تحت مشرق کو ایک منڈی تصور کرتے ہوئے ایک طرف دھڑا دھڑ جنگی ہتھیار اور سازوسامان تیار کرکے اپنی جیبیں بھر رہی ہیں تو دوسری طرف مختلف قوموں کو باہم لڑا کر تماشا بھی دیکھ رہی ہیں ظاہر ہے کہ یہ ایک عیارانہ اور مکارانہ سیاست ہے جس کی وجہ سے آج سارا عالم آتش کدہ بنا ہوا ہے اور اس مقصد کیلئے یہ قومیں مصنوعی جنگ پیدا کرکے اپنے ہتھیار فروخت کرتی ہیں۔ تاکہ انکی عیاشی میں کوئی فرق نہ آئے۔ اس اعتبار سے آج عالم اسلام کے اتحاد کی جتنی شدید ضرورت ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ اگر ان سنگین حالات کے باوجود بھی مسلم ممالک متحد نہ ہوئے تو پھر ملت اسلامیہ کا خدا ہی حافظ ہوگا۔ موجودہ حالات میں عالم اسلام کا مکمل اتحاد تو ممکن نہیں ہے، ہاں البتہ ابتداء میں ایک مشترکہ حکمت عملی (اسٹراٹیجی) کا تحت مسلم ممالک کا صرف معاشی وسیاسی بلاک ضرور وجود میں آسکتا ہے اور اس حکمت عملی کی رو سے ایک طرف آپس میں باہمی اقتصادی ومعاشی تعاون کیا جائے اور اسکے نتیجے میں ضرورت کی ساری چیزیں خود تیار کی جائیں۔ تو دوسری طرف ان تمام ممالک کی ایک مشترکہ خارجہ پالیسی وضع کرکے اس پر سختی کیساتھ عمل کیا جائے۔ اور اس سلسلے میں مغربی ممالک کی دھمکیوں پر مطلق توجہ نہ دی

جائے۔ کیونکہ وہ ہر ممکن کوشش کریں گی۔ کہ اس قسم کا بلاک وجود میں نہ آسکے۔

معاشی ترقی کی اہمیت

کسی بھی ملک کا استحکام معاشی اور فوجی میدانوں میں ترقی کے باعث ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ اور ان دو میدانوں میں ترقی کے بعد ہی اسے سیاسی میدان میں بھی برتری حاصل ہو سکتی ہے۔ لہذا کوئی بھی ملک معاشی، فوجی اور سیاسی حیثیت سے مضبوط و مستحکم بنے بغیر "ترقی یافتہ" نہیں کہلا سکتا۔ اس اعتبار سے کسی بھی ملک کو "ترقی" کی منازل طے کرنے کیلئے سب سے پہلے اپنی معاشی و اقتصادی حالت سدھارنے اور اس میں خود کفیل بننے کی ضرورت پڑتی ہے۔ خود کفیلی کا یہ مطلب ہے کہ اپنی ضروریات کی ساری چیزیں خود تیار کی جائیں اور اس مقصد کیلئے مختلف صنعتوں کو فروغ دیا جائے۔

معاشیات کی اس اہمیت کی بنا پر آج دنیا کی تمام قوموں کے درمیان اس میدان میں سخت مقابلہ چل رہا ہے اور ہر قوم دوسری قوموں پر سبقت لے جانے میں کوشاں نظر آرہی ہے کیونکہ معاشی و اقتصادی قوت ہی وہ چابی ہے جو اسے دیگر میدانوں میں آگے بڑھا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے آج جو قوم اس میدان میں پیچھے رہ جائے وہ فوجی و سیاسی میدان میں بھی پس ماندہ بن کر رہ جائے گی اور اسے دوسروں کے سہارے جینا اور اپنی آزادی کو غیروں کے پاس رہن رکھنا پڑے گا۔ یعنی اسے ترقی یافتہ قوموں کی من مانی شرائط تسلیم کرنی پڑیں گی۔ چنانچہ آج اس کی تازہ مثال خود روس ہے جو کچھ عرصہ پہلے ایک سپر پاور اور امریکہ کا سب سے بڑا حریف تھا۔ مگر آج اس کا معاشی نظام تباہ ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اسکی فوجی برتری بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ حالانکہ اس کی فوجی طاقت اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔

آج معاشیات و اقتصادیات کا رشتہ تعلیم، سائنس اور صنعت و حرفت سے بھی بہت گہرا ہے۔ کیونکہ تعلیم اور خاص کر سائنسی علوم میں برتری حاصل کئے بغیر اس میدان میں پیش رفت کرنا ممکن نہیں۔ آج صنعتی علوم کا دور دورہ ہے جن میں مہارت حاصل کرنے کی بعد ہی صنعت و حرفت یا ٹیکنالوجی کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ اور کارخانوں کا قیام علم میں آسکتا ہے۔ چنانچہ آج مختلف اقسام کا ساز و سامان تیار کرنے والے کارخانوں کے قیام سے نہ صرف ملکی ضرویات پوری ہوتی ہیں بلکہ ان سے بے روزگاری کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہے۔ اور قومی تجارت کو فروغ بھی حاصل ہوتا ہے۔ جسکے نتیجے میں خوش حالی آتی ہے اس اعتبار سے موجودہ دور میں کارخانوں کی بڑی اہمیت ہو گئی ہے۔ جو کسی ملک کی ترقی کی علامت سمجھے جاتے ہیں اور جو ملک اس میدان میں جسقدر آگے ہوگا وہ اسی قدر "ترقی یافتہ" کہلائے گا۔ غرض آج بڑی یا ترقی یافتہ طاقتیں جو معاشی حیثیت سے مضبوط ہیں وہ نہ صرف غیر ترقی یافتہ قوموں کا خون چوس رہی ہیں بلکہ انہیں بے موت مرنے پر بھی مجبور کر رہی ہیں۔ کیونکہ ان طاقتوں نے آج غیر ترقی یافتہ ممالک کو

اقتصادیات کے جال میں اس بری طرح پھانس رکھا ہے کہ اس سے باہر نکلنے کی کوئی سبیل ہی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ کیونکہ وہ کسی کو معاشی امداد یا قرضہ بھی صرف اپنی ہی شرائط پر دیتی ہیں۔ اس طرح آج تیسری دنیا بھاری قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی کراہ رہی ہے اور ان قرضہ جات کا سود تک ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ بلکہ صرف سود ادا کرنے کے لئے یا تو نئے قرضے لینے پڑتے ہیں یا پھر نئے نئے ٹیکس عائد کر کے عوام کی کمر توڑ دیجاتی ہے۔ چنانچہ ہر سال ان ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور مہنگائی بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میدان میں کئی ممالک دیوالیہ ہو چکے ہیں۔

عالم اسلام کا دوبارہ عروج

آج عالم اسلام میں کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے جو اس میدان میں خود کفیل ہو۔ لیکن اگر تمام مسلم ممالک متحد ہو کر اس میدان میں جدوجہد کریں تو اپنی ضروریات میں بہت بڑی حد تک خود کفیل بن سکتے ہیں اور اسکے نتیجے میں "کامن ویلتھ مارکیٹ" کی طرز پر مسلم ممالک کی ایک "مشترکہ تجارتی منڈی" بھی وجود میں آسکتی ہے۔ اس اقدام کے ذریعہ عالم اسلام کے عروج کا ایک نیا دور شروع ہو سکتا ہے۔ اور تعلیمی و اقتصادی میدان میں ایک انقلاب آسکتا ہے، تجارت کو فروغ اور بے روزگاری کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ نیز سب سے بڑھ کر یہ کہ اس اقدام کے ذریعہ تمام مسلمانوں کے درمیان بھائی چارہ قائم ہونے کے علاوہ خود دین اسلام کو دوبارہ عروج حاصل ہو سکتا ہے۔ آج مسلمانوں کے پاس سب کچھ موجود ہے ،لہذا اگر وہ چاہیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں اور ایک نئی طاقت بن کر ابھر سکتے ہیں۔ ان تمام اعتبارات سے آج عالم اسلام کو اس میدان میں "جہادی" پیمانے پر اور "جہادی اسپرٹ" کیساتھ کام کرنا ضروری ہے۔ ورنہ یہ مقصد عظیم حاصل نہیں ہو سکتا۔

نوجوان ملت کا اصل سرمایہ

ان مقاصد کو بروئے کار لانے کیلئے ہمارے نوجوانوں کو اس میدان میں آگے بڑھنا ضروری ہے کیونکہ کسی بھی قوم یا ملت میں نوجوانوں کی عددی قوت ہی اصل طاقت ہوتی ہے جو جوش و جذبے سے کام کرتے ہیں، بشرطیکہ وہ اپنی قدر و قیمت پہچان لیں۔ لہذا ہر قوم میں نوجوانوں کو ایک بامقصد تحریک کیلئے منظم کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اور اس مقصد کیلئے انہیں سب سے پہلے مغربی فلسفوں کے جال سے باہر نکال کر انکے سامنے اسلامی نظام حیات کی خوبیاں پیش کرنے اور انہیں ایک برتر کاز کے لئے تیار کرنا ضروری ہے۔ اور اس کام کیلئے چند مخلص لوگوں کو اس راہ میں جٹ جانا چاہیے۔ نوجوانوں کی ذہن سازی کا کام ہمارے تمام ملی کاموں میں سب سے مقدم ہے اور آج اسے "عبادات ضروریہ" کے بعد اولین مقام دیا

جاسکتا ہے۔ یعنی اسے ایک "فرض عین" کی طرح اپنانے کی ضرورت ہے، تب کہیں جاکر گوہر مراد حاصل ہو سکتا ہے۔ لہذا اسے ایک معمولی کام یا بے کاری کا مشغلہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ آج قوموں کے عروج وزوال میں اسکی بڑی اہمیت ہو گئی ہے زندہ قوموں کو اپنی زندگی کا ثبوت دینے کیلئے ہر قسم کے جتن کرنا اور ہر قسم کی قربانیاں دینے کیلئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ ورنہ خلافت ارض کے دوبارہ حصول کا ہم محض خواب ہی دیکھتے رہ جائینگے۔

اجتماعیت کا شعور ضروری

آج مسلمانوں میں اجتماعیت کا شعور بہت کمزور ہو گیا ہے۔ اگر مسلمان تعلیمی اور معاشی میدان میں لاکھ ترقی کرلیں لیکن ان میں اگر اجتماعیت نہ ہو تو وہ ہرگز کار خلافت کے لائق نہ رہیں گے۔ کیونکہ خلافت کا حصول ایک اجتماعی اور منظم عمل کا داعی ہے۔ لہذا اس کیلئے اجتماعی زندگی لازمی ہے۔ انفرادی زندگی ایک بے مقصد زندگی ہے جو بغیر چرواہے کے ایک ریوڑ جیسی ہے اس اعتبار سے آج مسلمان بھیڑ بکریوں کے ایک پراگندہ ریوڑ کی طرح ہیں جن کا کوئی نگران نہ ہو۔ آج روئے زمین پر مسلمان عددی اعتبار سے ایک ارب سے زیادہ ہیں۔ مگر ان میں اجتماعیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ ہر جگہ پٹ رہے ہیں۔ اور دنیا کی قومیں انہیں ہر جگہ روندرہی ہیں۔ لیکن اگر ان میں اجتماعیت کا شعور بیدار ہو جائے اور وہ متحد ہو جائیں تو پھر وہ بڑی طاقتوں کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔

لہذا قائدین اسلام اور خاص کر علمائے کرام کا فرض بنتا ہے کہ وہ مسلمانوں میں اجتماعی شعور کے جذبات بیدار کر کے انہیں خلافت کے میدان میں آگے بڑھائیں تاکہ یہ ملت پھر سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہو سکے۔

اسلام اور اصلاح عالم

خلاصہ بحث یہ کہ آج عالم انسانی اور خاص کر اسلامی دنیا کو جن خطرات اور نئے نئے چیلنجوں کا سامنا ہے ان میں امریکہ کا "نیا عالمی نظام" (نیو ورلڈ آرڈر) اور "جہانگیری" (گلوبل ازم) جیسے سنگین چیلنج سر فہرست ہیں۔ آج امریکہ اور اسکے حلیف ان نظاموں کے ذریعہ تیسری دنیا یا غیر ترقی یافتہ ممالک کو گھیرنے اور ان پر اپنی مادہ پرستانہ تہذیب مسلط کر کے ان کو ان کے دین وایمان سے برگشتہ کرنے کے درپے نظر آرہے ہیں۔ لہذا اگر اسلام پسند یہ چاہتے ہیں کہ عالم انسانی کو مادیت کے اس نئے فتنے سے بچایا جائے اور سامراج کے اس نئے حربے کو ناکارہ کردیا جائے تو پھر انہیں اس نئے طوفان کے خلاف سینہ سپر ہو جانا چاہیے۔ اور تن من دھن کی بازی لگا کر محاذ سنبھال لینا چاہیے۔ ورنہ یہ طوفان باقیات انسانی کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائیگا۔

موجودہ نازک حالات میں اصلاح عالم کا فریضہ نہایت درجہ اہم ہے، جسے صرف امت مسلمہ ہی انجام دے سکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو پہچان لے اور پھر کچھ کر دکھانے کیلئے آمادہ عمل ہو جائے۔ اسکے نتیجے میں موجودہ ظلم وعدوان، لوٹ کھسوٹ اور انسان کو انسان کی غلامی سے نجات مل سکتی ہے اور دنیا کو اسلام کے نظام عدل ورحمت کا نظارہ پھر سے ہو سکتا ہے۔ اسی لئے امت اسلامیہ کو "خیر امت" کا لقب دیا گیا ہے۔

واضح رہے اسلام اپنی فطرت اور ساخت کے لحاظ سے ایک ایسا دین ہے جو کسی بے خدائی یا باغیانہ تحریک کو سر اٹھاتے دیکھ کر ایک تماشائی کی حیثیت سے خاموش نہیں رہ سکتا، جو روحانی اقدار کو مٹانے کے درپے ہو۔ کیونکہ اسلام ہر باطل تحریک کو کچلنے کے لیے آیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"کہہ دو کہ (دین) حق آگیا اور (نظام) باطل مٹ گیا، کیونکہ باطل کو تو مٹنا ہی ہے" (بنی اسرائیل: ۸۱) "اگر دین حق باطل پرستوں کی خواہشات کا پابند ہو جائے تو زمین و آسمان اور ان میں جو کچھ ہے سب کا نظام بگڑ کر رہ جائے گا" (مومنون: ۷۱)

گلوبلزم: عالم انسانی کے لئے ایک نیا خطرہ

آج امریکہ جہاں ایک طرف نیو ورلڈ آرڈر یعنی نئے عالمی نظام کے ذریعہ غیر ترقی یافتہ ممالک کو گھیرنے اور ان پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش کر رہا ہے تو دوسری طرف وہ "گلوبلزم" یا "جہانگیری" کے نام پر پوری دنیا کو ایک "آزاد منڈی" یا "اوپن مارکیٹ" قرار دینے کی جدوجہد بھی کر رہا ہے اور اس تحریک کے دو مقاصد ہیں:

پہلا مقصد یہ ہے کہ پوری دنیا میں مغربی مصنوعات بغیر کسی کسٹم یا ٹیکس کے آزادانہ طور پر پہنچتی رہیں اور اس کے لئے دلیل یہ دی جارہی ہے کہ آج پوری دنیا سکڑ کر ایک چھوٹے سے گاؤں کی طرح ہو گئی ہے لہذا لوگوں کی ضروریات کی اشیاء کا ہر جگہ بلا روک ٹوک پہنچنا ضروری ہے اس اعتبار سے امریکہ اور مغربی ممالک چاہتے ہیں کہ ایک طرف غیر ترقی یافتہ ممالک کی منڈیاں مغربی مصنوعات کے لئے چوپٹ کھل جائیں تو دوسری طرف ان ممالک کی صنعتیں بھی تباہ ہو کر رہ جائیں۔ کیونکہ کوالٹی کے اعتبار سے ہر شخص مغربی مصنوعات کو دیسی مصنوعات پر ترجیح دے گا تو دیسی صنعتیں خود بخود تباہ ہو جائیں گی اور انہیں ختم کرنے کا الزام ترقی یافتہ ممالک پر عائد نہ ہوگا۔

ایک تہذیبی یلغار

اس تحریک کا دوسرا مقصد، جو ابھی پوری طرح واضح نہیں ہے مگر وہ پہلے مرحلے (آزاد مارکیٹ کے قیام) کا لازمہ نظر آتا ہے، یہ ہے کہ دوسرے مرحلے میں غیر ترقی یافتہ ممالک پر ایک ثقافتی حملہ کر کے

مقامی تہذیبوں کو پوری طرح ختم کر دیا جائے۔ تاکہ مغربی تہذیب واحد اور برتر تہذیب بن کر ابھرے ، اور پوری دنیا ایک ہی رنگ میں رنگی جائے۔ ہر جگہ یکسانیت ہو اور من و تو کا فرق باقی نہ رہے۔ چنانچہ برٹانیکا ملٹی میڈیا ہیڈ کے مطابق نیو ورلڈ آرڈر کے سباق میں جس "تہذیبی تصادم" (Clash of Civilization) کی پیشگوئی کی گئی ہے وہ اسی آنے والی تہذیبی جنگ کی طرف اشارہ ہے اور یہ ہولناک جنگ سارے عالم کیلئے فتنہ انگیزی کا باعث ہوگی۔

اس اعتبار سے "گلوبلزم" یا "مغربی جہانگیری" کی کامیابی کا لازمی نتیجہ جو سامنے آئے گا وہ یہ ہوگا کہ دنیا کے تمام انسان، خواہ ان کا مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ "ذہنی" اعتبار سے ملحد یا مادہ پرست بن جائیں گے اور مذہب سے ان کا تعلق برائے نام رہ جائے گا اور وہ دین و اخلاق کو ایک قصہ پارینہ تصور کرتے ہوئے اپنا قبلہ و کعبہ مغربی ممالک اور خاص کر امریکہ کو قرار دینے لگیں گے اس طرح یہ ثقافتی حملہ امریکہ کے اقتصادی اور سیاسی حملے کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ مغربی استعمار کی ایک نئی شکل ہے جو شاید اس کا آخری حربہ و حملہ ہوگا۔

موجودہ دور کا اہم ترین مسئلہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبردست ترقی کی بدولت مواصلاتی نظام میں ایک حیرت انگیز انقلاب آگیا ہے اور پوری دنیا سکڑ کر ایک گاؤں کی طرح بن گئی ہے اور دنیا کی تمام قومیں نئے آلات و اوزار اور نئی نئی مشینوں کے استعمال پر خود کو مجبور پا رہی ہیں جن سے کٹ کر کوئی بھی قوم ایک قدم بھی نہیں چل سکتی ورنہ وہ باقی دنیا سے الگ تھلگ ہو جائے گی آج زندگی کا ایسا کوئی بھی شعبہ باقی نہیں رہ گیا ہے جس میں جدید تمدنی آلات و وسائل کا دخل نہ ہو اس اعتبار سے آج پوری دنیا میں یکسانیت پیدا ہو گئی ہے چنانچہ ہمارے گھر، دفتر، سکول، کالج، ہسپتال اور مارکیٹ وغیرہ سب کے سب ان نئے آلات اور مشینوں سے بھرے ہوئے ہیں جن کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ آج کون سی قوم ہے جو ریل، موٹر کار، ہوائی جہاز، ٹیلیفون، فیکس، کمپیوٹر اور دیگر نئے نئے ذرائع سے چھوت چھات برت سکتی ہو؟ پچھلے ادوار میں جو کام مہینوں اور برسوں میں ہوتے تھے وہ آج برق دھاپ اور جوہری توانائی کی تسخیر کی بدولت منٹوں اور سیکنڈوں میں ہونے لگے ہیں۔ لہذا ان مفید وسائل سے کنارہ کشی کسی قوم کو عہد قدیم میں پہنچا دے گی۔

لیکن یہ اور اس قسم کے تمام جدید آلات و وسائل محض ترقی، تمدن کی علامت ہیں جو مختلف قوموں کی باہمی اور مسلسل کاوشوں کا نتیجہ ہیں اور اس میں خود اسلامی دور کا بھی خصوصی حصہ ہے لہذا اسے کسی مخصوص قوم کی میراث نہیں کہا جاسکتا' اور اس اعتبار سے جدید آلات و تمدنی اشیاء کو مغرب کی

میراث یا اس کی ملکیت قرار دینا اصولاً ایک خلاف واقعہ بات ہے۔ غرض تمدن جدید اور اس کے مظاہر تمام قوموں کا مشترکہ سرمایہ ہیں جن کو بنیاد بنا کر اپنا مخصوص مادی کلچر و بے خدا ثقافت کو دوسروں پر مسلط نہیں کر سکتے۔

مگر آج چونکہ ہر قوم کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ مغرب کی اس بظاہر برتری اور اس کی "چمکیلی" تہذیب کا پرستار ہے اس لئے وہ مغربی تہذیب اور اس کا کلچر بڑے فخر کے ساتھ اختیار کرتے ہوئے اپنی مذہبی یا ملکی تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اس لئے مغربی قومیں بہت زیادہ پرامید ہیں کہ وہ اپنی اس کھوکھلی بلکہ "دجالی" تہذیب کا جال ساری دنیا میں پھیلا کر ہر ایک کو اس کے دین وایمان سے برگشتہ کر کے ہی دم لیں گی۔ اسی لئے وہ آج گلوبلزم کا نعرہ بلند کر کے پوری نوع انسانی کو مغربی رنگ میں رنگ دینا چاہتی ہیں۔

موجودہ بحران کا حل

لہذا ترقی پذیر ممالک اور خاص کر عالم اسلام کو صرف مغرب کی سائنس اور ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے اسکے مخصوص تہذیب و کلچر کو جو مادہ پرستانہ ہے 'مسترد کر دینا چاہیے' کیونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی وہ تجرباتی علوم ہیں جو تمام قوموں کا مشترکہ سرمایہ ہیں جن سے اجتناب نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ تاریخی حیثیت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جدید سائنس کی بنیاد ڈالنے اور اسے ترقی دینے والے خود مسلمان تھے جن کو قرآن عظیم نے اپنے دینی وشرعی مقاصد کو بروئے کار لانے کیلئے اس میدان میں اتارا تھا۔ قرون وسطیٰ میں اگر مسلمان فوجی وسیاسی میدان میں شکست نہ کھاتے تو وہ آج اس میدان کے شہسوار ہوتے مگر فوجی وسیاسی پسپائی کے باعث وہ اپنی سائنسی برتری قائم رکھ نہ سکے۔ بلکہ ۱۴۹۲ء میں زوال اسپین زوال امت کی آخری کڑی بن گیا۔

لہذا آج عالم اسلام کو مغرب کے طلسمی جال سے باہر نکلنے کے لئے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں پھر سے کودنے اور اس میں آگے بڑھنے کی ضرورت ہے موجودہ حالات میں یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے اگر امت مسلمہ عزم مصمم کرلے تو پھر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ارادہ اور عزم ہی وہ اصل قوت ہے جو کسی قوم کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

مغربی کلچر لذتیت پر مبنی ہے:

اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مغربی اقوام جس "جہانگیری" یا "گلوبلزم" کا نعرہ بلند کر رہی ہیں اور اس کے نتیجے میں جو مادہ پرستانہ یا بے خدا تہذیب اقوام عالم پر لادنا چاہتی ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس پر بھی کچھ روشنی ڈال دی جائے تو اس تہذیب کا مرکز و محور صرف "جسم انسانی" ہے اور اس

تہذیب کے عناصر خود غرضی، عیاشی، عریانی اور لذت پرستی ہیں۔ جسم انسانی کو سجانا سنوارنا اور جنس مخالف سے تمتع حاصل کرنا بلکہ اس کا ہر ممکن طریقے سے جنسی استحصال کرنا اس تہذیب کی معراج ہے اور اس کلچر کے مراکز سوپر مارکیٹ، نائٹ کلب، فائیو اسٹار ہوٹل، رقص و سرور کی محفلیں، بار یا شراب خانے اور سیاحتی مراکز ہیں جہاں پر ان کی زندگی دھڑکتی اور جذبات مچلتے ہیں۔ اس کلچر میں شراب، کباب اور "شباب" کے بغیر چین نہیں آتا۔ اور اس ماحول میں وہ اس قدر غرق ہو جاتے ہیں کہ روحانیت بالکل مردہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس اعتبار سے مغرب لذت پرستی یا موج و مستی کا عاشق اور شراب و کباب اور عورت کا رسیا ہے اور یہ چیزیں مادہ پرستی کا لازمہ ہیں جو اس کے خمیر میں داخل ہو چکی ہیں کیونکہ "بے خدا" لوگوں کو اپنے غم غلط کرنے کا یہی ایک واحد ذریعہ نظر آتا ہے۔ لہٰذا وہ عیاشیوں اور خرمستیوں اور خرمستیوں کے نئے نئے طریقوں کی کھوج میں رہتے ہیں۔ اس تہذیب کے علمبردار عورت کو ایک کٹھ پتلی کی طرح انگلیوں پر نچا رہے ہیں۔ مغربی عورت پہلے نیم عریاں لباس میں رہتی تھی مگر آج وہ لباس سے آزاد اور بے نیاز ہوتی جا رہی ہے کیونکہ تہذیب جدید کے علمبردار آج یہی چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ ان کے اشاروں پر سر جھکاتی جا رہی ہے کیونکہ یہ حصول دولت کا ایک آسان ذریعہ ہے اہل مغرب کے نزدیک ہر وہ چیز حلال ہے جسے آسمانی مذاہب نے حرام قرار دیا ہے جیسے زناکاری، شراب نوشی اور سور کا گوشت وغیرہ۔ بلکہ اب انہوں نے "محرمات" تک کو حلال کر لیا ہے، جو بے شرمی اور بے حیائی کی انتہا ہے اور یہ سب "اباحت پسندی" یا آزادانہ جنسی تعلقات کا نتیجہ ہے۔ شادی بیاہ ان کی نظروں میں ایک کھیل تماشہ بن کر رہ گیا ہے جسے کسی قسم کا تقدس حاصل نہیں ہے۔ بلکہ شادی بیاہ کے بندھنوں کو جب چاہا ایک کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا جاتا ہے، ایک مرد کئی کئی عورتوں کے ساتھ بیک وقت تعلقات قائم کرتا ہے اور یہی حال عورتوں کا بھی ہے اور اس کا مقصد محض حصول لذت اور اس میں "تنوع" پیدا کرنا اور حصول لذت کے نئے نئے طریقے ڈھونڈنا ہے کیونکہ ان کی نظر میں یہی دنیا "جنت" ہے اور آخرت کی جنت کا کوئی وجود نہیں ہے، جسے وہ اہل مذہب کی گھڑی ہوئی ایک کہانی یا مذہب کی "افیم" قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ آج ٹی وی اور اخبارات و رسائل کے ذریعہ اس شیطانی کلچر کے خدوخال کو نمایاں سے نمایاں کر کے حیوانی جذبات کو خوب ابھارا جا رہا ہے اور اسے پوری دنیا میں رائج کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے تاکہ تمام انسان حیوانیت کی سطح پر آجائیں اور دین و شریعت یا اخلاقی اقدار و کردار کا خاتمہ ہو جائے۔

دجال کی جنت اور دوزخ

الغرض مغربی تہذیب جنسی آزادی اور انار کی کی داعی ہے جس میں عصمت و عفت اور پاک دامنی یا روحانیت کے ارتقاء کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے وہ دین وایمان اور اخلاق و کردار کو ایک ڈھکوسلہ یا دقیانوسیت سے تعبیر کرتے ہوئے محض موج و مستی کو ترجیح دیتی ہے۔ اور یہی ہے وہ "دجالی" تہذیب یا شیطانی کلچر جسے آج مغرب مشرقی قوموں پر مسلط کرنا اور عالم انسانی کو حیوانیت کی آخری سرحدوں تک لے جانا چاہتا ہے چونکہ موجودہ گئے گزرے دور میں بھی مشرقی قوموں اور خاص کر مسلم ممالک میں اخلاقی اقدار بہت بڑی حد تک محفوظ ہیں اسلئے مغرب چاہتا ہے کہ مشرقی ممالک میں بھی اخلاقی بگاڑ پیدا کر کے "حساب" برابر کر دیا جائے اس دجالی تہذیب کا سب سے بڑا مرکز آج امریکہ ہے جو نوع انسانی کو طرح طرح کے فتنوں میں مبتلا کرنے کے درپے ہے۔ چنانچہ اسکے ایک ہاتھ میں "جنت" ہے تو دوسرے ہاتھ میں "دوزخ" اور وہ اپنے "فرمانبرداروں" کو جنت میں داخل کرتا ہے تو "نافرمانوں" کو دوزخ کی ہوا کھلاتا ہے۔ یعنی انہیں بے موت مرواتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اسکی جنت حقیقتاً دوزخ اور اس کی دوزخ حقیقتاً جنت ہے۔

اس اعتبار سے احادیث میں دجال کی جو نشانیاں بتائی گئی ہیں ان میں سے اکثر آج اس شیطانی ملک پر صادق آتی ہیں۔ لہٰذا راقم السطور کی نظر میں دجال غالباً کوئی شخصی وجود نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی "مغربی تہذیب" ہی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم

تاریخ کا ایک سبق:

حاصل یہ کہ تاریخ عالم نے موجودہ دور تک اس قسم کی متعدد "عالمگیر" تحریکوں کا نظارہ کیا ہے جیسا کہ رومی 'برطانوی' اور روسی سامراجوں نے اپنے اپنے دور میں بالکل اسی طرز کی تحریکیں چلائی تھیں جس طرح کہ آج امریکہ چلا رہا ہے۔ مگر اس نے پچھلی تحریکوں اور ان کی ناکامیوں سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جو ملک طاقت کے نشے میں ہوتا ہے وہ پچھلے واقعات سے عبرت حاصل نہیں کرتا بلکہ انہیں خاطر میں بھی نہیں لاتا۔ برطانیہ وہ ملک ہے جس کی سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا چنانچہ اس نے اپنی پوری رعایا کو ذہنی اعتبار سے "انگریز" بنانے کی کوشش کی مگر اسے صرف جزوی کامیابی ہی حاصل ہو سکی اسی طرح روسی سامراج نے اپنے دور میں پوری دنیا کو "سرخ" رنگ میں رنگ دینے کی غرض سے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔

اسی طرح امریکہ کی موجودہ تحریک بھی جلد یا بدیر ایک داستان پارینہ بن کر رہ جائے گی پھر عالم انسانی دنیا کی تمام تحریکوں کا نظارہ کرنے اور ہر ایک کو آزما لینے کے بعد اسلام کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائے گا کیونکہ یہ ایک ایسی تحریک ہے جو فحاشی و بے حیائی کا خاتمہ کر کے نوع انسانی کو روحانی سکون

واطمینان دے سکتی اور ظلم وعدوان کو مٹا سکتی ہے مگر اس کے لئے اسلام پسندوں کو سخت محنت کرنی پڑے گی کیونکہ یہ معرکہ اتنا آسان نہیں ہے بلکہ اب دین ومذہب کے علمبرداروں پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس شیطانی تہذیب اور شہوانی کلچر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں اور امت کو اس کے سنگین خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے عالم انسانی کو اس کے چنگل سے چھڑانے کی تدبیریں سوچیں کیونکہ موجودہ دور میں "خیر امت" ہونے کی حیثیت سے مسلمان ہی الحاد و مادیت کا مقابلہ کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور یہ اہل اسلام کا ایک دینی وشرعی فریضہ ہے، جسے ہر حالت میں ادا کرنا ضروری ہے

اقوام مغرب کی ڈارونیت :

غرض مغرب یہ سارا کھیل آج اپنی معاشی وسیاسی برتری کی بنیاد پر کھیلنا چاہتا ہے تاکہ غیر ترقی یافتہ ممالک اور خاص کر عالم اسلام سر نہ اٹھا سکے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس وقت اس کے پاس جو سائنس اور ٹیکنالوجی ہے اسکے بل بوتے پر وہ دنیا کی تمام قوموں اور ان کی تہذیبوں پر غالب آسکتا ہے بلکہ انہیں جدھر چاہے گھما سکتا ہے۔

اس اعتبار سے آج مغربی قومیں ہیگل، ڈارون اور کارل مارکس کے فلسفوں پر عمل کر رہی ہیں یعنی طاقتور قومیں کمزوروں کا خاتمہ کردیں۔ چنانچہ ڈارون کے "تنازع للبقاء" کو اساس بنا کر کارل مارکس نے کمیونزم کی بنیاد رکھی تھی اور اب درپردہ مغربی قومیں بھی یہی سب کچھ کر رہی ہیں۔ اس اعتبار سے مغربی تہذیب ڈارونی تہذیب ہے جو آج تنازع لبقاء میں یقین رکھتے ہوئے سارے عالم کو روندنا چاہتی ہے کیونکہ اس کی نظر میں یہ دنیا ہی سب کچھ ہے۔ کسی برتر ہستی کے سامنے جوابدہی کا اس کے نزدیک کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ کی ایک سنت :

مگر اللہ تعالیٰ کا ایک ابدی قانون ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ وہ دنیا میں ظالم اور نافرمان قوموں کو کچھ عرصے تک مہلت دیتا ہے مگر جب ان کی سرکشی حد سے بڑھ جاتی ہے تو پھر ان پر خدا کا عذاب مختلف اسباب وذرائع کے تحت اور بالکل دبے پاؤں آتا ہے جس میں آہٹ تک نہیں ہوتی۔ اور پھر ایسی جبار وقہار قوموں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے :

"کیا ان لوگوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے والوں کا انجام کیا ہوا؟ وہ لوگ (تعداد میں) ان سے زیادہ اور بڑی قوت والے تھے جو زمین پر اپنے شاندار آثار چھوڑ گئے مگر ان کے کرتوتوں نے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا"۔ (مومن : ۸۲)

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی، انڈیا

اکیسویں صدی میں اسلامی قیادت کا سنگین بحران

اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ حضرت خالد بن ولیدؓ سے منسوب ہے۔ عیسائیوں سے ایک جنگ کے موقع پر ان کے ساتھی نے انہیں یہ خبر دی کہ ایک لاکھ عیسائی سپاہی اور آگئے ہیں اس موقعہ پر حضرت خالد بن ولیدؓ نے فرمایا کہ اگر میرے گھوڑے ابرہہ کے سم ٹھیک ہوتے تو میں کہتا اتنے ہی اور لے آؤ۔ دراصل عالم اسلام کا مسئلہ نہ وسائل کا ہے، نہ تعداد کا مسئلہ صرف اور صرف ایک ہے یعنی مضبوط ایمان والے افراد کا

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ بڑے بڑے ملک ان کے زیر حکمرانی ہیں ان کے احکامات کی پابندی کی جاتی ہے لیکن اکثر خدا اور رسول کے باغی ہیں شریعت اسلامی سے انہوں نے منہ موڑ رکھا ہے انہوں نے اپنی ضرورت کے مطابق اسلام کا جدید ایڈیشن تیار کرلیا ان کے گھر ان کے خاندان میں ان کی اولاد تک کا اسلام سے اگر کوئی تعلق ہے تو رسمی یا مصالحتی اسلام نے جو تاریخی کردار ادا کیا وہ کسی مخصوص طبقہ یا برادری علاقہ تک محدود نہیں تھا۔ اس نے جس معاشرہ کی طرح ڈالی اس میں معاشی اور اقتصادی مسائل کو بیک سیٹ پر رکھا۔ ایمان اور اسلامی شریعت کو ڈرائیونگ سیٹ پر رکھا۔

جدید دور نے صورت حال پلٹ دی ہے اب سارا زور معاشیات پر ہے انسان ہزار خرابیوں کے ساتھ اگر معاشی اعتبار سے مستحکم ہے تو وہ کامیاب سمجھا جاتا ہے، لیکن اسلامی تاریخ اس کی نفی کرتی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے صرف نظر کرلیا جائے مسئلہ یہ ہے کہ ترجیحی بنیاد پر پہلی اہمیت کس کی ہو اور اس کے بعد کس کو دی جائے۔ ایمان بظاہر ایک مختصر لفظ ہے لیکن یہ پوری زندگی پر حاوی ہے۔ پوری زندگی کھونٹے پر گھومتی ہے زندگی کی آخری سانس تک کوئی اس کے تقاضوں یا حدود سے اپنے کو جدا نہیں کرسکتا۔ خواہ وہ سربراہ مملکت ہو یا ادنیٰ درجہ کا خادم تاجر ہو یا کاشتکار، مزدور ہو یا کارخانہ دار، طبقہ علماً ہو یا مدارس کے طلباً جدید تعلیم کے پیرہن ہوں یا ٹیکنالوجی اور سائنس کے ماہرین، ہر ایک براہ راست ایمان کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کا پابند ہے۔

مسلم ممالک کا ان کے سربراہوں کا یا دولتمندوں عوام وخواص یہاں تک کہ علماً اور دینی حلقوں

کا جائزہ لیا جائے تو پوری بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ حقیقت کیا ہے اور پانی کہاں سے گر رہا ہے۔

اسلام سے انکار کسی کو نہیں' ایمان پر سب قائم ہونے کے مدعی ہیں۔ لیکن عملی زندگی اس سے بالکل مختلف ہے۔ دینی حلقے جنہیں دین پڑھنے اور سمجھنے کا زیادہ موقعہ ملا وہ بنیادی سے زیادہ فروعی اختلاف میں نہ صرف خود باہم دست وگریبان ہیں بلکہ عوام وخواص کے درمیان بھی خلیج پیدا کردی ہے اسلام سے زیادہ مسلکی امور پر زور دیا جانے لگا ہے۔

اس کے نتیجہ میں مصنوعی حصار قائم ہو گئے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں جہاں اسلامی یکجہتی کا سبق پڑھایا جانا چاہیے۔ وہاں بھی تفریق کا سبق پڑھایا جارہا ہے۔ ایک عقیدہ کے باوجود آپس میں فاصلے قائم رکھنے کی تلقین کی جارہی ہے۔ اس سے ملت سیسہ پلائی دیوار کے تصور سے بھی ناآشنا ہے۔ ایک مسلم ملک دوسرے مسلم ملک کیلئے اجنبی ہے۔ اس کا پورا فائدہ غیر خاص طور پر بڑی طاقتیں اٹھا رہی ہیں۔ وہ اندرونی طور پر نئی نئی پالیسیوں کے جال میں انہیں پھسلا دیتی ہیں۔ حکمرانوں سے جب عوام بدگمان ہو کر ان کے مخالف ہو جاتے ہیں تو حکمران پھر انہی بڑی طاقتوں کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں اس آواگون نے تمام مسلم ممالک میں اور دنیا کے دوسرے بہت سے ملکوں میں بھی عدم استحکام پیدا کر رکھا ہے

قیادت کے بحران میں تین اہم بنیادی فیکٹرس ہیں نظام تعلیم جو ایمان کی حقیقت سے محروم ہے خود اعتمادی کی کمی۔ اپنے وسائل سے پورا فائدہ نہ اٹھانے کی عدم صلاحیت غیر ملکی طاقتوں کی محتاجی کوئی بھی قیادت اگر اس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے تو وہ مستقل بحران کا شکار رہے گی۔ جو حکومت یا قیادت مسلسل بحران میں مبتلا رہے گی وہ نہ اپنے مسائل حل کر سکتی ہے اور نہ دوسروں کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتی ہے۔

اکیسویں صدی میں قیادت کا بحران تمام تر داخلی ہے خارجی کم۔ اندرونی طور پر جبتک تعلیم کے چار محاذوں پر بحیثیت مجموعی یکساں توجہ اور سرمایہ کاری نہیں کی جاتی اس بحران سے نکلنا مشکل ہے۔

عمومی و عوامی تعلیم' دینی مدارس' لڑکیوں کی تعلیم عصری اور جدید تعلیم' مربوط طریقہ پر اسلام سے وابستگی اور جدید تقاضوں کا پورا لحاظ رکھ کر اگر یہ کام کرلیا جائے تو ہر سطح پر استحکام یقینی ہے بڑی سے بڑی سازش بھی اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ہر کام تناسب چاہتا ہے کسی ایک محاذ پر پوری قوت جھونک دینے سے بھی مسائل حل ہونے والے نہیں اور نہ پیوندکاری سے کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ دنیائے اسلام جن مشکلات کا شکار ہے اس کے بنیادی اسباب پر توجہ کئے بغیر منزل مقصود تک رسائی مشکل ہے۔

حضرت علامہ ڈاکٹر اسرار احمد
امیر تنظیم اسلامی پاکستان

اکیسویں صدی کیا اسلام کی صدی ثابت ہو گی ؟

ہم سورہ بقرہ کی آیت ۶۱ میں وارد شدہ الفاظ "ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی۔ اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!" کو پڑھتے ہوئے اطمینان سے گزر جاتے ہیں اسلئے کہ یہ الفاظ یہودیوں کے بارے میں وارد ہوئے ہیں لیکن اگر موجودہ حالات کا معروضی مطالعہ کیا جائے تو اس وقت ان الفاظ قرآنی کا مصداق کامل مسلمان ہیں نہ کہ یہود! یہودی اس وقت پوری دنیا میں کل تیرہ ملین یعنی لگ بھگ سوا کروڑ ہیں جبکہ مسلمانوں کی تعداد کم از کم تیرہ سو ملین یعنی ایک ارب تیس کروڑ ہے۔ گویا مسلمان یہودیوں سے تعداد میں سو گنا زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود اس وقت کرہ ارضی کی سیاسی قسمت بالفعل یہود کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری کیفیت اس وقت بالکل وہی ہے جس کا نقشہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ایک حدیث مبارک (رواہ احمدؒ وابوداؤدؒ عن ثوبان) میں کھینچا تھا کہ

"مجھے اندیشہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ نہایت کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود تمہاری حیثیت سیلاب کے ریلے کے اوپر جھاگ سے زیادہ نہیں رہے گی"۔

مغرب ہو یا مشرق، اس وقت ساری دنیا میں مسلمان شدید ترین مصائب و آلام سے دوچار ہیں۔ اور سوا ارب سے زیادہ افراد پر مشتمل عالمی ملت اسلامیہ اس وقت بالفعل

ع کہ غیرت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

کا نقشہ پیش کر رہی ہے تو سوچئے کہ الفاظ قرآنی "ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے" کے مصداق اس وقت ہم نام نہاد مسلمان ہیں، یا یہود؟ لیکن یہ حقیقت بھی بیان کر دینی ضروری ہے کہ موجودہ صورت حال مستقل نہیں عارضی ہے اور مستقبل میں بالکل برعکس ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں قوموں اور امتوں کے عروج و زوال کے جو اصول اور عذاب الہی کا جو فلسفہ بیان ہوا ہے اور اس پر مستزاد احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں قرب قیامت کے جو حالات وواقعات اور یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کے مابین آخری آویزش اور معرکہ آرائی کے ضمن میں جو پیشین گوئیاں وارد ہوئی ہیں انکے مطابق یہود پر بہت جلد "عذاب استیصال" یعنی جڑ سے اکھیڑ پھینکنے والا

عذاب نازل ہوگا اور وہ "عظیم تر اسرائیل" جسکے خواب وہ عرصے سے دیکھ رہے ہیں اگرچہ ایک بار قائم تو ہو جائے گا لیکن بالآخر وہی انکا عظیم تر اجتماعی قبرستان بنے گا۔ دوسری جانب پورے کرۂ ارضی پر بالآخر امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حکومت قائم ہوگی اور اللہ کے دین کا بول بالا ہوگا۔ لیکن

"مسلم اتی سینہ راز آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار"

کے مطابق اس آخری امید سے اپنے سینے کو آباد رکھنے کے ساتھ ساتھ دو اسباب کی بنا پر لازم ہے کہ ہم ان سوالات کے جواب قرآن کے فلسفہ و حکمت کی روشنی میں تلاش کریں کہ اسوقت ۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

کے مصداق کامل ہم مسلمان ہی کیوں بن گئے ہیں اور اسکا کیا سبب ہے کہ ۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اس لئے کہ ایک عام سادہ لوح مسلمان کی سوچ تو لامحالہ یہ ہے کہ ہم خواہ افعال و اعمال اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے کتنی ہی پستی میں گر چکے ہوں، بہر حال کلمہ گو اور خاتم النبیین اور سید المرسلین حضرت محمدؐ کے امتی ہیں اور "توحید کی امانت" کے حامل اور "ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست!" کے کسی نہ کسی درجہ میں مدعی ہیں جبکہ یہود و نصاریٰ اور بقیہ جملہ اقوام عالم کھلم کھلا کافر و مشرک اور اللہ اور رسولؐ کی صاف منکر و مخالف ہیں اور قرآن میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ "اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا" لہذا ضروری ہے کہ موجودہ صورت حال کے اسباب اور قرآن کے فلسفہ عذاب کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تاکہ سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۰ یعنی "اور جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث ہوتی ہے اور اللہ بہت سی کوتاہیوں سے تو درگزر بھی کرتا رہتا ہے" کے مطابق یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ یہ حالات و کیفیات

ع اے باد صبا ایں ہمہ آوردہ تست

کے مصداق ہماری اپنی بے عملی ہی نہیں بداعمالی کا نتیجہ ہیں۔ قرآن حکیم کی مختلف آیات کو جمع اور مرتب کر کے ان کی پشت پر کارفرما حکمت سمیت بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ:

(۱) یہ دنیا بنیادی طور پر دارالعذاب نہیں، دارالامتحان ہے اور جزاو سزا کا معاملہ اصلاً دنیا سے نہیں آخرت سے متعلق ہے۔ جیسے کہ فرمایا گیا سورۂ ملک کی آیت ۲ میں کہ:

"اس نے بنائی موت اور زندگی تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سے اچھے عمل کرنے والا"

اصل محاسبہ ہر انسان کا خالص انفرادی حیثیت میں ہوگا جیسے کہ فرمایا سورۂ مریم کی آیت ۹۵ میں کہ "ان میں سے ہر شخص قیامت کے دن اللہ کے حضور پیش ہوگا فرداً فرداً"

گویا انفرادی سطح پر کسی انسان پر جو مصیبتیں حیات دنیوی کے دوران نازل ہوتی ہیں عذاب یا سزا کے طور پر نہیں۔

(۲)　البتہ قوموں اور امتوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی اجتماعی غلط روی اور مجموعی بد اعمالی کی سزا اکثر و بیشتر اس دنیا ہی میں دے دی جاتی ہے۔ اس اجتماعی عذاب کا تلخ ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں گیہوں کیساتھ گھن بھی پس جاتا ہے جیسے فرمایا سورۂ انفال کی آیت ۲۵ میں کہ :

"اور ڈرو اس وبال سے جو تم میں سے صرف ظالموں ہی کو لاحق نہیں ہوگا۔ اور جان رکھو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے"

اگرچہ ان لوگوں کے بچنے کی امید کی جاسکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ خود بدی سے اجتناب کرتے رہیں بلکہ اپنی قوم کو غلط روش اور اللہ کی معیصت اور نافرمانی سے روکنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کردیں جیسے کہ سورۂ اعراف میں اصحاب السبت پر نازل ہونے والے عذاب کے ضمن میں فرمایا

"اور ہم نے بچالیا ان لوگوں کو جو بدی سے روکتے رہتے تھے" (آیت ۱۶۵)

(۳)　قوموں اور امتوں پر دنیا میں نازل ہونے والے عذاب کی بدترین اور شدید ترین صورت وہ ہے جس سے وہ قومیں دوچار ہوئیں جن کی جانب اللہ نے اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور انہوں نے ان پر اپنی دعوت و تبلیغ میں سعی بلیغ فرما کر اور حق کی قولی و عملی شہادت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھ کر اتمام حجت کا حق ادا کردیا۔ اسکے باوجود ان کی قوموں نے بحیثیت مجموعی ان کی دعوت کو رد کردیا اور حق کی راہ اختیار نہ کی۔

(۴)　قوموں اور امتوں پر بحیثیت اجتماعی اس دنیا ہی میں نازل ہونے والے عذاب الٰہی کی دوسری قسم وہ ہے جو رسولوں کی امتوں پر ان کی غلط روی اور بد اعمالی کے باعث نازل ہوتا ہے۔ یہ عذاب اس اعتبار سے تو ہلکا ہوتا ہے کہ اسکے ذریعے قوموں یا امتوں کا بالکل خاتمہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس اعتبار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے کہ یہ وقفہ وقفہ سے مسلسل آتا رہتا ہے۔

اس نوع کے اجتماعی عذاب میں مبتلا ہونے والی اقوام یا امتوں کا ایک وصف مشترک، جسے قسمت کی ستم ظریفی ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہے کہ وہ اس زعم میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہم تو اللہ کے بہت چہیتے اور لاڈلے ہیں' اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اس جہل مرکب میں مبتلا قوم پر جیسے جیسے عذاب الٰہی

کے کوڑوں کی شدت بڑھتی جاتی ہے اسکے متذکرہ بالا زعم میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسکی کلاسیکل مثال ہے سابقہ امت مسلمہ یعنی یہود اور نصاریٰ کا یہ قول جو سورۂ مائدہ کی آیت ۱۸ میں نقل ہوا کہ :

"ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں اور اسکے نہایت چہیتے اور لاڈلے!"

جس پر اللہ تعالیٰ نے نہایت عبرت انگیز تبصرہ فرمایا :

"اے نبیؐ ان سے کہیے کہ پھر اللہ تم پر تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں نازل فرماتا رہا ہے؟ تمہارے اس زعم کے برعکس تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے دوسرے جو اللہ نے پیدا فرمائے!"

اسی طرح ان کا ایک مزعومہ عقیدہ یہ بھی تھا کہ

"ہمیں تو (جہنم کی) آگ چھو ہی نہیں سکتی سوائے گنتی کے چند دنوں کے!"

جس پر نہایت فصیح و بلیغ تبصرہ وارد ہوا :

"اے نبیؐ ان سے پوچھئے کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے جس کے بارے میں تمہیں وثوق ہے کہ اللہ ہرگز اپنے اس عہد کی خلاف ورزی نہیں کریگا؟ یا تم بغیر کسی علم کے اللہ کی جانب غلط باتیں منسوب کر رہے ہو؟" (سورۂ بقرہ : ۸۰)

اس نوع کے اجتماعی عذاب کے بارے میں یہ قاعدہ کلیہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ ؎

جن کے رتبے ہیں سوا
ان کی سزا مشکل ہے

کے مطابق کسی امت کو جس قدر بلند درجہ فضیلت حاصل ہوتا ہے اسکے غلط طرز عمل پر عذاب کی شدت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔

(۵) مندرجہ ذیل مباحث سے یہ نتیجہ از خود بر آمد ہو جاتا ہے کہ جو قوم نہ کسی رسول کی امت ہونے کی مدعی ہو نہ ہی اس کی جانب اس کی یاداشت اور معلوم و محفوظ تاریخ کی حد تک کوئی رسول مبعوث ہوا ہو اس کے عذاب و ثواب اور جزا و سزا کا سارا معاملہ آخرت سے متعلق ہے۔ دنیا کی حد تک تو ان پر صرف سپنگلر کے فلسفۂ تاریخ کے مطابق اس قانون طبعی ہی کا اطلاق ہوگا کہ جیسے ہر فرد پیدا ہوتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے، پھر بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے ایسے ہی قومیں اور تہذیبیں بھی مختلف طبعی ادوار سے گزر کر بالآخر ختم ہو جاتی ہیں۔ رہا حیات اخروی اور یوم قیامت کے محاسبہ کا معاملہ تو وہ تو ہر فرد نوع بشر کا اپنے اپنے نظریات و عقائد اور اخلاق و اعمال کے اعتبار سے طے ہونا ہی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ دنیا میں جو رسول مبعوث ہوئے ان کی کل تعداد کتنی ہے، وہ آسمانی کتابیں جن کے ذریعے نوع انسانی کو شریعت خداوندی عطا ہوئی دو ہی ہیں یعنی اولاً تورات جو بنی اسرائیل کیلئے ہدایت قرار دی گئی (سورۂ بنی

اسرائیل آیت ۲ اور سورۂ سجدہ آیت ۲۳) اور ثانیاً قرآن حکیم جو پوری نوع انسانی کیلئے ہدایت ہی نہیں "الھدیٰ" قرار دیا، چنانچہ صاحبِ کتاب و شریعت مسلمان امتیں بھی پوری تاریخ انسانی کے دوران دو ہی ہوئی ہیں یعنی:

ایک سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل اور دوسری موجودہ امت مسلمہ یعنی امت محمدیہ ﷺ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور چونکہ اس وقت دنیا کے حالات تیزی کے ساتھ جو رخ اختیار کر رہے ہیں اور مستقبل میں جو حوادث و واقعات پیش آنے والے ہیں ان کے ضمن میں ان دونوں امتوں کی باہمی آویزش اور ان کے آخری انجام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس قانون عذاب کو فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل ہے لہذا ان دونوں کے بعض مشترک اور بعض مابہ الامتیاز خصائص کے علاوہ ان کے ماضی اور حال کا مختصر جائزہ ضروری ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کا آغاز اگرچہ ویسے تو لگ بھگ ۱۸۰۰ قبل مسیح علیہ السلام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے سے ہوتا ہے اس لئے کہ انہی کا لقب اسرائیل یعنی "اللہ کا بندہ" تھا اور بنی اسرائیل ان ہی کی اولاد ہیں، لیکن ان کو امت مسلمہ کی حیثیت تقریباً ۱۴۵۰ ق م میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حاصل ہوئی جب انہیں تورات عطا ہوئی۔ اس وقت سے لے کر ساتویں صدی عیسوی کے آغاز تک جب خاتم النبیین اور سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی، گویا لگ بھگ دو ہزار برس تک، بنی اسرائیل ہی کو اس دنیا میں کتاب الٰہی کی امین اور شریعت خداوندی کی حامل امت مسلمہ کی حیثیت حاصل رہی۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت تمام سابق انبیاء و رسل کے مانند صرف اپنی اپنی قوموں کی جانب نہیں، بلکہ پوری نوع انسانی کی جانب ہوئی جیسے کہ فرمایا سورۂ سبا کی آیت ۲۸ میں کہ

"ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کیلئے بشیر اور نذیر بنا کر"

لہذا آپ کی امت گویا اجتماعی طور پر تا قیام قیامت فریضہ رسالت کی امین بھی ہے، یعنی اس کی ذمہ داری سابقہ امت مسلمہ کی طرح صرف یہ نہیں ہے کہ خود کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامے رہے اور شریعت خداوندی پر سختی سے کاربند رہے بلکہ یہ بھی ہے کہ پوری نوع انسانی تک رسالت محمدی ﷺ کے پیغام کو پہنچانے کا حق ادا کرنے اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کے غلبے یعنی عالمی سطح پر حکومت الٰہیہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کے قیام کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ اس لئے کہ یہی ازروئے قرآن نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت ہے۔ جیسے کہ قرآن حکیم میں تین بار فرمایا گیا

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الھدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق دے کر تاکہ غالب کریں اسے (دین حق کو) پورے کے پورے دین (نظام زندگی) پر" (سورۂ توبہ آیت ۳۳،

سورۂ فتح آیت ۲۸ اور سورۂ صف آیت ۹) سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کے مابین ایک اور فرق وتفاوت یہ ہے کہ جہاں سابقہ امت مسلمہ ایک "یک نسلی امت" تھی وہاں چونکہ آنحضور ﷺ کی بعثت پوری نوع انسانی کی جانب ہے لہذا موجودہ امت مسلمہ ہمہ نسلی اور وہمہ قومی (ملٹی نیشنل) امت ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے دوران معزول شدہ اور موجودہ مسلم امتوں یعنی یہودیوں اور مسلمانوں دونوں پر اللہ کے عذاب کا وہ سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ بعض اعتبارات سے شدید تر ہو گیا جو یہودیوں کے معاملے میں تو لگ بھگ دو ہزار برس سے جاری تھا اور مسلمانوں کے معاملے میں بھی کئی صدیوں سے چلا آرہا تھا، لیکن دوسری جانب ان دونوں ہی امتوں میں ایک احیائی عمل بھی شروع ہوا اور دونوں ہی بعض اعتبارات سے تیزی کیساتھ ترقی اور عروج کی جانب بڑھتی نظر آئیں۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون عذاب کے مطابق یہودی اب سے لگ بھگ دو ہزار سال قبل عذاب استیصال کے مستحق ہو چکے تھے۔ اسلئے حضرت مسیح علیہ السلام انکی جانب رسول کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے، لیکن یہودیوں نے نہ صرف یہ کہ ان کا انکار کیا بلکہ اپنے بس پڑتے انہیں سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا تاہم ایک خاص حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس آخری سزا کی تنفیذ کو مئوخر رکھا۔ بیسویں صدی عیسویں میں ایک جانب سابقہ اور معزول شدہ امت مسلمہ یعنی یہودیوں پر اللہ کے آخری عذاب استیصال کا ریہرسل یا ٹریلر بھی "ہالوکاسٹ" کی صورت میں سامنے آگیا اور دوسری طرف فلسطین میں قدم جمانے سے ان کے اس آخری عروج کی جانب بھی نمایاں پیش قدمی ہو گئی جس کا کوئی سان گمان بھی ایک صدی قبل نہیں ہو سکتا۔

یہی معاملہ موجودہ امت مسلمہ کے ساتھ پیش آیا کہ جہاں ایک جانب اس صدی کے آغاز میں سلطنت عثمانیہ اور خلافت اسلامی کے خاتمے، اور پھر ۱۹۶۷ء میں عربوں کی عبرتناک ہزیمت اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی اور ۱۹۷۱ء میں "آخرین" کے اہم ترین اور عظیم ترین ملک یعنی پاکستان کی شکست در شکست اور ان ہندوؤں کے ہاتھوں شرمناک ہزیمت کی صورت میں عذاب الٰہی کے سائے مزید گہرے ہو گئے جن پر مسلمانوں نے سینکڑوں برس حکومت کی تھی، وہاں دوسری جانب یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ پورے عالم اسلام میں ایک احیائی عمل شروع ہو گیا اس احیائی عمل کے متعدد گوشے ہیں، جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرپیکار ہیں۔ اور جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کیلئے باعث تقویت ہیں۔

دوسرے یہ ہیں کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور ملت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل

ہونے والا نہیں بلکہ سورۂ الانشقاق کی آیت ۱۹ "تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ" کے مصداق تدریجاً بہت سے مراتب و مراحل سے گزر کر ہی پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے بقول علامہ اقبال ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس وسیع احیائی عمل کی پنہائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے۔ برصغیر پاک و ہند کو پورے عالم اسلام میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے اس کی وجہ بھی بادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی جامع شخصیت گزشتہ تین سو سالوں کے دوران میں پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کی توجہ علم دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث کی جانب منعطف کرانے کیساتھ ساتھ فکر اسلامی کی تدوین نو کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں دین اور رجال دین کی ساکھ از سر نو مضبوط ہو گئی۔ برصغیر میں اس سلسلے میں ایک اہم مقام اور مرتبہ دیوبندی مکتب فکر کو حاصل ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے "فکر" کا وارث ضرور ہے۔ وہ جماعتیں اور تنظیمیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں مختلف مسلمان ممالک میں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں لیکن انکی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہستیوں کی ہے۔ ان جماعتوں میں اگرچہ ایک دور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر و نفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی الاخوان المسلمون توجہات اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برصغیر ہند و پاک ہی کو حاصل ہے۔

اس امر سے قطع نظر کہ ان تحریکوں کی نصف صدی سے زائد کی مساعی کا حاصل کیا ہے اور پالیسی اور طریق کار کے بارے میں اختلافات کے سبب سے یہ کتنی شاخوں میں تقسیم ہوئی ہیں۔ یہ امر مسلم ہے کہ یہ تحریکیں مجموعی اعتبار سے عالم اسلام میں احیاء اسلام کی امنگ کا مظہر ہیں اور اب عالمی سطح پر انہیں ایک امر واقعی کی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے۔ مستقبل قریب میں جو عظیم واقعات و حوادث رونما ہونے والے ہیں ان کی تہہ میں اصلاً ان ہی دو امتوں کی آخری آویزش کار فرما ہو گی۔ اگرچہ اس میں بظاہر زیادہ اہم اور نمایاں کردار ایک تیسری امت ادا کرے گی۔ جو ابراہیمی (علیہ السلام) مذاہب کے "ثالث ثلاثہ" یعنی تین میں سے تیسرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ "ثالث ثلاثہ" کے الفاظ قرآن حکیم میں

سورہ مائدہ کی آیت ۷۳ میں عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث کے ضمن میں وارد ہوئے ہیں۔ عیسائیت تعداد نفوس کے اعتبار سے تو ابراہیمی (علیہ السلام) مذاہب میں سب سے بڑا مذہب ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمی (علیہ السلام) مذاہب کی جانب اس کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام یا زیادہ سے زیادہ ان کی ذات اور شخصیت کی حد تک محدود ہے ورنہ عقائد و نظریات کے اعتبار سے موجودہ عیسائیت ایک بالکل جدا مذہب ہے جس کا شمار "فلسفیانہ مذاہب" میں ہونا چاہیے نہ کہ "آسمانی مذاہب" میں اور جس کی اصل نسبت سینٹ پال کی جانب ہونی چاہیے نہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب۔ بہر حال ہمارے موضوع کے اعتبار سے اس مذہب کے نام لیواؤں کا اہم ترین رول یہ ہے کہ دونوں اصل ابراہیمی (علیہ السلام) امتوں پر عذاب الٰہی کے دوسرے دور میں سزا کے کوڑے بالفعل ان ہی کے ہاتھوں پڑتے رہے ہیں۔ یہودیوں کیلئے سولہ سو برس تک اور مسلمانوں کیلئے ایک ہزار برس سے عیسائیوں نے عذاب کے کوڑے کا کردار ادا کیا ہے اگرچہ بیسویں صدی عیسوی کے دوران یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین تعلقات کی نوعیت میں تو ایک انقلاب عظیم رونما ہو چکا ہے جسکے نتیجے میں اب مسیحی دنیا بالخصوص "واسپ" یعنی "وہائٹ اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹس" یہودیوں کے بظاہر معاون و محافظ اور مددگار اور سرپرست اور بباطن

ع فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود سے ہے

کے مطابق زیر نگیں اور حاشیہ بردار بن چکے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے معاملے میں ان کا سابقہ کردار پوری طرح برقرار ہے اور "ترسم کہ دگر خیزد" کے مصداق اندیشہ ہے کہ عنقریب مغرب کی عیسائی اقوام کی ایک عظیم یلغار "حتی اذا فتحت یا جوج وماجوج" (سورۃ انبیاء آیت ۹۶) کی سی شان کیساتھ عالم اسلام بالخصوص شرق اوسط پر ہونیوالی ہے، جسکی صریح پیشینگوئیاں احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں موجود ہیں اور جسکی ایک ادنیٰ جھلک دنیا نے خلیج کی جنگ کے دوران دیکھ بھی لی ہے۔

اس وقت دنیا کی کل انسانی آبادی چھ ارب کے لگ بھگ ہے اس میں سے نصف سے زائد آبادی تین ابراہیمی (علیہ السلام) مذاہب کی پیروکار ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں میں سب سے بڑی تعداد ہندوؤں کی ہے پھر بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ایں دم تک دین برحق اسلام ہی رہا ہے۔ اور دنیا کے باقی جملہ مذاہب آسمانی ہدایت اور انبیاء اور رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات ہی کی محرف اور تبدیل شدہ صورتیں ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر کی صورتیں اتنی بدل چکی ہیں کہ اب بقول جگر مراد آبادی:

ع کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

البتہ صرف دو مذہب وہ ہیں جن کا اصل "اسلام" کیساتھ تعلق اور تسلسل کم از کم تاریخی اعتبار

سے ثابت ہے یعنی یہودیت اور نصرانیت۔ ان میں سے بھی اصل مسلمان امتیں دو ہی ہیں، یعنی سابقہ امت مسلمہ بنی اسرائیل اور موجودہ امت مسلمہ یا مسلمان۔ اور آئندہ اصل اور فیصلہ کن معرکہ تو ان ہی کے مابین ہو گا لیکن مستقبل قریب میں ابتدأً نمایاں کردار ادا کریں گے ابراہیمی (علیہ السلام) مذاہب کے "تین میں کے تیسرے "مذہب کے پیروکار یعنی عیسائی۔

جہاں تک اسلام کے عالمی غلبے کا تعلق ہے، اگرچہ اسکی کوئی قطعی نص تو (کم از کم راقم کے علم کی حد تک) قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے۔ تاہم منطق کے اس قضیئے کے صغریٰ اور کبریٰ دونوں قرآن مجید میں بہ تکرار و اعادہ وارد ہوئے ہیں جس کا لازمی نتیجہ دین حق کا عالمی غلبہ ہے۔ رہیں احادیث نبویہؐ تو ان میں تو یہ خبر نہایت وضاحت اور صراحت کے ساتھ دی گئی ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ اب جہاں تک ان عظیم حوادث و واقعات کا تعلق ہے جو اسلام کے عالمی غلبہ سے قبل پیش آنے والے ہیں یعنی ایک عظیم اور نہایت ہولناک اور تباہ کن جنگ، دجال کا خروج، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، اور ان کے ہاتھوں دجال کا قتل اور یہودیوں کا استیصال، تو اس سلسلے کی پہلی کڑی یعنی ایسی ہولناک اور تباہ کن جنگ جس کا میدان مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک بنیں گے اب بالکل نوشتہ دیوار کی مانند سامنے کی بات ہے۔

مسلمانوں کے لئے کیسے کیسے سخت مراحل اور صبر آزما امتحانات آنے والے ہیں اور ان کے جلو میں تباہی، ہلاکت اور خون ریزی کے کیسے کیسے طوفان اٹھنے والے ہیں ہمیں بالعموم یہ کہہ کر تھپکی اور لوری دے دی جاتی ہے کہ بس اب پندرھویں ہجری صدی (اکیسویں صدی عیسوی) غلبہ اسلام کی صدی ہے اور روشن مستقبل ہمارا منتظر ہے اور ہم خوش ہو جاتے ہیں اور ان "امانی" سے بہل جاتے ہیں اور ہمیں ان فرائض کا احساس نہیں ہوتا جو اعلائے کلمۃ اللہ، احقاق حق، ابطال باطل، اور غلبہ دین متین کی سعی و جہد کے ضمن میں ہر کلمہ گو کے ذمے ہیں۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

مولانا محمد عیسیٰ منصوری
چیئرمین ورلڈ اسلامک فورم (لندن)

مغرب کا فکری چیلنج اور علماء کرام کی ذمہ داری

موجودہ دور میں یوں تو عالم اسلام کو بے شمار مسائل درپیش ہیں مگر غور کیا جائے تو ان تمام مسائل کی جڑ اور اصل ہدف ایک ہے اور ہے مسلمانوں کا فکری طور پر مغرب سے مغلوب ہو جانا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب گزشتہ دو صدیوں سے پوری دنیا پر نظریاتی و فکری طور پر حاوی و غالب ہو چکا ہے فکری و نظریاتی غلبہ نے اسے عالمی طور پر سیاسی، تہذیبی، فکری ہی نہیں بلکہ ہر نوع کا غلبہ و سربلندی عطا کر دیا ہے۔ چونکہ انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی مسائل اور ان کے حل کے لئے اولین اساس و بنیاد اس کا نظریہ و فکر ہی ہوتا ہے یعنی وہ کسی نظریہ سے اپنے مسائل کو دیکھتا اور ان کا حل چاہتا ہے۔ خدا پرستی کی راہ سے یا مادہ پرستی کی راہ سے اگر وہ خدا، آخرت اور رسالت کا قائل ہے تو اس کا ذہن مسائل کو ایک خاص زاویے سے دیکھے گا جسے ہم ایمانی زاویہ کہہ سکتے ہیں، اور وہ اپنے تمام مسائل کا حل اسی عقیدے اور ایمان کی روشنی میں دریافت کرے گا۔ اور اگر وہ ظاہری آنکھوں سے نظر آنے والی اس مادی دنیا کے ماورئی کسی حقیقت کا قائل نہیں تو اس کی سوچ و فکر اور مسائل کے حل کا راستہ بالکل علیحدہ ہوگا موجودہ دور میں اس کا نام سیکولر طرز فکر ہے بیسویں صدی کا مغرب جس نظریہ و فکر کا علمبردار ہے اور اس کا پرجوش داعی ہے وہ یہی مادی نظریہ و فکر ہے جس کی بنیاد خدا و آخرت فراموشی پر ہے مغرب کے اس فکر و نظریہ کی جڑیں اس کی تاریخ کلچر و تمدن میں پیوست ہیں۔

یورپ کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں کے عوام ہزار ہا سال سے ظلم و قہر کی چکی میں پسے جاتے رہے۔ ان کا استحصال کرنے میں یہاں کے حکمرانوں اور مذہبی طبقہ میں شراکت داری رہی۔ یورپ کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ دونوں طبقے ہمیشہ عوام کے استحصال میں شامل رہے سولہویں صدی عیسوی میں جب یہاں کے عوام بیدار ہونا شروع ہوئے اور یہاں علم و سائنس کا دور شروع ہوا تو مغرب کے ظالمانہ استحصالی نظام کے یہ ان دونوں شراکت دار یعنی حکمران اور مذہبی رہنما اسے اپنے مفادات کے خلاف سمجھ کر علم و سائنس کی مخالفت میں کمربستہ ہو گئے اور انہوں نے ظلم و جبر اور لرزہ خیز مظالم کے ذریعہ علم و سائنس کی راہ روکنی چاہی اس کے لئے انہوں نے احتساب کی عدالتیں قائم کیں اور خالصتاً علمی و سائنسی

نظریات کی بناء پر تیس ہزار انسانوں کو زندہ جلایا گیا اور تین لاکھ کے قریب علم و تحقیق کے متوالوں کو اذیت ناک سزائیں دی گئیں۔ یورپ میں مذہب و سائنس کی یہ خونریز کشمکش تقریباً چار سو سال تک جاری رہی بالآخر علم اور سائنس کو فتح ہوئی اور مذہب نے شکست کھائی اس کشمکش میں مذہبی گروہ یعنی مقدس پوپ اور پادریوں کا رول انتہائی گھناؤنا بدبختانہ اور علم دشمنی کا رہا انہوں نے عوام کے بجائے شہنشاہوں اور جاگیرداروں کا اور علم کے بجائے جہالت کا ساتھ دیا مذہبی طبقہ اس ناعاقبت اندیشانہ رویہ کی وجہ سے یورپ کے عوام کے دلوں میں حکمرانوں اور جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ نفس مذہب کے خلاف بھی نفرت و بغض جاگزیں ہو گیا۔ چرچ کے یہ وہی مظالم ہیں جن کی معافی آج پوپ مغربی عوام سے مانگ رہے ہیں اس طویل کشمکش کے نتیجہ میں مذہب کو سائنس اور علم کے مقابل جو ہزیمت و شکست اٹھانی پڑی اس نے مذہب کے متعلق نقطہ نظر یکسر تبدیل کر دیا اب مغرب میں یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ مذہب انسان کا نجی (پرائیویٹ) معاملہ ہے اور اس کا دائرہ کار محض عقائد اور عبادات تک محدود ہے۔ یعنی نجی طور پر انسان جو چاہے عقیدہ رکھے اور جس طرح چاہے پوجا پاٹ کرے۔ مذہب کی عملداری چرچ تک محدود کر دی گئی اور یہ طے کر دیا گیا کہ چرچ کے باہر انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی مسائل و معاملات سب عقل سے طے ہوں گے خواہ وہ سیاسی، معاشی، تعلیمی، معاشرتی، تمدنی ہوں یا نظم و نسق و قانون سے متعلق ہوں مذہب کو ان میں مداخلت کی اجازت نہیں مذہب کو زندگی کے اہم اور اجتماعی مسائل سے بے دخل کر دینے کی اس فکر کا نام سیکولرازم ہے جس پر تقریباً گزشتہ چار سو سال سے مغرب گامزن ہے بیسویں صدی میں عالمی بساط پر بھی مذہب کو زندگی کے عملی مسائل سے بے دخل کرنے کے بعد مغرب نے اپنی اس سیکولر فکر کو پوری دنیا میں بالادستی جاری کرنے کو اپنا ہدف اور نصب العین بنالیا ہے کیونکہ دنیا میں سیکولر فکر کے حاوی کرنے کے پس پردہ مغرب کو باقی دنیا پر فکری بالادستی کے ساتھ اسے علمی، سیاسی، معاشی غلبہ از خود حاصل ہو جاتا ہے فکری غلبہ اقوام عالم کے دل و دماغ پر کنٹرول کا سب سے آسان اور بے خطا نسخہ ہے اسے مغرب نے دنیا بھر میں سیکولر فکر اور اپنے تمدن کے نفاذ کو انا کا مسئلہ بنالیا ہے جس طرح ایک مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی کرتا ہے اور محمد رسول اللہؐ کے بعد اب دنیائے انسانیت کی دنیوی واخروی فلاح صرف آپؐ کی اتباع میں ہے اور ایک مسلمان کی زندگی کا بنیادی مقصد ہی اسلام کے اس فکر و نظریہ (توحید رسالت) کو غالب و حاوی کرنا ہے بالکل اسی طرح مغرب اپنے سیکولر نظریہ و فکر کو ایک نظام زندگی ہی نہیں بلکہ مقصود قرار دیتا ہے اس کا دعوی ہے کہ انسانی فلاح وبہبود کے لئے عقل انسانی جو بہت بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ نظام وضع کر سکتی تھی وہ مغرب نے سیکولر فکر اور نظام حیات کی صورت میں دنیا کو پیش

کر دیا ہے۔ اب سیکولرزم کے ذریعہ انسانی عقل اور فکر کی تکمیل ہو گئی ہے لہذا اب دنیا کی تقدیر سیکولرزم سے وابستہ ہے دنیا کی جو قوم یا ملک مغرب کے پیش کردہ اس نظام فکر وحیات سے گریز کرے گا مغرب کا اس کے ساتھ اعلان جہاد ہے اور مغرب اس سے دنیا میں باعزت جینے کا حق بھی چھین لے گا۔

آپ پڑھ آئے ہیں کہ مغرب کے اس فکر و نظریہ کی بنیاد مذہب دشمنی پر رکھی گئی ہے' اس لئے مذہب سے بغض وعداوت گویا اس فکر کے خمیر میں داخل ہے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد وقتی طور پر مغرب کا ایک اور حریف میدان میں آگیا تھا وہ تھا کارل مارکس کا معاشی نظریہ' یہ فکر نہ صرف سیاسی ومعاشی طور پر مغربی نظامِ فکر کی حریف تھی بلکہ دنیا پر تسلط وغلبہ حاصل کرنے کی دوڑ میں بھی مغرب ومغربیت کا دعویدار حریف بن گیا تھا اور اس کی زد براہ راست مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام پر پڑتی تھی۔ اس لئے دوسری جنگ عظیم کے بعد وقتی طور پر بظاہر روس اور اس کا نظریہ اشتراکیت مغرب کا اصل حریف نظر آنے لگا تھا مگر روس کی شکست وریخت اور کیمونزم کے فلسفے کی ناکامی کے ساتھ ساتھ اب مغرب کا واحد حریف اسلام رہ گیا ہے۔ چنانچہ گزشتہ دنوں مغرب کی متحدہ فوجی کمان نیٹو کے سربراہ سے ایک صحافی نے جب پوچھا کہ کیمونسٹ بلاک (وارسا پیکٹ ممالک) کی شکست کے بعد اب نیٹو کی کیا ضرورت ہے تو اس نے بے ساختہ کہا ابھی اسلام باقی ہے۔ گزشتہ صدیوں کے تجربات کے نتیجہ میں مغرب اس حقیقت کو پا گیا ہے کہ مذاہب عالم میں سے صرف اسلام ہی سے اس کے نظام فکر اور تمدن کو خطرہ لاحق ہے اس لئے مغربی سیاست دان وحکمران ہی نہیں مغرب کے مفکرین دانشور و اسکالرز شعوری طور پر اپنے نظام فکر وتمدن کے تحفظ کے لئے اسلام کے خلاف طبل جنگ بجا چکے ہیں دوسری جانب مسلمانوں کے حکمرانوں اور دانشوروں کو چھوڑیئے علماء کرام اس فکر جنگ کا کماحقہ ادراک نہیں رکھتے بلکہ وہ اب تک اپنی ناواقفیت وسادگی سے سیکولر فکر کو بحیثیت اسلام کے مقابل ومتصادم نظریہ فکر سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اپنی سادگی سے اس فکر کے سیاسی پہلو یعنی ڈیماکریسی کو عین اسلام قرار دینے لگے ہیں اسلام کا سیاسی نظام بھی شورائی خلافت کے الفاظ تک ان کی زبان وقلم سے غائب ہو گئے ہیں۔ اب طبقہ علماء کا مطالبہ بھی اپنے اپنے ممالک میں مغربی جمہوریت کی بحالی کا ہے جبکہ مغربی ڈیماکریسی اور اسلام کا سیاسی نظام (شورائی خلافت) ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں دوسرے میں خداوند تعالیٰ' ایک میں قانون سازی کے جملہ اختیارات عوام کو حاصل ہیں دوسرے میں اللہ تعالیٰ کو۔

ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہر دور کا ایک علم کلام اور اسلوب ہوتا ہے وقت اور زمانہ کے ساتھ ساتھ طرز کلام اور تعبیر میں تبدیلی آتی رہتی ہے آج سے چودہ سو سال پہلے دور نبوت میں

فکر و نظریہ کے الفاظ مستعمل نہیں تھے بلکہ اس دور میں اس کو ایمان (عقیدہ) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کرامؓ کی زندگی کا مشن و مقصد ہی انسانوں کے عقیدہ و ایمان کی تبدیلی تھا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو آپ کی دعوت و جہاد کا مقصد انسانوں کا عقیدہ و فکر تبدیل کرنا تھا ان کے دلوں میں توحید و رسالت کے بنیادی عقیدہ کو پیوست کرنا تھا ان دونوں عقیدوں یا نظریات کو نہایت جامع طور پر کلمہ شہادت میں سمو دیا گیا ہے اس وقت جب کوئی انسان کلمہ شہادت کا اقرار کر کے ان دونوں بنیادی عقائد کو تسلیم کر لیتا تو اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی میں ایک عظیم فکری انقلاب رونما ہو جاتا اور وہ اپنی زندگی کے تمام تر مسائل کا حل اس کلمہ کی روشنی اور اس کی حدود کے اندر تلاش کرتا خواہ وہ مسائل سیاست سے تعلق رکھتے ہوں یا معاشیات سے وہ مسائل معاشرتی ہوں یا سماجی' ملکی ہوں یا بین الاقوامی غرض وہ اپنی حیات کے ہر ہر مسئلہ میں کلمہ شہادت کے اس بنیادی عقیدہ و فکر کے تابع رہ کر حل اور راہ عمل کا متلاشی ہوتا یہی نہیں کلمہ پڑھتے ہی اس کی انفرادی زندگی اس کا لباس' معاشرت' رہن سہن گفتگو و کلام تک اس بنیادی فکر (توحید و رسالت) کے تابع ہو جاتا پھر کسی مسئلہ میں اسے یہ یاد دلانے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ اس میں اس کے نظریہ (کلمہ شہادت) کی کیا رہنمائی و مطالبہ ہے بلکہ خود بخود یہ توحید و رسالت کا عقیدہ زندگی کے ہر مسئلہ میں اس کا رہنما بن جاتا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ جن جن علاقوں اور ملکوں کو فتح کرنے گئے وہاں کے لوگوں کے کلمہ کا اقرار کر لینے کے ساتھ ہی خود بخود ان کی زبان' رہن سہن' لباس' اخلاق و عادات ہی نہیں ان کی تجارت' معاشی نظام سیاست و تمدنی سب کچھ اس بنیادی فکر و نظریہ کے تابع ہو جاتا جس کا اقرار انہوں نے کلمہ شہادت میں کیا تھا اس لئے کہ وہ عقیدہ و نظریہ ہی کیا ہوا جب، زندگی اور اس کے تمام شعبے اس کی گرفت میں نہ آئیں مگر موجودہ دور میں شعوری طور پر اس فکر کا ادراک نہ کر سکنے کی وجہ سے مسلمان توحید و رسالت کے عقیدے کا اقرار بھی کرتا ہے اور اپنی زندگی مغرب کے نظام فکر اور تمدن کے تحت بھی گزارتا ہے اور اس کے دل میں ذرہ برابر کھٹک پیدا نہیں ہوتی کہ اس کی زندگی سے اس کے بنیادی عقیدہ و فکر کی تسلی تو نہیں ہو رہی؟ بلکہ وہ اپنے عقیدہ و ایمان کو زندگی کے تمام معاملات سے معرا و بے تعلق محض ایک مذہبی عقیدہ سمجھتا ہے جس طرح دنیا میں انسان بے شمار علمی و سائنسی حقائق کو مانتا ہے جیسے خلائی سیاروں کا وجود زمین کا گردش کرنا مگر ان حقائق کو تسلیم کرنے کے نتیجے میں اسکی زندگی پر ذرہ برابر اثر نہیں پڑتا کیونکہ اس کا یہ ماننا مجرد حقائق کا علم ہے نہ کہ بنیادی نظریہ حیات جبکہ خدا کی وحدانیت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا ماننا حقائق کا مجرد علم نہیں بلکہ فکر و نظر کا وہ بنیادی زاویہ ہے جس پر انسانی حیات کے تمام شعبوں کے رخ کے متعین ہونے کا مدار ہے اگر یہ فکر (عقیدہ توحید و رسالت) اس کی زندگی کے تمام شعبوں پر اثر انداز نہیں تو حقیقتاً اسکا ایمان و عقیدہ غیر معتبر

ہے یہ ایسا ہی ہے گویا اس نے نہ توحید کا اقرار کیا نہ رسالت کو تسلیم کیا جیسے قرآن حکیم نے اعلان فرمایا کہ

فلا وربك لا يومنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا فى انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما (النساء)

پس آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کو اپنے تنازعات میں حکم تسلیم نہ کرلیں پھر اپنے دلوں میں آپ کے فیصلوں پر کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور انہیں پوری طرح تسلیم کریں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مغرب گزشتہ کئی صدیوں سے بھرپور تیاری کر کے علمی و فکری، سیاسی و معاشی، تمدنی و معاشرتی غرض ہر محاذ پر تیاری کر کے اسلام پر حملہ آور ہو چکا ہے اور اس نے ساری دنیا میں اسلام کے خلاف سیاسی و عسکری ہی نہیں فکری و نظریاتی اور تمدنی جنگ چھیڑ دی ہے اس نے اسلام کے خلاف علمی طور پر تحقیقات و دلائل کے کوہ ہمالیہ کھڑے کر دیئے ہیں اسلام کے نظام فکر ہی نہیں بلکہ معاشرت و تمدن کے تمام شعبوں کو چیلنج کر رکھا ہے۔ جدید سائنس الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ پوری انسانیت کے دل و دماغ میں اسلام اور اسلام کے عطا کردہ عقائد افکار اور نظام حیات کے خلاف نفرت و تکدر بھر دیا ہے وہ کبھی عورتوں کے حقوق کے حوالے سے کبھی انسانی حقوق کے حوالے سے کبھی جہاد اور نظام خلافت کے حوالے سے اسلام پر یلغار و حملہ تیز کرتا جا رہا ہے تاکہ اسلام کا نام لینا دہشت گردی، انسانیت دشمنی اور جرم و گناہ کے مترادف بنا دیا جائے مغرب کی یہ ساری جدوجہد اور تگ و دو اس لئے ہے کہ وہ اسلام کے نظریہ و فکر کی طاقت سے خوفزدہ ہے وہ خوب سمجھتا ہے کہ اسلام ایک فطرت اور انسانی طبائع کے عین موافق نظام حیات ہے جو اپنے اندر زبردست طاقت اور کشش رکھتا ہے اور نظریہ کو کاٹنے والی کوئی تلوار اب تک وجود میں نہ آسکی اسے خوف ہے کہ اگر اسلام اپنی صحیح حیثیت میں دنیا کے سامنے آگیا تو انسانی ضمیر و طبائع اسے ماننے پر خود کو مجبور پائیں گے اور کیمونزم کی طرح مغربی سرمایہ دارانہ نظام کی غیر فطری عمارت ریت کی دیوار کی طرح زمین بوس ہو جائے گی اس حقیقی اندیشہ کے پیش نظر مغربی ذرائع ابلاغ دن رات اسلام دشمنی کے ایک قطبی محاذ پر سرگرم عمل ہیں اور یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ اپنی جدوجہد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہے اس نے نہ صرف اقوام عالم کے ذہن و فکر پر بلکہ خود مسلمانوں کے فعال و سرکردہ طبقات جو کسی معاشرے کی کریم سمجھے جا سکتے ہیں اور جو بہت کچھ کرنے کی پوزیشن رکھتے ہیں یعنی ان کے حکمران، افواج، دانشور، اسکالر اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے اور انکو سیکولرزم، ڈیماکریسی، اوپن مارکیٹ اکانومی اور مغربی تہذیب و تمدن قائم کرنے کی ڈیوٹی و اہداف دے کر نہایت عیاری سے علماء کرام اور مذہبی طبقہ کے ساتھ محاذ آراء کر دیا ہے

اب عالم اسلام میں صورت حال یہ ہے کہ مسلمان حکمران' افواج سیاست دان ان کے دانشوار' اسکالر اور تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کو زک پہنچانے اسے اجتماعی شعبوں سے بے دخل کرنے اور سیکولر کے وسیع مفہوم کے مطابق مذہب کو مسجد تک محدود کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔ ہر مسلم ملک و معاشرے کے یہ موثر و فعال اور ذی اقتدار طبقات اسلام کے عملی نفاذ کو اپنے ملک و قوم کی بدبختی و تباہی سمجھنے لگے ہیں یہ لوگ خود کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور مسلم معاشرہ اور نظام حیات کے اجتماعی شعبوں سے اسلام کے اثرات کو کھرچ پھینکنے اور مذہبی جماعتوں کو کچلنے میں اپنی اور اپنے ملک و معاشرہ کی بقاء و ترقی بھی سمجھتے ہیں ان کے ذہن پر مغربی افکار و نظریات اس طرح حاوی ہو چکے ہیں اور ان کے رگ و ریشہ میں مغربی تہذیب و معاشرت اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اسلام کو اس دور میں ناقابل عمل اور خلاف عقل نظام سمجھنے لگے ہیں وہ اقرار کرتے ہیں کہ اسلام ایک اچھا مذہب ہے اور اس نے کسی زمانہ میں اچھا رول ادا کیا بہت سی معاشرتی خرابیوں اور برائیوں کو ختم کیا مگر اب اسلام کا رول ختم ہو چکا ہے موجودہ جدید ترقی یافتہ ماڈرن دور میں اسلام ناقابل عمل ہے آج اسلام میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا انسانی معاشرہ اور ترقی و تمدن کو یوٹرن کرنا اور اسے پیچھے پہنچانا ہے اسلام کے متعلق ہمارے ذی اقتدار طبقات اور نئی نسل کے اس منفی ذہن بننے کی بڑی وجہ مذہبی طبقہ کا اجتماعی مسائل سے بے تعلق ہو جانا اور عصری ضرورتوں اور مسائل کا صحیح ادراک اور ان کا حل پیش کرنے سے قاصر رہنا ہے اور اسلام کو ایک زندہ نظریہ حیات کے بجائے محض عقائد و عبادات اور رسوم کے مجموعہ کے طور پر پیش کرنا ہے ہماری مذہبی درس گاہوں میں صدیوں سے انسانی زندگی کے اجتماعی شعبوں اقتصادیات سیاست وغیرہ وغیرہ پر ریسرچ و تحقیق بحث و تمحیص اور علمی و فکری کام کا بند ہو جانا ہے۔

یہ ذمہ داری وارثانِ علوم نبوت کی تھی کہ ہر دور کے فکری و نظریاتی حملوں اور مغالطوں کا بروقت جواب دیتے مگر ہمارے علمی مراکز میں اب تک قرن اولی کے نظریاتی فرقوں کا رد ہو رہا ہے جن کا ہزار بارہ سو سال سے دنیا میں کوئی حقیقی وجود ہی نہیں یا وہ ہزار ہا سال قدیم و فرسودہ یونانی علوم و فلسفوں کے رد یا ان کی تشریح و تعبیر میں مگن ہیں انہیں عصر حاضر کے درپیش علمی و فکری مسائل پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں طبقہ علماء کے عصری افکار و نظریات سے ناواقفیت کی وجہ سے ان کے صحیح مقام و منزلت کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ کیونکہ وہ ہم عصر اقوام کے مزاج و نفسیات ان کے نظریات و فکر اور ان کی جانب سے علمی و فکری حملوں اور ان کے اسلام کے خلاف عزائم و منصوبوں سے بڑی حد تک بے خبر رہتے ہیں۔ اکثر کی واقفیت اتنی سطحی ہوتی ہے جو فائدہ پہنچانے کی بجائے مزید نقصان کا باعث بنتی ہے۔ مفکر اسلام حضرت سید ابو الحسن علی ندویؒ نے ایک بار علماء کرام کے مجمع کو خطاب فرماتے ہوئے یہ تاریخی جملہ

ارشاد فرمایا:

"بسا اوقات سطحی واقفیت عدم واقفیت سے زیادہ خطرناک اور مضر رساں ہوتی ہے۔"

تاریخ اس بات کی شہادت پیش کرتی ہے کہ اس کائنات میں ہمیشہ صرف وہی اقوام اپنی حیثیت منوا سکی ہیں اور فکری و نظریاتی طور پر اقوام عالم کے اذہان پر اثرانداز ہو سکی ہیں جن کی نظر اس تغیر پذیر دنیا اور بدلتے ہوئے حالات اور زمانہ کے تقاضوں پر اور جن کا ہاتھ زمانہ کی نبض پر ہو جو انسانی اذہان کو مثبت و محکم فکر دے سکیں نہ کہ گزشتہ صدیوں کی معلومات اور اسلاف کی ذہنی و فکری کاوشوں کے نتائج فکر کی نقل ہی کو علم و فکر کی معراج سمجھ لیں اور اپنی کوتاہی فکر اور کوتاہی ہمت سے مغرب کے پیش کردہ نظاموں میں جزوی طور پر اسلام کا پیوند لگا کر اپنے فرض سے بری الذمہ ہونے کا سہل راستہ نکالنا چاہیں ایسوں کے لئے اس کارگاہ عالم میں زمانہ کی امامت و قیادت کی کوئی جگہ نہیں

چند سال پہلے بنگلہ دیش میں پارلیمانی الیکشن کے موقع پر وہاں کے چند علماء نے بھارت کے ممتاز عالم دین و اسکالر مولانا مجاہد الاسلام قاسمی سے سوال کیا کہ کیا عورت سربراہ مملکت بن سکتی ہے؟ مولانا قاسمی کا جواب تھا آپ کے ملک میں یہ الیکشن اسلام کے نظام خلافت قائم کرنے کیلئے منعقد ہو رہے ہیں یا مغربی ڈیماکراسی کے لئے۔ اگر مغربی جمہوریت کے لئے ہو رہے ہیں تو ڈیماکریسی میں مرد عورت، مسلمان کافر، نکوکار، فاسق حتی کہ قادیانی مرتد بھی سربراہ مملکت بن سکتا ہے۔ ہاں اگر الیکشن اسلامی نظام خلافت قائم کرنے کے لئے ہو رہے ہوں تب سربراہ مملکت کے لئے اسلام کی عائد کردہ شرائط دیکھی جائیں گی۔ اور ان میں ایک شرط مرد ہونا بھی ہے اس وقت آپ حضرات کا یہ سوال ہی بے محل ہے۔ انتخابات ہو رہے ہیں ملک میں مغربی ڈیماکریسی کے قیام کے لئے اور شرائط پوچھی جا رہی ہیں اسلام کے شورائی نظام خلافت کی راقم الحروف نے ایک بار بنگلہ دیش کے علمائے کرام کے مجمع سے عرض کیا تھوڑی دیر کے لئے تصور کیجئے کہ بنگلہ دیش کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں جہاں جہاں مسلمانوں کے سو گھر بستے ہوں سرور کائنات تشریف لے آئیں اور ملاحظہ فرمائیں کہ اس بستی کا نظام تعلیم سیکولر (لادینی) اور مالیاتی نظام اس بنیاد (سود) پر ہے کہ جس پر قرآن مجید نے اللہ و رسول سے اعلان جنگ کر رکھا ہے اور تمدنی نظام ان خطوط پر جو نئی نسل کو اسلامی تہذیب و قدروں سے دور اور کفر کے اقدار و کلچر سے قریب کرنے والا اور ذرائع ابلاغ (میڈیا) معاشرہ میں فحش و منکرات کو فروغ دینے والا ہو تو سرور کائناتؐ اس صورت حال کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت فرمائیں گے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو آپ حضرات کیسے وارثان انبیاء اور نائب رسول ہیں کہ یہ سب کچھ ۱۶ کروڑ کے مسلم ملک کے لئے ٹھنڈے پیٹ گوارا فرما رہے ہیں اور اپنی نیابت رسول کی ذمہ داری پوری کرنے پر مطمئن بھی ہیں یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ بنگلہ دیش میں

دینی مدارس کی بہتات ہے وہاں تقریباً ۳۵ لاکھ فارغ التحصیل علماء کرام بتائے جاتے ہیں مگر علمی صورت حال یہ ہے کہ پورا ملک مغربی فکرو کلچر کی دلدادہ۔ دو خواتین کے اشاروں پر رقصاں ہے اور قرآنی فکر کے حامل ۳۵ لاکھ علماء کرام کی معاشرہ پر گرفت نہ ہونے کے برابر ہے۔ حتی کہ پوری پارلیمنٹ میں ایک سیٹ بھی ان کی نہیں۔ کیا یہ صورت حال باعث فکرو تشویش نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس صورت حال کا اصل سبب یہی ہے کہ صدیوں سے ہمارا دینی نظام تعلیم زندگی کے اجتماعی شعبوں سے غیر متعلق ہے وہ صرف ایک شعبہ یعنی عبادات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے ہمارے پورے دینی نصاب و کورس کا ماحصل کتاب الطہارت سے کتاب الحج تک ہے اگر زیادہ زور مارا تو کتاب النکاح و طلاق بھی بحث و تحقیق سے پڑھ لیا جبکہ حدیث فقہ کی ہر کتاب میں اجتماعی زندگی کے تمام ابواب موجود ہیں کتاب البیوع، کتاب الاجارۃ، کتاب المضاربہ کتاب القاضی کتاب الجہاد وغیرہ وغیرہ اسی طرح معاشرت معاملات اور سیاست کے جملہ ابواب موجود ہیں۔ مگر ہم ان ابواب سے اس طرح گزر جاتے ہیں گویا یہ سب ابواب منسوخ ہو چکے ہوں ان پر بحث و تحقیق تو در کنار ٹھیک طور پر ان کا ترجمہ بھی نہیں ہوتا وہ معمولی فروعی مسائل جنکا حاصل اولیٰ غیر اولیٰ سے زیادہ نہیں۔ ان پر کئی کئی دن بحث ہوتی ہے لیکن جو ابواب فرد اور معاشرہ اور اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں اور جن پر اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا مدار ہے ہمارے طرز تعلیم نے انہیں عملاً معطل و منسوخ کر رکھا ہے جب تک ہمارے دینی و علمی اداروں میں یہ صورت حال برقرار رہے گی اسلام کو بحیثیت ایک نظام حیات اور جملہ انسانی مسائل کے حل کنندہ کے سمجھنے اور دنیا پر اسلام کے غلبہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے دنیا میں در حقیقت اولین غلبہ افکار و نظریات ہی کا ہوتا ہے پھر یہ فکر زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاؑ نے اصلاً اور بنیادی جدوجہد انسان کے نظریہ فکر (عقیدہ و ایمان) کی تبدیلی کے لئے ہی کی آنحضرتؐ کی حیات مبارکہ میں دس لاکھ مربع میل کے علاقہ پر دور فاروقی میں ۲۲ لاکھ مربع میل اور دور عثمانی میں ۲۴ لاکھ مربع میل پر اور دور معاویہ میں ۶۵ لاکھ مربع میل اسلام کا فکری و نظریاتی (توحید و رسالت) غلبہ قائم ہو گیا۔ اس کے بعد آپؐ کے نام لیواؤں نے تقریباً سات سو سال تک اس دور کی معلوم دنیا کے بڑے حصہ پر اسلام کا فکری و علمی غلبہ قائم رکھا اور تمام ملکی و بین الاقوامی مسائل اسلام کی عطا کردہ فکر کے تحت حل کئے۔ پھر آہستہ آہستہ ملت اسلامیہ میں فکری تنزل و ضعف شروع ہوا اس وقت مغرب میں علمی و سائنسی طور پر بیداری شروع ہوئی یہاں تک کہ سترہویں صدی عیسوی تک دنیا پر مغرب کا علمی و فکری غلبہ قائم ہو گیا اور اقوام عالم پر اس کی سیکولر فکر اثر انداز ہونے لگی اور اس نے دنیا کے ذہن و فکر پر تسلط حاصل کر لیا۔ بیسویں صدی تک پوری دنیا پر مغرب کا فکری و نظریاتی غلبہ مکمل ہو گیا۔ اب دنیا میں کوئی فکر عملی

طور پر مغرب کی فکر اور اس کے نظام حیات کو چیلنج کرنے والی نہیں رہی مغرب کے موجودہ فلسفہ حیات کی فکری بنیاد دین و سیاست کی علیحدگی پر ہے یہ فکر سراسر مادی فکر ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے

يعلمون ظاهر من حيوة الدنيا وهو بالآخرة هم غافلون۔

یعنی سطحی و ظاہر زندگی کی رونقوں کو جانتے ہیں اور (حقیقی دنیا) آخرت سے ناواقف ہیں اس وقت پورے عالم پر مغربی افکار کے غلبہ کا یہ عالم ہے کہ اسلامی ممالک کے حکمران، دانشور اور نئی نسل اللہ اور رسول کی بجائے فکری طور پر مغرب کے بن چکے ہیں ان کا دل و دماغ، جذبات و خیالات پسند و ناپسند سب کچھ مغرب کا تابع مطلق و اسیر بن گیا ہے الجزائر، مصر تیونس، اردن ترکی انڈونیشیا سب ہی مسلم ممالک میں مسلم عوام اور حکمرانوں میں جو کشمکش و جنگ جاری ہے وہ در حقیقت یہی فکری کشمکش یعنی اسلامی فکر اور مغربی فکر کا تصادم ہے۔ بیسویں صدی میں مغرب نے اقوام متحدہ پر تسلط و غلبہ کا طریقہ کار اور تکنیک تبدیل کر لیا ہے وہ اس حقیقت کو پا گیا ہے کہ موجودہ دور جسمانی غلامی کے بجائے ذہن و فکر کو غلام بنانے کا ہے اب عسکری طور پر ملکوں اور قوموں کو فتح کر کے نو آبادیاں قائم کرنا نہایت مہنگا، مشکل اور محنت طلب کام ہے وہ اس کے بجائے ملکوں اور قوموں کو فکری نظریاتی طور پر اور اس کے نتیجہ میں معاشی و تہذیبی طور پر غلام بناتا ہے موجودہ دور میں پوری دنیا پر مغرب کا تسلط و غلبہ اصلاً تو افکار و نظریات کی راہ سے ہے پھر اس فکر کے مختلف شعبہ تمام انسانی زندگی کو محیط ہو جاتے ہیں جیسے اس فکر کے سیاسی پہلو کا نام ڈیمار کریسی معاشی و تجارتی پہلو کا فری مارکیٹ اکانومی تمدنی پہلو کا ویسٹرن سولائیزیشن یعنی مغربی نظام تمدن و کلچر ہے مغرب کی اس فکر کا لب لباب اور حاصل انسانیت کو آسمانی وحی سے ہٹا کر عقل و خواہشات کی راہ پر ڈالنا ہے ایک چینی کہاوت ہے کہ مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے اسی طرح انسان کا بگاڑ دل کے بگاڑ سے شروع ہوتا ہے اور دل پر حکمرانی افکار و نظریات (عقائد) کی ہوتی ہے اس وقت کا سب سے بڑے چیلنج یہی ہے کہ مغرب پوری امت مسلمہ کے دل و دماغ جذبات و فکر پر حاوی ہو چکا ہے ہماری نئی نسل کے افکار و خیالات پر اس کا تسلط ہو چکا ہے مغرب کی اس ہمہ جہتی غلامی و تسلط سے نجات اور خلاصی کی صرف ایک راہ ہے وہ یہ کہ مغرب کو فکر و نظریات کے میدان میں شکست سے دوچار کر دیا جائے کہ اس کے افکار کی سطحیت کمزوری اور بودا پن اور اس کا انسانیت کے لئے مہلک و مضرت رساں ہونا پورے طور پر واضح کر دیا جائے اور اسلام و قرآن کے عطا کردہ نظریات و افکار کی برتری ان کا انسانیت کے لئے نفع بخش و مفید ہونا علمی و عقلی طور پر ثابت کر کے عصر حاضر کے ذرائع ابلاغ کو بروئے کار لا کر مغرب کے ہولناک مضرت رساں خود غرضانہ اور گمراہ کن سیاسی معاشی و تمدنی نظاموں اور اس کی دجالی و شیطانی فکر و سوچ کو سائنٹفک انداز میں واشگاف کیا جائے ظاہر ہے کہ یہ کام نہایت عرق ریزی سخت محنت اور محاورہ کی زبان

میں ہتڑ مارنے یا جگر کو پانی کرنے کا ہے جب تک ہم یہ اصل کام نہیں کریں گے پوری انسانیت بالخصوص ملت اسلامیہ مغرب کی ہمہ جہتی غلامی میں جکڑی رہے گی خواہ ملت کے ہر فرد کو رسمی طور پر فارغ التحصیل عالم دین بنادیں اسی طرح جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محض جدید علوم حاصل کرکے یا سائنس و ٹیکنالوجی اور جدید اسلحہ میں خود کفالت حاصل کرکے مغرب کی بالادستی و غلامی سے نجات و چھٹکارا مل جائے گا وہ بھی سخت غلطی پر ہیں کیونکہ اس وقت تمام جدید علوم سائنس و ٹیکنالوجی کی اساس خدا پرستی کی بجائے مادہ پرستی آخرت کے تصور کے بجائے دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنے بالفاظ دیگر وحی کی عطاکردہ روشنی کے بجائے خواہش و نفس پرستی کی ظلمتوں پر ہے جب جدید علوم اور سائنس و ٹیکنالوجی حاصل کرنے والوں کے دل و دماغ مغربی افکار و نظریات سے مسحور ہوں گے تو مغرب کے لئے ان کو واسطہ بنا کر دینی جماعتوں اور طبقہ علماء کو کچل کر ختم کرنا اور زیادہ سہل ہوگا اس کا مظاہرہ گزشتہ نصف صدی سے عالم اسلام کے نسبتاً ترقی یافتہ ملکوں میں مسلسل ہو رہا ہے اگر بغور جائزہ لیا جائے تو ترکی کے مصطفیٰ کمال اتاترک سے مسلم ممالک کے موجودہ حکمرانوں تک مسلمانوں کے جس ملک و قوم نے مغربی علوم و فنون میں جس قدر ترقی کی اسی کے بقدر وہاں دینی مذہبی اثرات کو ختم کرنا زیادہ آسان ثابت ہوا۔ ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جدید سائنسی و صنعتی علوم سے صرف نظر کیا جائے اور اس میں پچھڑ جانے کو برداشت کرلیا جائے بلکہ عالم اسلام کو جلد از جلد ان جدید علوم میں اپنی پسماندگی دور کرنی ہوگی مگر اس سے پہلے دل و دماغ کو مغربی افکار و نظریات کے سحر سے آزاد کرانا ہوگا ان تمام جدید علوم کی مثال ایک ہتھیار کی سی ہے ہتھیار کو استعمال بے شک ہاتھ ہی کرتے ہیں مگر ہاتھوں کو استعمال کرنے والا دل و دماغ ہوتا ہے اور دل و دماغ پر حکمرانی فکر و عقیدہ کی ہوتی ہے اس لئے موجودہ دور کا سب سے بڑا چیلنج اصلاً فکری و نظریاتی ہی ہے

جس طرح کسی درخت کے پھلنے پھولنے اور بار آور ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اسے مناسب زمین آب و ہوا اور پانی و کھاد میسر ہو اسی طرح مذہب کے لئے فکر و عقیدہ بمنزلہ زمین اور اس عقیدہ کے مطابق معاشرہ اور نظام تعلیم و تربیت اور کلچر و تمدن بمنزلہ آب و ہوا کے اور ذرائع ابلاغ بمنزلہ کھاد و پانی کے ہیں کہ آپ سمعی و بصری راستوں سے دل و دماغ کو کیا غذا فراہم کرتے ہیں اس لئے کہ اسلامی فکر و نظر، معاشرت و تمدن اور ذرائع ابلاغ کے صحیح استعمال کے بغیر اسلام کے غلبہ و سربلندی کی توقع رکھنا ایسا ہی ہے جیسے ببول کے درخت پر دعاؤں اور وعظ و تقریر سے آم لگانے کی امید کرنا مگر اسلام کے حوالے سے ہم سب اسی خود فریبی کا شکار ہیں۔

جناب ارشاد احمد حقانی
سینئر ایڈیٹر روزنامہ جنگ لاہور

جدید ملتِ اسلامیہ کا ظہور اور عالمی خلافت اسلامی کے قیام کے امکانات

امہ کو درپیش داخلی و خارجی چیلنجوں کا صحیح ادراک کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ ۲۱ ویں صدی کے آغاز پر ہم کہاں کھڑے ہیں اور ماضی کے مقابلے پر آج ہماری قوت اور ضعف کے عوامل کیا ہیں۔ ۱۹ ویں صدی کے آغاز پر عالم اسلام زوال اور انحطاط کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا تھا۔ 1798ء میں نیپولین نے مصر پر حملہ کیا اور 1799ء میں لارڈ ولزلے نے ٹیپو سلطان کو میسور میں شکست دی۔ یہ مسلمانوں کی سیاسی اور فوجی شکستوں کا نقطہ عروج تھا۔ 20 ویں صدی کے پہلے ربع میں زوال کا یہ عمل کئی قدم آگے بڑھ گیا۔ خلافت عثمانیہ رسمی طور پر ختم ہو گئی اور پہلی جنگ عظیم کے انجام نے خلافت عثمانیہ کی تقدیر پر شکست کی مہر ثبت کر دی۔ باقی کی مسلم دنیا چند پاکٹس کو چھوڑ کر یورپی اقوام کے کسی نہ کسی شکل کے تسلط کے تحت آچکی تھی اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مسلمان ممالک میں ایسے نئے طبقے ابھرے جو حکمران نو آبادیاتی قوتوں کی تخلیق اور ان کے خلاف تھے اور انہوں نے نو آبادیاتی طاقتوں کی زبانیں اور مغربی علوم سیکھنا شروع کر دیئے۔ یوں مسلمان معاشروں میں ایک نیا طبقہ پیدا ہوا جس کے ماخذ رہنمائی اسلامی کی بجائے مغربی تھے اور جس کی طاقت اور اقتدار اپنے عوام کی رضامندی اور حمایت کی بجائے نو آبادیاتی قوتوں کے براہ راست یا بالواسطہ مرہون منت تھے لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا میں حق خود ارادیت کی جو لہر آئی اس کے نتیجے میں بہت سے مسلمان ممالک بتدریج مغربی تسلط سے آزاد ہونا شروع ہو گئے۔ اب 21 ویں صدی کے آغاز پر صورت یہ ہے کہ دنیا میں 50 سے زیادہ آزاد مسلم ممالک ہیں لیکن ان میں سے بیشتر میں ایسی حکومتیں قائم ہیں اور ایسے حکمران طبقے غالب ہیں جو اپنے تسلسل اور وجود کے لئے اپنے عوام کی رضامندی اور انتخاب کے مرہون منت نہیں ہیں۔ ان کے اقتدار کی بنیادیں عوامی جواز یا امضاء (Popular Sanction) کے علاوہ کچھ اور ہیں۔ اس میں چند جزوی مستثنیات ضرور ہیں۔ میری دانست میں اکثر و بیشتر مسلمان ممالک کی یہی کمزوری ان کے داخلی نظاموں کی ناقابل رشک حالت کا ایک اہم سبب ہے۔ بیشتر مسلمان ممالک قانون کی حکمرانی آئین اور دستور کی

پابندی، آزاد عدلیہ، آزاد مقننہ، آزاد پریس، قومی مالیاتی وسائل پر عوامی کنٹرول اور جولبدہی کا نظام موجود نہیں۔ حصول آزادی کے بعد سے ان تمام ملکوں کو اپنی اپنی حیات اجتماعی کی نئی صورتگری کا چیلنج درپیش ہے اور اکثر مسلمان ریاستیں تاحال اس چیلنج کا کامیاب جواب دینے کے قابل نہیں ہو سکیں۔

ان میں سے اکثر ریاستیں تہہ در تہہ اور پیچ در پیچ عوامل کے باعث طاقتور مغرب کی خواہشات، ہدایات اور احکامات سے سرتابی کی حقیقی طاقت نہیں رکھتیں۔ یوں بھی مغرب کا علمی، تکنیکی، تہذیبی اور اقتصادی غلبہ اس قدر محیط ہے کہ مسلمان ریاستوں کا ان کے اثرات سے آزاد ہونا آسان نہیں۔ آج کی دنیا میں مسلمان معاشروں کی نئی صورتگری پر اثرانداز ہونے والے عوامل اور طبقات کا جائزہ لیا جائے تو حسب ذیل تین بڑے طبقات نظر آتے ہیں:

۱۔ علمأ جس سے میری مراد روایتی علمأ ہے۔

۲۔ ان ممالک کی اشرافیہ جو بالعموم مغربی افکار سے رہنمائی لیتی ہے اور اس کا نظام اقدار اسلامی اور مغربی عناصر پر مشتمل چوں چوں کا مربہ ہے۔

۳۔ ایسی اسلامی تحریکیں جو نہ تو پوری طرح علمأ اور ان کے فہم اسلام کے تابع ہیں اور نہ ان کے مآخذ رہنمائی کلی طور پر مغربی ہیں۔

اس وقت عالم اسلام میں ان تینوں طبقات کے درمیان مسابقت کی ایک دوڑ جاری ہے جو کئی حوالوں سے کشیدگی پیدا کرنے کا باعث بھی بن رہی ہے۔ مسلمان ملکوں کی سیاسی آزادی کے بعد جب انہیں اپنی اپنی حیات اجتماعی کی تشکیل نو کا چیلنج پیش آیا تو اسلامی سکالرز کا ایک نیا طبقہ ابھرا جو اپنی بساط بھر اسلام سے بھی واقف ہے اس نے اسلام کو پڑھا اور سمجھا ہے اور مغرب کے عمرانی علوم سے بھی نابلد نہیں ہے اس طبقے کے ظہور کا آغاز پرنٹنگ پریس کی ایجاد، قرآن و حدیث کے تراجم کے فروغ، مغربی تہذیب کے فکری اور عملی غلبے کے خلاف فکری اور علمی رد عمل کے نتیجے کے طور پر ہوا تھا۔ پچھلے پچاس ساٹھ سال میں اس طرح کے اسلامی سکالروں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے اور وہ درپیش مسائل اور چیلنجوں کا حل اپنے فہم و بصیرت کے مطابق پیش کر رہے ہیں۔

20ویں صدی کے وسط تک مغربی سکالروں کو شکایت تھی کہ اسلام پر جدید لغت اور محاورے میں تصنیف کردہ لٹریچر بہت کم دستیاب ہے اور اگر کوئی جدید تعلیم یافتہ مسلم یا غیر مسلم طالب علم یا سکالر معاصر دنیا کے حوالے سے اسلام کو سمجھنا چاہے تو اسے بہت کم مواد میسر آتا ہے جبکہ قدیم لٹریچر کو سمجھنا ان کے لئے آسان نہیں لیکن اس وقت حالت یہ ہے کہ ممتاز ترین مغربی سکالرز یہ محسوس کر رہے ہیں کہ علمی جرائد اور کتابی صورت میں اسلام پر اتنا نیا لٹریچر ہر عشرے میں بلکہ ہر سال میں تخلیق ہو رہا ہے کہ

اس کا ساتھ دینا مختی طالب علموں اور سکالروں کے لئے بھی آسان نہیں رہا۔ دنیا میں متعدد جرائد تو اسلامی موضوعات پر اظہار خیال کے لئے وقف ہیں جبکہ مغربی دنیا کے موقر اور وقیع اخبارات و جرائد میں بھی بڑی کثرت سے اسلامی علوم اور موضوعات پر چیزیں شائع ہو رہی ہیں۔ یہ ایک حوصلہ افزا علامت ہے جس سے ایک طرف یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ دور حاضر کے چیلنجوں کے پس منظر میں مسلم سکالرز بالخصوص اور غیر مسلم بالعموم مطالعہ و تحقیق اور تنقید و تدوین کا کام بہت بڑے پیمانے پر کر رہے ہیں۔ دوسری طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے بارے میں مغربی مفکرین اور مستشرقین (Orientalists) کے اذہان بھی فہم اسلام کے حوالے سے اب بند نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اسلامی تعلیمات کا بہت حد تک معروضی مطالعہ کرنے کی استعداد سے بہرہ ور ہیں۔ چند عشرے پہلے تک اس طرح کے ذہنی اور فکری رویے کا نہ صرف فقدان تھا بلکہ ایک معاندانہ اور غیر معروضی طرز فکر محیط تھا اسلام کے بارے میں اس نئی علمی روایت کے فروغ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ خود عالم اسلام کے اندر جدید و قدیم کے جامع سکالرز کا ایک بہت بڑا طبقہ روز افزوں ہے۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والے عشروں میں اس نئے طبقے کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوگا اور اس کا فہم اسلام اور اس کا نظام اقدار مسلمان معاشروں کی حیات اجتماعی کی صورت گری اور فکری نہج کے تعین میں ایک اہم بلکہ فیصلہ کن عامل بن جائے گا۔ اور روایتی علماً کے فہم اسلام کے متعدد اجزا غیر متعلق اور متروک ہو جانے سے بطور طبقہ ان کا اثر و رسوخ کم ہو جائے گا۔ جس طرح پچھلی صدیوں میں علمائے کرام کے افکار میں مختلف ملکوں اور طبقوں اور خطوں سے تعلق رکھنے کے باوجود فکر و اور توضیحات میں بھی ایک قسم کی یکسانیت اور مماثلت ابھر رہی ہے اور سیاست 'معیشت' انسانی حقوق' معاشرت' اخلاقیات کے حوالے سے ایک مشترک اور مماثل فہم اسلام وجود میں آ رہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی فہم اسلام امت مسلمہ کے مستقبل کی امید ہے۔ ملت اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کا جو عمل پچھلی صدی کے اوائل اور وسط میں شروع ہوا تھا وہ اب تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے اس عمل کی تکمیل میں مذکورہ عامل سب سے زیادہ فیصلہ کن کردار ادا کرے گا۔

اس عامل کے زیر اثر مسلمان معاشروں میں شدت پسند مذہبیت اور ظواہر پر غیر معمولی زور دینے کا رجحان کم ہو جائے گا جن مسلمان ملکوں میں نظام حکومت اور حیات اجتماعی کے تمام شعبوں کو تعلیمات اسلام کے تابع کرنے اور تشکیل دینے کی جدو جہد اس وقت ہو رہی ہے وہ بتدریج جمہوری طور طریقوں کا سہارا لینا شروع کر دے گی۔ تشدد اور تصادم کا راستہ ترک ہونا شروع ہو جائے گا جس سے خود ان تحریکوں کی اپنی سوچ میں ایک تبدیلی آئے گی اور وہ تبلیغ، تعلیم' تربیت اور رائے عامہ ہموار کر کے

مطلوبہ نتائج پیدا کرنے کی کوشش کریں گی۔ مغربی طرز فکر کے پیروکار حکمران طبقات اور اشرافیہ سے ان تحریکوں کی مسابقت مسلح محاذ آرائی کا راستہ اختیار نہیں کرے گی اور بلٹ کی بجائے بیلٹ کا سہارا لینے کا رجحان بڑھ جائے گا۔ جن مسلمان ملکوں میں بظاہر اس وقت حکمران افراد' خاندانوں اور طبقات کے خلاف نظر آنے والی کوئی جدوجہد موجود نہیں ہے وہاں یہ نظر آنا شروع ہو جائے گی اور نئی صدی کے وسط یا اس کے کچھ بعد تک پہنچتے پہنچتے عالم اسلام میں شاید ایک بھی شخصی یا خاندانی حکومت باقی نہ رہے۔ اس کے لئے تحریک اور رہنمائی وہ مسلمان دانشور اور اسکالر فراہم کریں گے جو بڑی تیزی سے مسلمان ممالک کا ایک قابل لحاظ طبقہ بنتے جا رہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ رواں صدی کے نصف آخر کا عالم اسلام بحیثیت مجموعی داخلی حوالوں سے آج کے عالم اسلام سے بدرجہا بہتر اور اسلام کی سیاسی' اقتصادی اور معاشرتی تعلیمات کے قریب تر ہو گا۔ جو حضرات یہ رائے رکھتے ہیں کہ عالم اسلام ہر حوالے سے بتدریج روبہ زوال ہے انہیں اپنی اس رائے پر نظر ثانی کر لینی چاہیے۔ عالم اسلام کے ہمہ جہتی احیا کا عمل گزشتہ پانچ سات عشروں سے شروع ہو چکا ہے اور اس کا بد ترین دور بتدریج تاریخ کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ عالم اسلام اس وقت بیداری کے ایک مرحلے سے گزر رہا ہے۔ مسلمان مفکرین اور دانشوروں اور مڈل کلاس اپنی موجودہ حالت سے سخت غیر مطمئن ہیں اور اسکو تبدیل کرنے کی شدید خواہش رکھتے ہیں اس خواہش کو آپ "احیائے آرزو" بھی کہہ سکتے ہیں اور ہر مثبت اور بڑی تبدیلی کا نقطۂ اول اور مرحلہ اول احیائے آرزو ہوتا ہے۔ احیائے آرزو کے اس عمل میں ابھی اور شدت اور گہرائی آئے گی اور اپنے اثرات مرتب کرے گی

عالم اسلام کے متعلق ایک اور عالم بھی غیر معمولی اہمیت اختیار کر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا کے متعدد مغربی معاشروں میں مسلمانوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ان معاشروں میں مسلمانوں کی اہمیت تمام شعبہ ہائے زندگی میں بتدریج بڑھے گی۔ مغربی ممالک میں وجود میں آنے والے مسلمان معاشرے اور ان کے افراد عالمی جسد اسلامی میں تازہ اور توانا خون کا کردار ادا کریں گے بلکہ اقبال کی تو یہ رائے بھی ہے کہ مستقبل کے مسلمان آئمہ فکر انہی نوزائیدہ مسلمان معاشروں سے ابھریں گے اور دور حاضر کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کیلئے امت کو جس غیر معمولی طاقتور اجتہادی قوت اور استعداد کی ضرورت ہے وہ غالباً یہیں سے بروئے کار آئے گی۔ ۲۱ویں صدی کے آخری عشروں میں مسلمان آبادی کے لحاظ سے عیسائیوں' ہندوؤں اور چینیوں تینوں سے آگے نکل جائیں گے اور دنیا کی کل آبادی کا چوتھائی حصہ بن جائیں گے۔ اکثر مسلمان معاشروں میں ۲۵ سال سے کم عمر کی آبادی کا تناسب ۶۰ فیصدی کے لگ بھگ یا اس سے بھی قدرے زیادہ ہے اور یہ نوجوان آبادی آنے والے عشروں میں ہمیشہ سے بڑھ کر موثر کردار ادا کرے گی۔

مغربی معاشروں میں جنم لینے والے نئے Mini یعنی چھوٹے مسلمان معاشروں اور امت مسلمہ کی نوجوان نسل کو میں عملاً "جدید امت مسلمہ" کا نام دیتا ہوں جو پرانی امت مسلمہ کے بطن سے جنم لے رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جدید امت مسلمہ ماضی سے مکمل فکری اور عملی انقطاع کی آئینہ دار نہیں ہے لیکن جوہری طور پر اس سے مختلف اور بہتر ہوگی۔ یہ آنے والے عشروں میں عالم اسلام کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوگی۔ امت مسلمہ کی نئی نسل علمی اور فنی لحاظ سے موجودہ نسل سے برتر ہوگی اور مغربی دینا میں مقیم مسلمان اقوام بالعموم اور ان کی نئی نسل بالخصوص مغربی علوم سے بھی بہرور ہوگی۔ ان پر عبور کی حامل ہوگی اور جوہری اسلامی تعلیمات سے انکا تعلق بھی محکم ہوگا۔ جو لوگ مغربی دنیا میں آباد اور مقیم مسلمانوں کی سوچ اور ان کے رجحانات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اپنے دین اور اپنی ثقافت سے ان کا تعلق روایتی مسلمان معاشروں میں مقیم لوگوں سے کسی طرح کم مضبوط نہیں ہے اس لئے اگر میری اصطلاح کے مطابق "جدید امت مسلمہ" ایک نئے عالم اسلام کی نقیب (Harbinger) اور پرچم بردار بن جائے تو کچھ عجب نہ ہوگا۔

اقبال کے الفاظ میں :

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

اقبال ہی کا ایک اور شعر :

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
نہیں ہے میری نظر سوئے کوفہ و بغداد

اقبال کی اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔

ایک تیسرا اور جدید عامل بھی قابل لحاظ ہے اگرچہ مغرب کا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا دنیا پر چھائے ہوئے ہیں لیکن انٹرنیٹ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دوسرے مظاہر نے میڈیا پر مغرب کی اجارہ داری توڑ دی ہے یا کم از کم اسے بہت کمزور کر دیا ہے۔ مسلمان دانشور اور مفکرین انٹرنیٹ کے ذریعے عالمی امور پر اپنا موقف اور نقطہ نظر روز افزوں دنیا تک پہنچانے کے قابل ہو گئے ہیں یوں اذہان کی جنگ (Battle of Minds) میں مسلمان دانشوروں کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار آگیا ہے جو ان کے زیادہ صائب اور محکم نظریات کو مسابقت کے میدان میں لانے کا ذریعہ بن رہا ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ یہ ذریعہ اسلامی افکار کی برتری کا وسیع ادراک پیدا کرنے کا باعث بن جائے۔ انٹرنیٹ کی طاقت مغربی عالمی نشریاتی اداروں سے کم نہیں۔ اگرچہ دونوں کا انداز کار مختلف ہے مگر انٹرنیٹ کی ایجاد سے پہلے مغرب کو جو

قریب قریب واک اوور حاصل تھا اب ویسا نہیں رہا۔ میری دانست میں ان تین عوامل نے عالم اسلام کے ضعف کے عوامل کا ایک حد تک توڑ کر دیا ہے۔

میں نے عالم اسلام میں جدید تعلیم یافتہ سکالروں کے ایک نئے طبقے کے ظہور کی طرف جو اشارہ کیا ہے اس نے بعض مسائل بھی پیدا کئے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ پیدا ہوا ہے کہ مسلمان معاشروں میں تعبیر اسلام کا اختیار کسے حاصل ہے پہلے اس میدان میں روایتی علماً کو اجارہ داری حاصل تھی وہ فیصلہ کرتے تھے کہ کسی پیش آمدہ مسئلے پر اسلام کی تعلیم اور اس کا حکم اور موقف کیا ہے۔ چند عشرے پہلے تک پیش آمدہ مسائل پر اسلام کی تعلیمات کی وضاحت کا اختیار کلی طور پر طبقہ علماً کے پاس تھا۔ مثلاً وہی فیصلہ کرتے تھے کہ کون سا لباس تعلیمات اسلام سے متصادم ہے یا نہیں' میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا جائز ہے یا نہیں' تصویر اتروانا حرام ہے یا مباح' مساجد میں بجلی کا استعمال' لاؤڈ سپیکر پر اذان اور جماعت و قرأت درست ہے یا نہیں۔ ان مسائل پر تو اب اختلاف بہت کم ہو گیا ہے لیکن سیاسی' اقتصادی' معاشرتی' تہذیبی اور اخلاقی دوائر میں علماً کی تعبیرات اور غیر روایتی اسلامی مفکرین کی توضیحات میں اس وقت بھی فرق و اختلاف پایا جاتا ہے اس کا ایک چھوٹا سا اظہار ڈھاکہ ہائیکورٹ کے ڈویژن بنچ کا ایک حالیہ فیصلہ ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فرق و اختلاف بھی کم ہو گا اور ایسی تعبیرات قبول عام کا درجہ حاصل کر لیں گی جو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متصادم نہیں ہوں گی لیکن جدید تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہوں گی۔ جدید و قدیم کے امتزاج کا یہ عمل مسلمان معاشروں میں اب روکا نہیں جا سکتا۔ اور میں عالم اسلام کے مستقبل کا انحصار اسی عمل کی موثر پیش رفت پر سمجھتا ہوں۔ اس عمل کے آگے بڑھنے ہی سے امت مسلمہ کے داخلی مسائل حل ہوں گے اور وہ بیرونی چیلنجوں کا زیادہ موثر اور کامیاب مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکے گی۔

آپکے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ امت مسلمہ میرے بیان کردہ تجزیے کی روشنی میں تو ایک تدریجی اور ارتقائی عمل کے ذریعے داخلی اور خارجی چیلنجوں کا موثر جواب دینے کے قابل ہو گی۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت اسے کیا کرنا چاہیے۔ میرا جواب یہ ہے کہ آن واحد میں (over night) امت مسلمہ کی کایا پلٹ کا معجزہ ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ یہ لامحالہ ایک لمبا عمل ہو گا جس میں کبھی ایک قدم آگے بڑھے گا تو ایک قدم پیچھے بھی ہٹے گا۔ او آئی سی کو قائم ہوئے ۳۲ سال ہو چکے ہیں' تمام اہم عالمی امور اغیار کے ہاتھوں میں ہیں اور سوا ارب سے زائد نفوس اور ۵۶ ممالک پر مشتمل یہ امت عالمی معاملات میں پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔ یہ حالت بلاوجہ نہیں ہے اس کے ٹھوس قابل فہم معروضی اسباب ہیں۔ جوں جوں ملت اسلامیہ کے ارکان کی انفرادی اور امت کی اجتماعی نشاۃ ثانیہ کا عمل آگے بڑھے گا وہ عالمی سیاست میں بتدریج ایک قوت بنیں گے ان کی آواز سنی جائے گی اور وہ امت کے مفادات کی حفاظت

کر سکیں گے۔

میری دانست میں نئی صدی کے نصف آخر میں اقبال کے اس خواب کے حقیقت کا جامہ پہننے کے امکانات روشن ہو جائیں گے کہ تمام مسلمان ممالک پہلے اپنی اپنی جگہ پر اپنے آپ مضبوط بنائیں اور اپنے اپنے ہاں اسلام کی سیاسی' اقتصادی اور تہذیبی تعلیمات پر عمل کریں اور پھر ان سب کے اشتراک سے ایک موثر اور طاقتور "اسلامی دولت مشترکہ" وجود میں آئے۔ اس منزل تک پہنچتے پہنچتے عالم اسلام بے کسی اور بے بسی اور اثر آفرینی کے فقدان کی موجودہ حالت سے بتدریج نکلنا شروع ہو جائے گا اور جب ایک نئی اسلامی دولت مشترکہ وجود میں آجائے گی تو وہ عالمی سیاست میں ایک موثر قوت ہو گی جس کی آرأ اور مفادات کو کوئی نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ یہ مجوزہ اسلامی دولت مشترکہ رسمی طور پر عالم اسلام میں خلافت کا منصب حال کر سکے یا نہ کر سکے اس کی قوت اور اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکے گا۔

مولانا ابو عمار زاہد الراشدی
مدیر اعلیٰ "الشریعہ" گوجرانوالہ

اکیسویں صدی اور علماء کرام کا کردار

عیسوی سن دو ہزار کے ہندسے کو چھوکر دو ہزار ایک کی طرف بڑھ چکا ہے اور سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت کو شمسی حساب سے دو ہزار سال گذر چکے ہیں اور اگر ان کی عمر کو ہمارے زمینی پیمانوں سے ماپا جائے تو وہ نسل انسانی کے سب سے لمبی عمر کے بزرگ قرار پاتے ہیں اس لئے کہ اہل اسلام کے اجماعی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ابھی تک موت کا مرحلہ نہیں گذرا۔ یہودیوں نے انہیں سولی پر لٹکانا چاہا مگر قرآن کریم کے بقول وہ شبہ میں ڈال دیئے گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمانوں پر اٹھالیا گیا جہاں سے وہ قیامت سے قبل دوبارہ زمین پر اتارے جائیں گے اور وہ اس وقت کے مسلمانوں کے سب سے بڑے مذہبی راہنما حضرت امام مہدی کے ساتھ مل کر دنیا کو دجال کے ظلم وجور اور دجل وفریب سے نجات دلائیں گے۔ اسلامی سلطنت وخلافت کا پرچم پھر سے دنیا پر لہرائیں گے ان کی شادی ہوگی، بچے ہوں گے اور پھر وفات ہوگی جسکے بعد انہیں جناب نبی اکرمؐ کے روضہ اطہر میں سپرد خاک کردیا جائیگا جس میں ایک قبر کی جگہ چودہ سو سال سے خالی چلی آرہی ہے۔

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری کا ایک خاص پس منظر اور فلسفہ ہے جس کی طرف خاتم المحدثین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے "مشکلات القرآن" میں اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو زمین پر آباد کرنے سے پہلے جہاں سب انسانوں سے "الست بربکم؟" کے سوال کے ساتھ اپنے رب ہونے کا اقرار لیا تھا وہاں حضرات انبیاء علیہم السلام کی ارواح مقدسہ سے بھی ایک عہد لیا تھا جو قرآن کریم کی زبان میں اس طرح ہے کہ تم سب اپنے اپنے وقت پر دنیا میں جاؤ گے اور تمہیں کتاب وحکمت سے نوازا جائے گا پھر تم سب کے بعد ایک رسول آئیں گے جو تمہاری تعلیمات کی تصدیق وتکمیل کریں گے اس لئے اے سب انبیاء کرام وعدہ کرو کہ تم سب اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد بھی کرو گے۔ تو سب انبیاء کرام نے اس کا اقرار کیا تھا اس عہد ومیثاق کا تذکرہ صداقت کے ساتھ قرآن کریم میں موجود ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے "وأنا معکم من الشاهدین" کے اعلان کے ساتھ اس معاہدہ پر اپنی شہادت ثبت فرمائی ہے اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے

کہ وہ آخری رسول حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تو سب انبیاء کرام علیھم السلام کے بعد تشریف لائے جبکہ تمام انبیاء ورسل اپنی اپنی مدت گزار کر دنیائے فانی سے رحلت فرما چکے تھے تو جناب نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کے اس وعدہ کا ایفاء کب ہوا؟ اور کیا کائنات کا اتنا بڑا میثاق جو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان ہوا تشنہ تکمیل رہ گیا؟ یہ بلاشبہ قرآن کریم کے مشکل مقامات میں سے ہے اور اس کے حل میں مختلف امور پر بحث کرتے ہوئے حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ نے جو اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایمان کا وعدہ تو معراج کی شب پورا ہو گیا جب مسجد اقصیٰ میں حضرات انبیاء کرام علیھم السلام نے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی امامت میں نماز ادا کر کے انہیں اپنا امام تسلیم کر لیا اور مدد والے وعدہ کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام علیھم السلام کے نمائندہ کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ رکھا ہوا ہے اور وہ اس کٹھن وقت میں امت محمدیہ علی صاحبہا التحیۃ والسلام کی مدد کیلئے تشریف لائیں گے جب اس امت پر چاروں طرف سے دجالی فتنوں کی یلغار ہو گی اور وہ دنیا پر اسلام کا غلبہ ایک بار پھر قائم کرنے میں حضرت امام مہدی کا ساتھ دے کر اور سب سے بڑے دجال کو اپنے ہاتھ سے قتل کر کے اس وعدہ اور میثاق کی تکمیل کریں گے جو حضرات انبیاء کرام علیھم السلام نے حضرت محمد ﷺ کی مدد کرنے کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا۔ حضرت امام مہدی کے ظہور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت کے بارے میں حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن علامات و آثار یہ بتا رہے ہیں اور بعض اہل اللہ کے وجدانات و کیفیات سے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے اور اگر آثار و قرائن کا یہ تسلسل اسی طرح قائم رہا تو کچھ بعید نہیں کہ یہ اکیسویں صدی ہی ان دونوں بزرگوں کی تشریف آوری اور اسلام کے ہاتھوں عالمی کفر کی فیصلہ کن شکست کی صدی بن جائے اس لئے "اکیسویں صدی اور علماء کرام کی ذمہ داریاں" کے عنوان پر کچھ عرض کرتے ہوئے اسی پس منظر میں چند گزارشات پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ سب سے بڑے "دجال" کا ظہور ابھی ہونا ہے لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ دجل و فریب کے سینکڑوں فتنے اس کے ہراول دستے کے طور پر دنیا میں پیش قدمی کر چکے ہیں اور ہر طرف جھوٹ مکر و فریب، دغابازی، ظلم، ناانصافی اور جدوجہد استحصال کے سیاہ بادلوں نے روئے زمین کو گھیر رکھا ہے۔ احادیث نبویہ ﷺ میں دجال کے ظہور اور اس کے دور کی جو علامتیں بیان کی گئی ہیں انہیں دیکھ لیں اور پھر اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں کہ ان میں سے کون سی علامت ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں آ چکی؟ دیندار مسلمانوں پر روئے زمین اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود تنگ کر دی گئی ہے، زمین کے تمام وسائل اور دولت کے سرچشموں پر دجالی قوتوں نے قبضہ جما رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں کے حوالہ سے بات کرنا اور کسی تاویل کے بغیر آسمانی

تعلیمات کو پیش کرنا ہاتھوں میں انگارے پکڑنے کے مترادف ہو چکا ہے۔ شریعت اسلامیہ کے نفاذ اور عملداری کی بات ان دجالی قوتوں کے پورے عالمی نیٹ ورک کے لئے چیلنج سمجھی جارہی ہے اور ایسا کرنے والوں کو بھوک افلاس اور احتیاج کی آگ میں دھکیلنے پر پوری دنیائے کفر کا اجماع ہو چکا ہے۔ ہر طرف دینی اقدار کا مذاق اڑایا جارہا ہے' عریانی اور فحاشی کا مہیب دیو ہر طرف ناچ رہا ہے بلکہ پوری دنیا کو نچا رہا ہے۔ انسان انسان کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح کٹ رہے ہیں' نسلی' علاقائی اور لسانی عصبیتوں نے انسانوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا رکھا ہے' زنا' لواطت اور حرام کاری نے تہذیبی اقدار اور حقوق کا درجہ حاصل کر لیا ہے' باہمی احترام اور رشتوں کا تقدس قصہ پارینہ بن کر رہ گیا ہے انسانی زندگی کے وسائل پر چند مفاد پرست اور استحصالی ٹولوں نے غاصبانہ تسلط جما کر انسانی آبادی کی اکثریت کو بھوک اور افلاس کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ اور پھر دجل و فریب کی انتہا یہ ہے کہ یہ سب کچھ انسانیت اور اس کے شرف و احترام کے نام پر ہو رہا ہے اور ان میں ہر برائی اور ظلم و جور کے کیمپ پر انسانی حقوق کا پرچم لہرا رہا ہے۔ یہ سب "دجالی فتنے" ہی کے مظاہر ہیں جنہیں ہم کھلی آنکھوں سے اپنے گردو پیش دیکھ بلکہ بھگت رہے ہیں' یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی بڑے ملک کا سربراہ دوسرے ملک کا دورہ کرتا ہے تو اس سے پہلے اس کے ملک کے مختلف گروپ وہاں جا کر حالات کا جائزہ لیتے ہیں ضروری تیاریاں کرتے ہیں اور فضا کو اس دورے کیلئے سازگار بناتے ہیں اسی طرح "دجال اکبر" کے ظہور سے پہلے اس کے پروٹوکول آفیسرز کے مختلف گروپوں نے دنیا کو گھیرے میں لے لیا ہے اور اس کی مختلف ایجنسیوں کے کارندوں نے انسانی آبادی کے ہر شعبہ اور طبقہ میں پھیل کر اپنے چیف کی آمد کیلئے راہ ہموار کرنے کی محنت شروع کر رکھی ہے جو اب لگتا ہے کہ آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے اور اس دجالی ڈرامے کے "ڈراپ سین" کیلئے پوری دنیا آنکھیں جھپکے بغیر پردہ اٹھنے کی منتظر ہے۔

مسیح کی آمد ثانی کا انتظار ہم مسلمان تو کر ہی رہے ہیں لیکن اس کے انتظار میں عیسائی بھی ہیں اور یہودیوں کو بھی اس کا مسلسل انتظار ہے یہ الگ بات ہے کہ مسیح کی شخصیت ایک نہیں دو ہیں خود جناب نبی اکرم ﷺ نے دو مسیحوں کی آمد کی خبر دی ہے اور دونوں کی الگ الگ علامتیں بتائی ہیں ایک مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور دوسرا مسیح "دجال" ہے اسے بھی جناب نبی اکرم ﷺ نے مسیح دجال کے نام سے ذکر کیا ہے۔ دونوں کا ظہور ایک ہی زمانے میں ہو گا دونوں میں باہمی معرکہ آرائی ہو گی جو خیر و شر کی جنگ کا "فائنل راؤنڈ" ہو گا اور ایک کو دوسرے پر فیصلہ کن غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ اب یہ فیصلہ دنیا کی موجودہ معروضی صورت حال دیکھ کر بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ کس کو کون سے مسیح کا انتظار ہے؟ عیسائی اور یہودی جو آسمانی تعلیمات اور انسانی اقدار و اخلاق کے خلاف متحدہ محاذ بنا چکے ہیں اور ظلم و جبر کی آخری

حدود کو چھو رہے ہیں وہ کون سے مسیح کے منتظر ہیں؟ اور مسلمان جو آسمانی تعلیمات کو سینے سے لگائے اور قرآن و سنت کی بالادستی کا پرچم تھامے اسکی خاطر ہر ظلم اور تشدد کو حوصلے اور استقامت کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں انہیں فطری طور پر کون سے مسیح کا انتظار ہو سکتا ہے؟ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے اور اسے ایک طرف رکھتے ہوئے اکیسویں صدی کے معروضی حالات میں علماء اسلام کی ذمہ داریوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں دنیا کے معروضی حالات کا منظر کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں ادھر ادھر کی قیاس آرائیوں کی بجائے اس کے آغاز کو دیکھ لینا ہی کافی ہے ظاہر بات ہے کہ جب تک کوئی عالمگیر انقلابی تبدیلی رونما نہیں ہوتی حالات اسی ڈگر پر چلتے رہیں گے۔ جس پر اس وقت ان کا سفر جاری ہے اور حالات کا سفر اسی رخ پر جاری رہے تو آنے والے دور کے حالات کا اندازہ لگانے کیلئے کسی غیر معمولی عقل و دانش کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری دینی اصطلاح میں اسے "فتنوں کا دور" کہا جاتا ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات اور پیش گوئیوں میں اس دور کے بارے میں واضح اور تفصیلی راہنمائی ملتی ہے اور جناب رسالت مآب ﷺ نے اس دور میں فتنوں کے ظہور کو "کوقع المطر" سے تعبیر کیا ہے کہ فتنے بارش کی طرح برسیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق اس دور میں ایمان کی حفاظت سب سے مشکل کام ہو جائے گا اور صرف دو طرح کے لوگ اپنے ایمان و دین کی حفاظت کر پائیں گے۔

رجل معتزل فی بادیة یودی حق اللہ تعالیٰ الذی علیه اور جل اخذ بعنان فرسد خلف اعدا اللہ تعالی یخیفهم ویخیضونه (حاکم)

وہ شخص جو زندگی کے اجتماعی معاملات سے کنارہ کش ہو کر علیحدگی اور گوشہ نشینی کی روش اختیار کر لے اور خاموشی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اسکے حقوق کی ادائیگی میں مگن رہے یا وہ شخص جو گھوڑے کی لگام پکڑے ہر وقت اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے خلاف برسرپیکار ہے دوسرے لفظوں میں انسانی سوسائٹی اور اجتماعی زندگی سے تعلق قائم رکھتے ہوئے ایمان کے تحفظ کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے کہ وہ کفر اور اسکے پیدا کردہ فتنوں کے خلاف ہر وقت حالت جنگ میں رہے اور کسی وقت بھی گھوڑے کی لگام اسکے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اس ارشاد نبویؐ کی روشنی میں ایسے حالات میں اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں علماء کرام خود غور فرمالیں کہ پہلی صورت کی گنجائش تو ان کیلئے نہیں ہے کیونکہ "رہبانیت" اور زندگی کے اجتماعی معاملات سے کنارہ کشی کو جناب نبی اکرم ﷺ نے اسلامی طرز عمل کے طور پر قبول نہیں فرمایا اسلئے کسی عام شخص کیلئے تو شاید کسی حد تک اس کا جواز نکل سکتا ہو مگر "دین" اور "علم" کی ذمہ داری اپنے سر لینے والے علما کرام کیلئے کسی درجہ میں اس کی ذرہ سی بھی گنجائش نہیں ہے

انکا راستہ اور فریضہ بہر حال دوسرا ہے اور اس حوالہ سے آج کے دور میں بالعموم اور آنے والے زیادہ کٹھن دور میں بالخصوص علماء کرام کی ذمہ داریوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

☆ اپنے دین وایمان کی حفاظت

☆ عام مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت اور

☆ اس جدوجہد کیلئے رجال کار کی تربیت اور تیاری

دین وایمان کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد اور ان کی اجماعی تعبیرات پر اس درجہ کا یقین اور اعتماد قائم رہے کہ "تشکیک مشکک" سے زائل نہ ہو لیکن بدقسمتی سے ہم عقائد وایمانیات کے حوالہ سے اس معیار کو حاصل کرنے اور اسے باقی رکھنے کی فکر کرنے کی بجائے "ظن غالب" کے درجہ کو ہی یقین خیال کر کے اس پر قناعت کئے بیٹھے ہیں اور یہی ہمارا آج کے دور کا سب سے بڑا المیہ ہے بہر حال اپنے ایمان ویقین اور اس کی بنیاد پر دینی اعمال و معمولات کا راستہ وہی ہے جو جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کفر اور اس کے پیدا کردہ فتنوں کے خلاف ہر وقت حالت جنگ میں رہے اور فتنوں کے دور میں یہی علمائے اکرام کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ عام مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت کیلئے ضروری ہے کہ علماء کرام اسلام کے خلاف کام کرنے والے فتنوں کے بارے میں پوری طرح باخبر ہوں ان کے طریق کار کو سمجھتے ہوں ان کے ہتھیاروں سے واقف ہوں اور ان کے وسائل و ذرائع پر ان کی پوری طرح نظر ہو پھر عام مسلمانوں کے ساتھ علماء کرام کا ربط و تعلق رسمی اور روایتی نہ ہو بلکہ مشنری ہو اور وہ ان کی زبان 'نفسیات' عرف اور اجتماعی مزاج سے کماحقہ آگاہ ہوں اس کے یہ بھی ضروری ہے کہ عوام تک پہنچنے اور ان کے ذہنوں تک رسائی حاصل کرنے کے وسائل نہ صرف ان کی دسترس میں ہوں بلکہ وہ ان کے استعمال کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہوں خطابت تحریر اور کمپیوٹر آج کے دور کے وہ تین اہم ذرائع ہیں جن سے استفادہ کر کے ہم عام مسلمانوں تک اپنی بات پہنچا سکتے ہیں خطابت سے مراد عام اجتماع میں گفتگو کی اپنی صلاحیت ہے جو مخاطب افراد کی ذہنی سطح کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں اپنا مافی الضمیر سمجھانے میں مفید ثابت ہو۔ تحریر کا مطلب یہ ہے کہ ایک عالم دین مروجہ صحافتی زبان میں اپنی بات کو شستہ انداز میں پیش کر سکے۔ اور کمپیوٹر سے یہ غرض ہے کہ ابلاغ اور اظہار کے اس جدید اور موثر ترین ذریعہ کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنا اس کیلئے مشکل نہ ہو لیکن ان سب سے زیادہ اور سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم سنت نبویؐ 'اسوہ صحابہ کرامؓ' تاریخ اسلام' اکابر واسلاف کی جدوجہد کے تسلسل 'اسلامی نظام کے مختلف پہلوؤں' عالمی کفر اور استعمار کے مختلف کیمپوں 'گمراہ کن افکار و نظریات 'اسلام دشمن لابیوں اور عالم اسلام کی الحادی تحریکات کے حوالہ سے علماء کرام کی اپنی تیاری

اور مطالعہ مکمل ہو تاکہ وہ اندھیرے میں لاٹھی گھمانے کی بجائے شعور و ادراک کی روشنی میں کفر و استعمار کے علمبرداروں کے ساتھ پنجہ آزمائی کر سکیں۔

ہماری بد قسمتی ہے کہ ان اہم ترین ملی اور دینی ضروریات پر ہماری نظر نہیں ہے اور ہم اپنے تعلیمی اور دینی مراکز تک میں ان کی اہمیت و ضرورت محسوس نہیں کر رہے یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس کے فضلاء کی غالب اکثریت ایسے حضرات پر مشتمل ہوتی ہے جو اصحاب کہف کی طرح دینی مدارس کے محفوظ غاروں میں چند سال گزار کر جب سوسائٹی کے عام ماحول میں جاتے ہیں تو ان کے علم، زبان اور معلومات کا سکہ مارکیٹ کے لئے اجنبی ہوتا ہے اور عملی زندگی میں انہیں جن مشکلات، سوالات اور مسائل سے شب و روز واسطہ پڑتا ہے ان کے بارے میں وہ نئے سرے سے تعلیم، تربیت اور معلومات حاصل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایسے موقع پر مجھے "دیوان حماسہ" سے دو شعر اکثر یاد آجاتے ہیں اور میں خود جب کسی ایسی صورتحال سے دوچار ہوتا ہوں کہ کچھ کرنے کی خواہش کے باوجود تربیت اور صلاحیت کے فقدان کے باعث کچھ بھی نہیں کر پاتا تو حسرت کے ساتھ وہ شعر گنگناتا رہتا ہوں۔ ان شعروں کو ذکر کرنے سے پہلے ان کا مختصر سا پس منظر عرض کرنا ضروری ہے کہ ایک عرب قبیلہ کے کسی نوجوان کو اس کے گھر والوں نے خوب نعمتوں اور نازوں میں پالا پوسا اور کھلا پلا کر جوان کیا مگر اسے جنگ کی ٹریننگ نہیں دی اور ہتھیاروں کا استعمال اور لڑائی کے آداب اور طریقے نہیں سکھائے جب وہ جوان ہوا تو عرب قبائل کی روایات کے مطابق دشمن قبیلہ کے جوانوں سے اس کا آمنا سامنا ہوا اور وہ ان کا مقابلہ نہ کر سکا تو اپنے قبیلہ کے طرز عمل کو ان الفاظ میں شکایت کرتا ہے کہ

فهلا أعدوني لمثلي تفاقد وا
اذا الخصم ابزى مائل الرأس انكب
وهلا أعدوني لمثلي تفاقدوا
وفي الارض مثبوت شجاع و عقرب

قبیلے کے لوگ ایک دوسرے کو گم پائیں انہوں نے مجھے میرے دشمن کے مقابلے میں تیار کیوں نہیں کیا؟ جب کہ میرا مد مقابل ٹیڑھی گردن والا متکبر اور دلیر شخص ہے اور یہ ایک دوسرے کو گم پائیں انہوں نے مجھے میرے حریف کے مقابلہ میں ٹریننگ کیوں نہیں دی؟ جب کہ زمین میں ہر طرف سانپ اور بچھو بکھرے ہوئے ہیں۔

دین کی تعلیم و ترویج، اسلامی احکام و قوانین کی اشاعت اور علوم نبویہ کی حفاظت و تدریس کے

ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت اور انہیں ضروری دینی معلومات اور راہنمائی مہیا کرنے کی غرض سے رجال کار کی تیاری بھی ہمارے دینی مدارس ومراکز کا بنیادی ہدف ہے اور وہ اس شعبہ میں قابل قدر اور قابل فخر خدمات سرانجام دے رہیں ہیں۔ بلکہ اس بات میں بھی کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ آج ہمارے معاشرہ میں دین کے ساتھ تعلق اور قرآن وسنت کے ساتھ وابستگی کا جو کچھ بھی ماحول ہے وہ ان دینی مدارس ومراکز ہی کی برکت سے ہے لیکن لادینیت' عالمی کفر اور دجالی فتنوں کے افکار ونظریات اور طریقِ واردات سے آگاہی اور ان کے توڑ اور مقابلہ کی صلاحیت کا پہلو بدستور تشنہ ہے اور جب تک اس تشنگی کو دور کرنے کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی جاتی یہ خلاء بہر حال باقی رہے گا۔ ہمارے نزدیک اکیسویں عیسوی صدی کے حوالہ سے علماء کرام، علمی مراکز اور دینی مدارس کی سب سے بڑی اور اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس خلاء اور تشنگی کو محسوس کریں اور دجالی فتنوں کے تیزی سے بڑھتے ہوئے دائرہ کار اور اثر ونفوذ کو سامنے رکھتے ہوئے عام مسلمانوں اور اپنے شاگردوں اور طلبہ دونوں کیلئے اپنی ترجیحات اور طریق کار کا ازسرنو جائزہ لیں تاکہ علماء کرام آنے والے دور میں اپنی ملی ودینی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہو سکیں۔

جناب احمد ندیم قاسمی
معروف شاعر و دانشور

اکیسویں صدی کا پیغام

اکیسویں صدی کا استقبال کرتے ہوئے ہم صرف اس صورت میں بھلے لگ سکتے ہیں کہ ہمارے ذہنوں اور ضمیروں میں ان ناکامیوں کا مکمل احساس و شعور موجود ہو جو بیسویں صدی میں ہمارا مقدر تھیں۔ پھر ان ناکامیوں کے اسباب و مضمرات کا قلع قمع کرنے کے پختہ ارادے، اور ان کامرانیوں کو مزید صیقل و تاباں کرنے کے عزم صمیم ہی سے ہم اکیسویں صدی کی طرف اعتماد کے ساتھ قدم بڑھا سکتے ہیں۔ ہماری اخلاقی روایات میں آیا ہے کہ جب دن بھر کی دوڑ دھوپ اور تگ و دو کے بعد تم آرام کرنے کیلئے بستر پر لیٹو تو سونے سے پہلے اپنے اعمال و اقوال کا خود ہی محاسبہ کرو کہ طلوع آفتاب کے بعد اب تک تم سے کون کون سے غلطیاں سرزد ہوئیں اور تم نے کون کون سے اچھے کام کئے اور پھر اپنے آپ سے یہ طے کرنے کے بعد ہی سوؤ کہ آئندہ تم ان غلطیوں کا اعادہ نہیں کرو گے اور ان اچھے کاموں کو نہ صرف ہمیشہ کیلئے اپنالو گے بلکہ انہیں مزید نکھارو اور سنوارو گے۔ یہ ایک فرد کی زندگی میں ایک دن کا معاملہ تھا مگر ایک صدی تو چھتیس ہزار سے بھی زیادہ دنوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کا حساب افراد اور اشخاص کے علاوہ قوموں اور ملتوں کو رکھنا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا محاسبہ بھی تو بحیثیت قوم ہمیں کو کرنا ہے کہ بیسویں صدی میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا اور کیوں کھویا اور کیسے پایا؟ اور یہ بھی تو طے کرنا ہے کہ اس صدی میں ہم نے جو کچھ کھویا، اسے نئی صدی میں پانے کی کوشش کریں گے اور بیسویں صدی میں ہم نے جو کچھ پایا، اسکا اکیسویں صدی میں جی جان سے تحفظ کریں گے اس طرح کے کسی فیصلے کے بغیر بیسویں صدی کے بعد اکیسویں صدی ہمارے لئے اسی طرح بے معنی ہو کر رہ جائے گی جیسے ایک شکست خوردہ اور مایوس شخص کے لئے منگل کے بعد بدھ کا دن بھی منگل کی طرح بے معنی ہوتا ہے۔

ان دنوں صرف ممالک اسلامیہ ہی میں نہیں بلکہ پورے کرہ ارض پر احیائے اسلام کے چرچے ہیں یورپ اور امریکہ تک کے براعظموں میں وہاں کے دانشور اور رائے عامہ کو متاثر کرنے والے عناصر سوچنے لگے ہیں کہ ایشیاء اور افریقہ کے مسلمانوں کو صدیوں تک اپنے استعمار و استبداد کی گرفت میں اسیر رکھنے کے باوجود، اسلام کا جذبہ، مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں میں کیوں زوال پذیر نہیں ہو سکا۔ اور یہ چار طرف سے اسلام کے بڑھتے ہوئے قدموں کی دھمک سی کیوں سنائی دے رہی ہے۔ چنانچہ یہ راز معلوم

کرنے کے لئے قرآن و حدیث اور اسلامی فقہ اور اسلامی تہذیب کا از سر نو مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ اسلامیات کے سلسلے میں تحقیقی مراکز قائم ہو رہے ہیں اور مغرب کے متعصب مورخین کی پھیلائی ہوئی تاریکی سے بچ کر' اسلام کو حقیقت و صداقت کی روشنی میں پرکھا اور جانچا جانے لگا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اسلام کے سے سچے' کھرے' پاکیزہ اور منصفانہ ضابطہ حیات کا مطالعہ بے تعصبی کی فضا میں ہوگا تو مطالعہ کرنے والوں کا اسلام سے متاثر ہونا ناگزیر ہو جائے گا۔ چنانچہ یورپی اور امریکی ممالک میں ہزاروں لاکھوں افراد متاثر ہو رہے ہیں اور الحاد اور بے یقینی اور بے مذہبیت کی دھن میں سے فی الحال وہ خود نہیں تو ان کے دل اور دماغ نکلتے آ رہے ہیں یہ اسلام کی عالمگیریت کے واضح امکان کا ایک بلیغ اشارہ ہے' مگر اس مبارک امکان کو صرف اس طرح حقیقت میں بدلا جا سکتا ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے مسلمان اپنی زندگیاں آنحضرت ﷺ کے ارشادات عالیہ کے سانچے میں ڈھال لیں' دلوں پر سے توہمات کی گرد جھاڑ دیں۔ عقائد کو مصفّی اور منزہ کر لیں اور حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ کی تمثالیں بن جائیں۔ اکیسویں صدی میں اگر ہم مسلمان اپنے اندر صحیح اور سچا اسلامی انقلاب پیدا کر لیں تو وہ مقدس و مبارک خواب بھی ہمکنار تعبیر ہو سکتا ہے' جو سید جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال نے بیسویں صدی میں دیکھا تھا۔ یہ کرہ ارض کے تمام مسلمانوں کے ایک امت' ایک ملت بن جانے کا خواب ہے۔

بیسویں صدی میں بظاہر سیاسی طور پر آزاد ہونے کے باوجود دوسرے افریشیائی ممالک کی طرح پاکستان کو بھی مغرب کی تہذیبی اور اقتصادی یلغار کا سامنا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم اکیسویں صدی کے ابتدائی پندرہ برسوں میں تو یہاں کی تہذیب و ثقافت اور معاشرت و معیشت پر مغرب کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ قرضوں کے چکر میں ڈال کر ہمیں صدفی صد امریکہ اور یورپ کا دست نگر بنا دیا گیا ہے اور ہمارے لئے کوئی راہ فرار رہنے ہی نہیں دی گئی۔

اقتصادیات و معاشیات کے حوالے سے مغرب نے ہمیں آزاد ہونے کے باوجود جس طرح اپنا محتاج بنا رکھا ہے اسکے مضرات سے ان مضامین کے ماہرین ہی بہتر طور پر نمٹ سکتے ہیں۔ ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے مجھے پاکستان کے تہذیبی مستقبل سے بطور خاص دلچسپی ہے۔ پاکستانی آبادی کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے اسلامی تہذیب یہاں کے اہل ادب کا خاص موضوع ہے اور اس تہذیب کو بیسویں صدی میں جن خطرات کا سامنا تھا۔ اب سائنس کی ٹیکنیکل ترقی نے ان خطرات میں صدفی صد اضافہ کر دیا ہے۔ چنانچہ اکیسویں صدی میں اسلامی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لئے بڑی لگن اور محنت درکار ہوگی اور اس سیدھی سادی' سچی' کھری' جری اور پختہ شخصیت کو صورت پذیر کرنا ہوگا' جو ان بنیادی عقائد کی پیداوار ہوگی' جن میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ کوئی دھند لاہٹ نہیں' کوئی پراسراریت

نہیں۔ اس شخصیت کی توانائی اس کی سادگی ہے اور مساوات واخوت' اسکی شان ہے جسکے مطابق نہ رنگ و نسل کا کوئی امتیاز ہے اور نہ ذات پات کی کوئی تفریق۔ اسلام کی انصاف پروری اور عدل گستری بھی اس کی ایک بےمثال تہذیبی قدر ہے۔ اخلاق حسنہ اس کی ایک اور توانائی ہے جسکے مطابق معاف کر دینے اور درگزر سے کام لینے کی اخلاقی خوبصورتی نے آغازِ اسلام میں ایک دنیا کو موہ لیا تھا اور عقیدے صرف یقین کرنے یا تبلیغ کرنے کی چیز نہیں ہوتے' عمل کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ہمیں ایک ایسا خطہ ارض میسر آگیا تھا جس میں ہم اسلامی تہذیب اور جدید علوم کی وجہ سے صورت پذیر ہوتے ہوئے تمدن کے ارتباط واختلاط کی ایک جنت تعمیر کر سکتے تھے۔ مگر خدا کی وحدانیت کے پرستار ہونے کے باوجود ہم غیر اللہ کے خوف سے بے نیاز نہ رہ سکے۔ اسلئے ہماری شخصیت مستحکم اور مستغنی نہ ہو سکی۔ اپنی طرف سے کچھ عرض کرنے کی جائے مجھے پاکستان میں اسلامی تہذیب کی صورت حال کے بارے میں چند سوال پوچھنے کی اجازت دیجئے:

کیا بیسویں صدی میں ہم نے اپنے دین کو کھرا اور سادہ اور غیر پیچیدہ رہنے دیا ہے؟
کہیں ہم نے اسے دھندلا اور پراسرار تو نہیں بنا دیا؟
کہیں ہم نے اصلی اور نسلی مسلمانوں کی تفریق تو پیدا نہیں کر دی؟
کہیں ہم اپنے ایمان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اسلام کی معاشرتی اور معاشی مساوات واخوت کے اصولوں پر عمل پیرا ہیں؟ کیا ہم ذات پات اور برادری قبیلے کے امتیازات سے بلند ہو سکے ہیں؟
کیا ہم منصف اور عادل ہیں؟ کیا ہم دین میں جبر واکراہ کی ممانعت کا احترام کرتے ہیں؟
کیا ہم معاف کر سکتے ہیں؟ کیا ہم میں درگزر کرنے کا حوصلہ ہے؟
کیا ہم برائی کے بدلے نیکی کا برتاؤ کر سکتے ہیں؟ کیا ہم نے "الارض للہ" کے ارشاد کا عملاً احترام کیا ہے؟
کیا ہم نے (قرآن کے حکم) "قل العفو" کا کوئی عملی پیمانہ وضع کیا ہے؟

اگر ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی ہی میں ہے' تو کیا ہمارے تہذیبی نصب العین اور ہمارے عمل کے درمیان پہاڑ حائل نہیں ہو چکے ہیں؟ اور کیا اکیسویں صدی میں بھی ہم اپنی تہذیب کے ساتھ یہی بدسلوکی کرتے رہیں گے؟ اگر ہم اپنے افکار وخیالات کو تخلیق واجتہاد سے روشناس کرا دیں اور اس جرأت مندانہ اجتہاد کے ذریعے اسلامی تہذیب کو ایک جیتی جاگتی' سانس لیتی اور دھڑکتی ہوئی تہذیب بنا دیں جس کے باطن میں بڑی فراخی ہو اور جس کے ظاہر میں جلال وجمال برابر برابر متناسب سے جلوہ گر ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ اکیسویں صدی میں پوری دنیا پاکستان کو اسلامی تہذیب کی تجسیم نہ کہنے لگے اگر ہم سکڑے اور سمٹے ہوئے کرہ ارض میں کارفرما تازہ دم اور تازہ کار عناصر کو متعصبانہ غصے میں

آکر ایک دم منسوخ و ممنوع قرار دینے کے بجائے انہیں اپنے دینی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کر اپنانے کا عمل جاری کر دیں تو ہم اسلامی تہذیب کا صحیح معنوں میں احیا کر سکیں گے اور ان غیر ملکی اثرات سے بھی محفوظ ہو جائیں گے جنہوں نے ہمیں نقالی اور بے عملی اور بے ہنری کے سوا اب تک کچھ بھی نہیں دیا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام میں ملوکیت کے در آنے سے اس دین فطرت کو کتنا شدید نقصان پہنچا اور مسلمانوں کے مزاج 'ابتدائی صاف ستھرے اسلامی سانچوں کو توڑ کر کس طرح انتشار کی زد میں آگئے۔ اس انتشار نے مسلمانوں کے اندر یقین اور اعتماد کی قوتوں کو کمزور کر دیا تو مغرب کا سامراجی دیو' اپنی ناپاک نو آبادیاتی مہم پر نکلا اور ایشیا اور افریقہ کو صدیوں تک کے لئے غلام بنالیا گیا۔ یاد رہے کہ محکومی اور غلامی کی نوعیت صرف سیاسی نہیں ہوتی' یہ تو براہ راست ایمان وایقان پر حملہ آور ہوتی ہے۔ تہذیبوں اور ثقافتوں کو بدشکل بناتی ہے۔ نمود و نمائش اور دجل و فریب کو سکہ رائج الوقت قرار دیتی ہے۔ اور یوں اخلاق و کردار کو اس حد تک متغیر کر دیتی ہے کہ ہر پرانی قدر (چاہے وہ اچھی ہو) بدہیئت اور ہر نئی شکل (چاہے وہ بری ہو) پر جمال دکھائی دینے لگتی ہے۔ برطانوی اور فرانسیسی اور ولندیزی اور یورپ کے دیگر استعماروں نے دوسرے ملکوں کے لوگوں کے ساتھ بھی اور بطور خاص مسلمانوں کے ساتھ یہی غیر انسانی برتاؤ روا رکھا اور مسلمانان عالم زوال کے آخری نقطے تک اتر گئے۔ مذہب کی جگہ توہمات نے لے لی۔ اتحاد کی جگہ افتراق نے لے لی۔ امت مسلمہ کی یک جہتی کی جگہ فرقہ بندیوں اور گروہ بازیوں نے لے لی۔ مگر رات کی ظلمت میں ستارے بھی تو چمک اٹھتے ہیں اور حد نظر تک پھیلے ہوئے لق و دق ویرانوں میں گل لالہ بھی تو کھل اٹھتے ہیں۔ چنانچہ یہ اعزاز بھی اس بیسویں صدی ہی کو حاصل ہے کہ اس میں غلامی پر رضامند لوگوں کے درمیان غلامی کی زنجیریں توڑنے والے بھی پیدا ہو گئے اور محکومی کے خلاف ایشیاء اور افریقہ میں اس زور کی تحریکیں چلیں کہ قریب قریب ساری اسلامی دنیا آزادی کی نعمت سے سرفراز ہو گئی۔ یقیناً ان ممالک کی یہ آزادی سامراجی قوتوں کو سخت ناپسند تھی۔ کیونکہ اس طرح ان کے مفادات متاثر ہوتے تھے جو محکوم ممالک کے اقتصادی استحصال سے انہیں حاصل تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سیاسی گرفت کے ٹوٹتے ہی ان نو آزاد ممالک کو اپنی سیاسی گرفت سے بھی زیادہ خطرناک 'اقتصادی گرفت میں دبوچنے کا منصوبہ بنایا اور آج کل ایشیاء اور فریقی ممالک میں اسی منصوبے پر عمل ہو رہا ہے اور امریکہ کا نیا عالمی نظام اسی منصوبے کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے۔ مگر خود آگاہی بڑی نعمت ہے اس لئے آخر کار اس اقتصادی گرفت کو بھی ٹوٹنا ہے اور انشاء اللہ اکیسویں صدی کے آغاز ہی میں ٹوٹنا ہے۔

سید جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کی تمنا تھی کہ اسلامی ممالک بے شک اپنی جغرافیائی اور ثقافتی انفرادیتیں برقرار رکھیں 'مگر ان سب ملکوں کو ایک لڑی میں پرونے کے لئے اور ان بکھرے ہوئے

کروڑوں مسلمانوں کو ایک ملت بنانے کے لئے مجلس اقوام کے انداز کی ایک مجلس ممالک اسلامیہ وجود میں آئے جس کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کو یک جہتی، ہم آہنگی باہمی تعاون، برداشت اور بھائی چارے کا منشور دیا جائے۔ اور یہ منشور اول و آخر قرآن مجید کے احکام مقدسہ اور حضور علیہ السلام کے ارشادات گرامی پر مشتمل ہو۔ جب تمام دنیا کے مسلمانوں کا خدا ایک ہے، رسول ایک ہے، قبلہ ایک ہے، شریعت ایک ہے، منتہائے نظر ایک ہے تو سیاسیات اور معاشیات میں ان کا ایک رخ کیوں معین نہ ہو۔ صرف اس صورت میں مسلمانوں کا مستقبل بھی محفوظ رہ سکتا ہے اور کرہ ارض پر پھیلی ہوئی احیائے اسلام کی تحریکیں بھی کسی مثبت نتیجے تک پہنچ سکتی ہیں اور بڑی عالمی طاقتوں کی روندی ہوئی اس دنیا میں امن، سلامتی، خوشحالی، عدل، مساوات، محبت اور اخوت کی ابدی فضا بھی قائم ہو سکتی ہے

یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ بیسویں صدی گزار کر بھی عالم انسانیت خاص طور سے افریشیائی ممالک آج بھی قریب قریب انہی مسائل سے دوچار ہیں، جن کا سامنا انہیں انیسویں صدی کے خاتمے کے دنوں میں تھا۔ بیسویں صدی میں ایشیاء اور افریقہ کے بیشتر ممالک نے فرنگیوں کی گرفت سے آزادی تو حاصل کر لی مگر آج بھی جب یورپ اور امریکہ کا کوئی اخبار یا رسالہ افریقہ اور ایشیاء کے سیاسی، معاشی، اقتصادی اور تہذیبی مسائل کا جائزہ لیتا ہے تو بے تعصبی اور انسان دوستی کے ہزار دعوؤں کے باوجود اسکے لہجے میں تحکم کی وہ گونج ضرور ہوتی ہے جو مغرب کے ہاتھوں گزشتہ دو تین صدیوں میں افریشیا کے استحصال کا نتیجہ ہے یہ جائزہ مغرب کی صنعتی اور اقتصادی ترقی کے مینار کی چوٹی پر بیٹھ کر لیا جاتا ہے۔ اور افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے کہ افریشیائی ممالک مغرب کی طرف سے بخشی ہوئی آزادی کی کوئی قدر نہیں کر سکے اور وہاں کے لوگوں کو حکومت چلانا آتا ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل مغرب کے لاشعور میں ابھی تک یہ جذبہ قیامت برپا کئے ہوئے ہے کہ افریشیائی ممالک کو ابھی مزید ایک صدی تک غلام رہنا چاہیے تھا اور انہیں بھی اس آسودگی کا تجربہ حاصل کرنا چاہیے تھا۔ جس کا لطف ان کے آباؤ اجداد نے اٹھایا اور جس کی شان و شوکت کا حال وہ تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ کیسے وہ پھٹے حالوں اور نو آبادیوں میں گئے اور کیسے زرو جواہر سے لدے پھندے واپس آئے اور خطاب پائے اور جاگیریں حاصل کیں۔

بیسویں صدی میں مغرب کے حکمرانوں، سیاست دانوں اور دانشوروں کو افریشیائی ممالک کی آزادی سے بڑی تکلیف پہنچی ہے اور وہ ان ملکوں کی آزادی کو کسی نہ کسی صورت میں ملوث رکھنا چاہتے ہیں اور ستم یہ ہے کہ ان کی یہ ناپاک کوشش خاصی کامیاب ہے۔ جن لوگوں کے ذہنوں میں افریشیا کی حکمرانی کا خمار اب تک موجود ہے، وہ یہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں انہیں وہی لوگ اپنے برابر بیٹھے نظر آئیں جن پر کل تک وہ حکم چلاتے تھے اور حکم عدولی کی صورت میں انہیں سزائیں دیتے

تھے۔ وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس عالمی پلیٹ فارم پر افریشیا کے سانولوں اور کالوں پیلوں کی تعداد مغرب کے گوروں سے بڑھ جائے گی اور ووٹ سے طے ہونے والے مسائل پر انہیں افریشاء کے مقابلے میں شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سو انہوں نے ان خطرات کے پیش نظر اقتصادی امداد اور سیاسی تعاون اور اسلحاتی تحفظ وغیرہ کے ڈھونگ رچائے اور آج اسی کے میٹھے پھل کھا رہے ہیں۔ اقوام متحدہ میں افریشیاء کے سب سے بڑے ملک چین کی رکنیت کا مسئلہ پیش ہوتا تھا۔ تو خود بعض افریشیائی ممالک بھی چین کے خلاف ووٹ دیتے تھے اور جب افریشیاء کے دو اہم ترین ملکوں پاکستان اور ہندوستان کا ایک ایسا تنازعہ پیش ہوتا جو ان دونوں براعظموں کے امن کو تباہ کر سکتا تو خود افریشیاء ہی کے بعض ملک غیر جانبداری کے بے معنی اور فراری طرز عمل اختیار کر لیتے تھے۔ اور جب وہ ایسا کرتے تھے تو انہیں یہ احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسی مغرب کے مقاصد کو آگے بڑھا رہے ہیں جس نے انہیں صدیوں تک لوٹا' پیٹا اور نوچا کھسوٹا ہے'، جس نے ان کی تہذیبوں کو مسخ کیا ہے اور ان کی تاریخ کے مفہوم ہی بدل دیئے ہیں۔ جس نے ان سے ان کی زبانیں' ان کی روایتیں اور ان کی قدریں چھین لی ہیں اور جس نے انہیں سیاسی آزادی دینے کے بعد افریشیاء کو اپنی تہذیبی نو آبادی بنا رکھا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے ایسے ملکوں کو اپنی زیر زمین قسم کی سرگرمیوں کے اڈے بھی بنا رکھا ہے۔ جہاں کے حکمران آزادی کے بعد اپنی قومی انفرادیتوں کے احیاء میں مصروف ہیں۔ وہاں "دکھائی نہ دینے والی" قوتیں ان لوگوں کے درمیان اندھا دھند دولت بانٹتی پھرتی ہیں جو ایک بنگلے ایک کار اور مغرب کے ایک "ٹور" کے لالچ میں اپنی قوم کا مستقبل تک داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرنی چاہیے کہ بیسویں صدی عیسوی کے کم وبیش نصف نے ہمیں آزاد ہوتے تو دیکھا مگر ہم اب تک اپنے مقدر اور اپنے مستقبل کے صحیح معنوں میں مالک نہیں بن پائے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے انجام پر آزاد ممالک اسلامیہ کا منظر کچھ ایسا حوصلہ افزا نہیں ہے مگر اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ہم لوگ ابھی تک اپنی قدیم غلامانہ ذہنیت سے خلاصی حاصل نہیں کر سکے اور نہ صرف ملکوں ملکوں اور قوموں قوموں میں بلکہ فرقوں فرقوں اور قبیلوں قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ملت واحدہ کی اس منزل سے ابھی بہت دور ہیں جس کی نشان دہی قرآن پاک میں بار بار ہوئی ہے۔ اگر ہم مختلف ملکوں میں رہ کر ابھی ایک ہی ملت اسلامیہ کے فرد ہوتے تو چند لاکھ اسرائیلیوں کی کیا مجال تھی کہ وہ اپنے تین طرف پھیلے ہوئے عرب ممالک کو خاطر ہی میں نہ لائیں۔ اور اسلامی ممالک اس ایک دشمن سے نپٹنے کی بجائے آپس میں ہی دست وگریباں رہیں۔ اگر ہم ایک ملت ہوتے تو سویت یونین کو یہ جرأت کیسے ہوتی کہ وہ اپنی فوجیں یوں دھڑلے کے ساتھ

افغانستان میں داخل کر دیتا۔ جیسے امریکہ نے ویت نام میں اور پھر عراق میں داخل کی تھیں۔ یا ایران اور عراق اپنے مسائل حل کرنے کی بجائے ایک دوسرے پر کیوں پل پڑتے' یا بھارت پاکستان کا ایک بازو یوں آسانی سے کیسے کاٹ کر الگ کر لیتا اور دوسرے اسلامی ممالک چپ چاپ کیوں دیکھتے رہ جاتے' یا کشمیر کا مسئلہ خود ممالک اسلامیہ کے سامنے سرد خانے میں کیوں منتقل ہو جاتا اور اہل کشمیر اپنے بنیادی حقوق حاصل کرنے کیلئے جو بے مثال قربانیاں برسوں سے دے رہے ہیں ان کی طرف سے اقوام متحدہ منافقت کا ریکارڈ کیوں قائم کرتی۔

مگر اس طرح کی صورت حال کا یہ مطلب یقیناً نہیں ہے کہ ہم مستقبل سے مایوس ہو جائیں اور منزل تک کی طویل مسافت کو طے کرنے کی بجائے پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں۔ اکیسویں صدی ہمیں خبردار کر رہی ہے کہ وقت گزرا جا رہا ہے اور وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا اگر ہمیں ایک شان اور ایک وقار سے زندہ رہنا ہے تو ہم صرف باہمی اخوت اور تعاون ہی کی صورت سے زندہ رہ سکتے ہیں' چنانچہ ہم میں سے ہر فرد کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ اپنے حلقہ اعزہ اور دائرہ تعارف میں' ممالک اسلامیہ کے درمیان اس اخوت کی شدید ضرورت اور زبردست اہمیت کو اپنے قول و فعل سے واضح کرتا رہے اور یوں ملت واحدہ کی منزل کو ہر سانس کیساتھ قریب تر لاتا رہے۔ اکیسویں صدی عیسوی میں اگر مسلمانان عالم کو ایک آن اور انا کیساتھ زندہ رہنا ہے تو پھر اسلامی نشاۃ ثانیہ کے منشور کی سب سے پہلی اور سب سے ضروری شق یہی ہے۔

(بشکریہ العارف' لاہور)

ڈاکٹر جمیل جالبی

اکیسویں صدی اور عالم اسلام

جدھر جائیے' اخبارات اٹھائیے' مضامین پڑھیے' گفتگو کیجئے' ہر طرف' ہر محفل' ہر مجلس میں اکیسویں صدی کا ذکر ضرور آتا ہے۔ ہر شخص یوں انتظار کر رہا ہے جیسے اکیسویں صدی من و سلویٰ کی صدی ہوگی' ہر طرف خوشیوں کا بازار گرم ہوگا اور ہر طرف امن و آشتی کا دور دورہ ہوگا اور وہ سب کچھ ہوگا جس کی اس ارض خاکی پر حیوان ناطق کو ضرورت ہوگی۔ اگر ایسا ہے تو میں بھی اس صدی میں مسرتوں سے لبالب بھری زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوں گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خیال آیا کہ کیوں نہ تاریخ انسانی کی ورق گردانی سے اکیسویں صدی کی فال نکالی جائے تاکہ آنے والی صدی کی ایک تصویر نظروں کے سامنے آجائے۔ معاً خیال آیا کہ اب سے تقریباً اکیس سال پہلے بھی جو چودھویں صدی ہجری ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئی تھی اور پندرھویں صدی ہجری نے وقت کی دہلیز پر قدم رنجہ فرمایا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اہل پاکستان نے اس صدی کا بھی ایسے ہی انتظار کیا تھا' جس طرح اکیسویں صدی عیسوی کا کر رہے ہیں' لیکن ہوا یوں تھا کہ ایک دن مغرب کے وقت' جب دونوں وقت ملتے ہیں' پندرھویں صدی ہجری طلوع ہوگئی تھی اور پھر دو چار مہینے کے شور شرابے اور جذباتی عمل کے بعد یہ بھی وقت کی ریت پر اسی طرح جا سوئی تھیں جس طرح تیرھویں صدی عیسوی میں بغداد پر تاتاریوں کے حملے کے بعد ہماری صدیاں خواب غفلت کی چادر لے کر گہری نیند جا سوئی تھیں اگر یہ منظر ہماری نسل نے اکیس سال پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا تو اب اکیسویں صدی کی آمد بھی ہمارے لئے ایسی ہی ہوگی۔ ممکن ہے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کی رات کو ہمارے نوجوان سڑکوں پر نکل آئیں اور پٹاخے چلا کر' پھلجھڑیاں چھوڑ کر اور رنگ برنگ کے گولے فضا میں داغ کر ذرا دیر کو زندگی کی جذباتی و رومانی رونقوں میں اضافہ کر دیں اور پھر وہی دن ہوں اور وہی راتیں جن سے ہم گزشتہ سات سو سال سے گزر رہے ہیں ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

اگر اکیسویں صدی کو یوں ہی آنا ہے جیسے ہر دن اور ہر رات آتے ہیں تو پھر اکیسویں صدی کا انتظار فی الحقیقت کیا معنی رکھتا ہے؟

مجھے تو کچھ یونہی معلوم ہوتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ زندگی کا ایک سیدھا سادا اساداتی اصول ہے کہ آپ جو آج بوتے ہیں کل وہی کاٹتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ آج جو بوئیں اور کل گندم کاٹیں۔ آج ہم نے جو کچھ بویا ہے اور جو کچھ بوئیں گے وہی اکیسویں صدی میں کاٹیں گے۔ اپنے چاروں طرف نظر دوڑایئے تو آپ دیکھیں گے کہ ہم نفرتیں بو رہے ہیں' ناانصافیوں سے معاشرے کی جڑیں کاٹ رہے ہیں' ہر شخص ایک دوسرے کے حقوق سلب کر کے اپنا الو سیدھا کر رہا ہے' جبر ہمارا مزاج ہے' استحصال اور ناانصافی ہمارا مسلک ہے' فرقہ پرستی اور قبائلی انداز نظر ہمارا اصول حیات ہے' اختلاف ہماری عادت ہے اور اسی لئے جہاں اختلاف نہیں ہے وہاں ہم اختلاف کا بیج بو کر نئے نئے فتنوں کو جنم دے رہے ہیں' اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا کر نئے نئے فرقوں کو اس لئے جنم دے رہے ہیں تاکہ ہم وقتی طور پر سیاسی فائدہ اٹھا سکیں' اسلام کے نام پر مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ سب کچھ ذرا ذرا سے ذاتی فائدوں کے لئے کور چشمی اور بے حیائی سے اس طرح کر رہے ہیں کہ ہمارا ضمیر بھی مر گیا ہے۔ جبر کی کھیتی میں نفرتوں کی کھاد اور افتراق واختلاف کے بیج ڈال کر ہم تیزی سے اکیسویں صدی کی طرف سفر کر رہے ہیں اور نادانی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اکیسویں صدی ہمارے لئے گل وگلزار بن کر خوشیوں کی خوشبوئیں بکھیرنے والی صدی ہو گی۔

غور کیجئے کہ اوپر سے نیچے تک کتنے لوگ ہیں جو آج بامعنی وبامقصد زندگی گزرانے کا دعوی کر سکتے ہیں جسے دیکھئے رزق حلال وحرام سے بے نیاز ہو کر دولت بٹورنے کے عمل میں دن رات لگا ہوا ہے۔ زر پرستی ہماری زندگیوں میں اس طرح در آئی ہے کہ خدا سے پناہ مانگنے کی خواہش بھی باقی نہیں رہی۔ ہم بے عمل' بے مقصد اور بے معنی زندگی گزار کر اپنے معاشرے کے پانی کو اتنا گندہ وغلیظ کر چکے ہیں کہ اب اس میں سے نکلنے والی تیز بدبو ناک کے بال تک جلائے دے رہی ہے یہ جو کچھ ہو رہا ہے آپ بھی اسی طرح جانتے ہیں جس طرح میں جانتا یا محسوس کرتا ہوں' لیکن ہم علاج سے گریزاں' عمل وتدبیر سے دور' بے عملی کی بیساکھیوں پر گھسٹ رہے ہیں اور بقول سرسید:

"ہماری قوم کی مثال اس شخص کی ہے جو طبیب سے نسخہ لکھوالے اور دوا کا استعمال نہ کرے اور چاہے کہ صرف نسخہ لکھوالینے سے بیمار کو شفا ہو جاوے"

موجودہ صورت حال میں مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم شاید اکیسویں صدی میں بھی اسی صورت سے زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ غور کیجئے کہ ہم نے اپنے عمل سے اپنی فکر سے' اپنی جدوجہد وتدبیر سے ابھی کون سی تیاریاں کی ہیں کہ اکیسویں صدی' ہماری زخموں سے نڈھال بیسویں صدی سے کچھ مختلف ہو گی۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مغربی دنیا کے جو تیور ہیں' ہوائیں جس سمت چل

رہی ہیں' ان کے حساب سے اکیسویں صدی ہمارے لئے نئے مسائل و مصائب کی صدی ہو گی اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی دنیا کی ساری اقوام نے اپنی منزل مقرر کر کے اکیسویں صدی میں نہ صرف داخل ہونے کی تیاریاں کرلی ہیں بلکہ دس سال پہلے ہی اس صدی میں داخل ہو چکی ہیں۔

قومیں علم و آگہی سے بنتی اور ترقی کرتی ہیں۔ قومیں نفرتوں' بے معنی اختلافات اور فسادات سے نہیں بلکہ اتحاد' اتفاق اور تدابیر سے آگے بڑھتی ہیں۔ ہم اس سطح پر بھی دنیا کی بیشتر اقوام سے کمزور اور پیچھے ہیں۔ ہم "اقراء" کی تلاوت کرتے ہیں اور باآواز بلند کرتے ہیں' علم کے تعلق سے اللہ اور رسولؐ کے احکام کا بار بار اعادہ کرتے ہیں' لیکن حصول علم کے شوق و جذبہ سے عاری ہیں۔ اس صورت میں اکیسویں صدی' جو آٹھ سال بعد آنے والی ہے' وہ بھی ہمارے لئے یقیناً جہل و لاعلمی کی صدی ہو گی اور وہ اس لئے بھی کہ ہم نے جو کچھ آج بویا ہے وہی کل کاٹیں گے۔

میں سوچتا ہوں کہ ہم ہر دم اسلام اسلام کی تسبیح پڑھتے ہیں' لیکن اپنے عمل سے ہم نے اپنے باطن میں اسلام کو مسترد کر رکھا ہے ہم انفرادی و اجتماعی طور پر احکام قرآن کی جس طرح کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہے ہیں وہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ہم نے اسلام کا نسخہ تو لکھوا لیا ہے لیکن نسخے میں لکھی ہوئی دوا استعمال کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ معاملات زندگی اور معاملات انسانی کے تعلق سے قرآن پاک میں جو ہدایات آئی ہیں آپ ان کی فہرست مرتب کر لیجئے اور اس فہرست کو اپنے اعمال سے ملا کر دیکھئے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ ہم اسلام کے حوالے سے کہاں کھڑے ہیں؟ ہماری موجودہ روش سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی یہی صورت برقرار رہے گی۔

اکیسویں صدی کے تعلق سے ایک بات مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔ ہم سب اسلام کا ہر وقت نام لیتے اور شور مچاتے ہیں' لیکن اس کی ہدایات پر عمل نہیں کرتے' ہمارے شور شرابے کی وجہ سے دشمن اسلام تو بیدار ہو گیا ہے لیکن ہم خود اس کی حکمت عملیوں سے غافل ہیں۔ اس وقت ساری مغربی دنیا اور امریکہ میں "بنیاد پرستی" کا لفظ کثرت سے بار بار استعمال ہو رہا ہے اور یہ عیسائی تصور' شور مچانے والے بے عمل اور غافل مسلمانوں کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ساری استعمار پسند' سرمایہ دار مغربی اقوام متحد ہو کر اسی طرح بنیاد پرستی پر حملہ آور ہوں گی جس طرح ان سب نے مل کر اشتراکیت پر ہلا بولا تھا۔ اب ان سے مقابلہ کرنے والا سوویت روس' میخائل گورباچوف کے ہاتھوں' ختم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ اب انہیں اپنے حریف کے طور پر صرف مسلمان نظر آ رہے ہیں جو شور مچا رہے ہیں لیکن آگے بڑھنے کی تدبیر سے غافل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی اسی کام کے لئے وقف ہو گی جس میں بنیاد پرستی کو ختم کرنے اور محکوم بنانے پر عمل درآمد

ہوگا۔ ایک طرف ہندوستان ہوگا اور دوسری طرف اسرائیل ہوگا جن کے سروں پر امریکہ اور اسکے اتحادیوں کا دستِ شفقت ہوگا اور بیچ میں اختلاف و احساس کمتری کی ماری، غیر متحد اور بے شعور و بے تدبیر مسلم دنیا ہوگی جسے بنیاد پرست کہہ کر محکوم بنانے کی تدبیریں کی جا رہی ہوں گی۔

یہ تصویر یقیناً پریشان کن ہے، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ خیالی دنیا میں مگن اور مست رہنے کے بجائے ہم اس صورت حال کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھیں تاکہ اس سے وہ شعور پیدا ہو جس سے تدبیر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

اگر آپ بیسویں صدی پر نظر دوڑائیں تو یہ صدی اپنے زخموں سے چور اور لہولہان ہے۔ اس وقت فکری سطح پر بیسویں صدی کے پاس کوئی نظام فکر موجود نہیں اور ساری اقوام عالم نئے نظام اور نئی فکر کی تلاش میں سرگرداں ہیں تاکہ اکیسویں صدی میں وہ اعتماد کے ساتھ داخل ہو سکیں۔ انیسویں صدی نے اہل مغرب کو دو نظام فکر دیئے تھے:

ایک وہ نظام استعمال تھا جس پر چل کر مغرب نے ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا تھا اور اپنی سائنسی ترقی کی مدد سے ایک ایسا استعمال پسند سرمایہ دارانہ نظام قائم کیا تھا جس کا مزہ وہ بیسویں صدی میں خود بھی دو عالمگیر خونیں جنگوں اور ایک تیسری سرد جنگ کی صورت میں چکھ چکی ہے۔ بیسویں صدی میں یہ منظر ہم نے خود دیکھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ سب مغلوب و محکوم اقوام پھر آزاد ہونا شروع ہوئیں اور آج دنیا کی بیشتر اقوام آزاد ہو چکی ہیں۔

دوسرا مارکسی اشتراکی نظام تھا، جس نے بیسویں صدی کے انسان کو جنت ارضی کا خواب دکھایا تھا اور ایک عشرہ پہلے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ نظام اندر سے کھوکھلا ہو کر اس طرح بیٹھ گیا جس طرح زلزلے کے ایک شدید جھٹکے سے کوئی کمزور بنیاد اونچی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ اس وقت ساری دنیا ایک نئے نظام کی تلاش میں ہے۔ ایک ایسا نظام عدل و مساوات جس سے دنیا میں امن و انصاف پر مبنی معاشرہ قائم ہو سکے اور حسن اتفاق سے اس وقت اسلام ہی وہ نظام فطرت ہے جو دنیا کے سارے مادی، فکری اور روحانی تقاضے پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس طرح ہم اور ساری دنیا ایک نئے عہد کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔

یہ صورت حال، جو آج موجود ہے، صدیوں میں کبھی کبھار پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ کام صرف شور مچانے اور اسلام کا صرف ڈھول پیٹنے سے نہیں ہو سکتا بلکہ تدبیر و تفکر سے اسلام کو عالمی فکری طاقت بنانے سے ہو سکتا ہے۔ اسلام کو عہد حاضر کی زبان اور اسلوب میں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ "بیسویں صدی کے تاتاریوں" کی روح کو مسخر کیا جا سکے یہ کام اختلاف کے فتنے جگانے، محض اپنی سیاسی

دوکان چمکانے کے لئے اپنے معاشرے کے باطن میں فرقہ پرستی کو ابھارنے' جہل اور غفلت سے نہیں ہو سکتا' اس کیلئے ہمیں اپنے ذہن کے بند دریچوں کو کھولنا ہوگیا۔ ہمیں اس وقت امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کی ضرورت ہے جو کھلے دل ودماغ سے عہد حاضر کے مسائل کو سمجھ کر اس کا حل تلاش کریں اور اسے ایک نظام کی صورت میں پیش کریں۔ سچے دین فطرت کی ترویج واشاعت کا ایسا اچھا موقع بیسویں صدی کے خاتمے پر آج صدیوں بعد آیا ہے۔ خدارا اسے ضائع مت کیجئے اسی علم سے اسی راستے سے آپ اکیسویں کو اپنی صدی بنا سکتے ہیں۔ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا۔ اس میں آگے دیکھنے' بڑھنے' اور سوچنے والے ایسے معاشرے کو جنم دینے کی ضرورت تھی جو ساری دنیا کیلئے مثال و نمونہ بن سکتا' لیکن ہم نے اس معاشرے کو ناانصافیوں کا گہوارہ' جبر واستحصال کا گڈولنا بنا کر بے ایمانیوں اور زر پرستی کا بازار بنا دیا ہے اس صورت میں اکیسویں صدی ہمیں اور اکیسویں صدی کو ہم کیا دے سکیں گے؟ یہ سوال ہماری لوح تقدیر پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا لٹک رہا ہے۔

اکیسویں صدی کے تعلق سے ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ کوئی دوسال کا عرصہ ہوا امریکہ کے ایک دانشور فرانسس فوکویاما کی ایک کتاب "The End of History and the Last Man" کے نام سے شائع ہوئی جس میں سوویت روس کے ٹوٹنے کے عمل کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا معاشرتی' معاشی وسیاسی نظام مارکسزم و سوشلزم کے آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہے کیونکہ وہاں ایک ایسا غیر طبقاتی معاشرہ موجود ہے۔ جہاں ہر شخص اپنی پسند کی ہر چیز حاصل کر سکتا ہے اسی لئے فوکویاما صاحب فرماتے ہیں کہ

"آپ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ امریکی معاشرے میں مالدار روسی اور چینی بستے ہیں اور روس وچین میں غریب امریکی آباد ہیں جو مالدار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں"

وہ لکھتا ہے کہ اس اعتبار سے امریکی معاشرہ مارکسی نظام کے آخری مرحلے پر کھڑا ہے اور اسی لئے کہا جاسکتا ہے اور یہ اس کا نظریہ ہے کہ اب ان معنی میں تاریخ کا عمل ختم ہوگیا ہے اور اب آئندہ نظریاتی جنگوں کا کوئی امکان نہیں ہے آزاد جمہوریت یعنی لبرل ڈیموکریسی کا نظام قائم ہو چکا ہے اور ساری دنیا اب اسی نظام کی طرف سفر کر رہی ہے۔ یہی انسانی نظام کی آخری منزل ہے وہ لکھتا ہے کہ اس نظام کی کامیابی کی دو وجوہ ہیں:

ایک یہ کہ اس معاشرے نے سائنسی ترقی سے نیچر کو مسخر کر لیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو معاشرے سائنس وٹیکنالوجی کے اعتبار سے جتنے طاقت ور ہوں گے وہ ان معاشروں پر غالب وحاوی رہیں گے جو سائنس وٹیکنالوجی کے اعتبار سے کمزور ہیں۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ سائنس کے ذریعے

فطرت کو مسخر کرنے والے معاشرے بہتر انتظام کے حامل ہیں اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے تجارتی اداروں، منڈیوں اور سرمایہ دار صنعت کاروں اور تاجروں کے ذریعے اپنی اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا بہترین ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر خود کو پہچانے جانے کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ آزاد جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس کے اندر رہ کر ہر شخص تدبیر و محنت سے اپنی اس خواہش کو پورا کر سکتا ہے اور یہ بات کہہ کر فوکویامایہ باور کراتا ہے کہ

"بس یہی وہ نظام ہے جسے اب دوام حاصل ہو گا"

غور کیجئے تو یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے سرمایہ دارانہ نظام نے فلاحی مملکت اور معیار زندگی کے تعلق سے جو کچھ حاصل کیا اسے جبر و استحصال، استعماریت، نو آبادی نظام اور دنیا کی عظیم تہذیبوں کو تباہ و برباد اور ان کے وسائل پر قبضہ کر کے حاصل کیا ہے اور آئندہ بھی وہ یہی کرے گا۔ اس کی ایک جھلک ہم خلیج کی جنگ میں دیکھ چکے ہیں۔ ملت اسلامیہ کے مرکز بغداد کی تہذیب تیرھویں صدی عیسویں میں تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی تھی، جس کے باعث ہم سات سو سال سے آج تک پس ماندہ، کمزور اور بے اعتماد چلے آرہے ہیں اب "بیسویں صدی کے تاتاریوں" نے دوبارہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا کر نہ صرف سارے مشرق وسطیٰ کے وسائل پر قبضہ کر لیا ہے بلکہ اپنی گرفت کو مزید مضبوط کرنے کیلئے نئی نئی تدبیریں کی جارہی ہیں یہ ہے وہ لبرل ڈیموکریسی جسے فوکویاما انسانی نظام کا آخری مرحلہ کہتے ہیں، جس میں دور بربریت کا اصول "جسکی لاٹھی اسکی بھینس" کار فرما ہے اور اسی اصول کے پیش نظر امریکہ کے ایک اور دانشور جوزف نی (Joseph Nye) کہہ رہے ہیں کہ

"امریکہ اور سارا مغرب بنیاد پرستی، کے خلاف نعرہ لگا کر صف آرا ہو رہا ہے"

مثنوی مولانا روم، تیرھویں صدی عیسوی میں بغداد کی تباہی کے بعد مسلم امہ جس صورت حال سے دوچار تھی، اس کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ اسی لئے اس میں ایسی حکایات کے ذریعے اعتماد بحال کرنے اور مایوسی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی اس وقت مسلم امہ کو ضرورت تھی۔ مولانا روم نے ایک حکایت[۵] میں لکھا ہے کہ ایک جنگل میں ایک زبردست شیر رہتا تھا، جو ہر روز کئی جانوروں کو مار کر کھا جاتا تھا۔ سارے جانور پریشان تھے کہ کیا کریں۔ انہوں نے جنگل کے سارے جانوروں کا اجلاس بلایا اور غور و فکر کے بعد طے کیا کہ ہر وقت موت کے خوف میں مبتلا رہنے سے بہتر ہے کہ قرعہ کے ذریعے روز ایک جانور، جس کا نام نکلے، خود شیر کے پاس چلا جائے۔ اس پر سب نے اتفاق کیا۔ شیر کو اس بات کی اطلاع دے دی گئی۔ روز قرعہ پڑتا اور جس کا نام نکلتا وہ از خود شیر کے پاس چلا جاتا۔ ایک

دن ایک خرگوش کا نام نکلا اور وہ حسب دستور شیر کی طرف چل پڑا۔ یہ وہ خرگوش تھا جس نے اجلاس میں جب یہ فیصلہ سنا تھا تو اپنے دل میں کہا تھا کہ وہ ایسی تدبیر کرے گا جس سے شیر سے ہمیشہ کے لئے گلو خلاصی ہو جائے گی۔ اور جب اس کی باری آئی تو اس نے تدبیر سوچ لی تھی۔ خرگوش جان بوجھ کر دو گھنٹے کی تاخیر سے شیر کے پاس پہنچا۔ شیر بھوک کے مارے غصے میں غرا رہا تھا اس نے جو ننھے خرگوش کو اپنی طرف آتے دیکھا تو غصہ سے بھڑک اٹھا۔ خرگوش نے شیر کو اس حالت میں دیکھا تو عرض کیا:

"حضور! مجھے تو صبح ہی بھیج دیا گیا تھا اور مجھے ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ ایک اور خرگوش کو بھی بھیجا گیا تھا۔ ہمیں راستے میں آپ جیسا ایک اور شیر مل گیا اور ہم پر جھپٹ پڑا۔ میں مشکل سے بچ کر آپ تک پہنچا ہوں جب کہ میرے دوسرے ساتھی کو وہ مار کر کھا گیا"

شیر یہ سن کر غصہ میں آگیا' پوچھا "وہ شیر کہاں ہے؟"

خرگوش نے کہا: "وہاں ہے"

اور اس راستے پر چل پڑا۔ آگے آگے خرگوش' پیچھے پیچھے شیر' چلتے چلتے وہ اسے ایک کنویں پر لے آیا اور کہا "حضور وہ اس کے اندر ہے"

شیر کنوئیں پر آیا اور جھانکا تو دیکھا کہ ایک ویسا ہی شیر کنوئیں کے اندر ہے۔ اسے دیکھ کر وہ غرایا تو دیکھا کہ کنوئیں کے اندر کا شیر بھی غرا رہا ہے اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے کنویں میں کود گیا۔ خرگوش نے حسنِ تدبیر سے اس طرح سارے جنگل کو شیر سے نجات دلوا دی۔

یہی وہ تدبیر ہے جس کی تیرھویں صدی میں مولانا روم نے تلقین کی تھی اور یہی وہ تدبیر ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ اسی تدبیر سے ہم 'بیسویں صدی کے تاتاریوں' کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسلام کا نام لے کر صرف شور مچانے سے ہم اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ تدبیر اور عمل سے 'اتحاد تفکر و تدبر سے ہم اکیسویں صدی کو اسلام کی صدی بنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ بصورت دیگر اکیسویں صدی ہمارے لئے ایک ہولناک صدی ہوگی۔

گفتند جهان ما آیا بتومی سازد
گفتم که نمی سازد' گفتند که برهم زن

کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا زمانہ

نقطہ نظر

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی
مدیر اعلیٰ ماہنامہ "التسخیر" لاہور

اکیسویں صدی اور علماء کرام کا رویہ اور کردار

اب تک کیا ہوا؟ اور اب کیا ہونا چاہیے؟

اکیسویں صدی شروع ہو چکی ہے۔ بیسویں صدی بہت سے عالمی و علاقائی، سیاسی و سماجی، تہذیبی و معاشی اور انتظامی و اخلاقی مسائل کو اپنے پہلو میں لیکر محو سفر رہی۔ بہت سی خوشگوار اور اتنی ہی تعداد میں ناگوار یادوں کے ساتھ اپنا سفر سمیٹ رہی ہے یا سمیٹ چکی ہے بہت سے اعتبارات سے بیسویں صدی بہت کامیاب رہی اور بہت سے زاویوں سے وہ ناکامی کا داغ بھی ماتھے پر سجائے ہوئے ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف بہت سے ایشیائی و افریقی ممالک آزاد ہوئے وہاں دوسری طرف انکے باشندوں کو آزادی کا سفر طے کرنے کیلئے خاک و خون کا سمندر محاورتاً نہیں بلکہ عملاً اور واقعتاً عبور کرنا پڑا۔

الجزائر کو فرانس، انڈونیشیا کو پرتگال اور پاک و ہند کو برطانیہ سے آزادی ملنے کی بڑی بھاری جانی و مالی قربانی دینی پڑی۔ اس طرح سوڈان، مصر، لیبیا، جنوبی افریقہ، زمبابوے اور دوسرے بہت سے ممالک آگ کا دریا پار کر کے ساحل آزادی پر اترے۔

بیسویں صدی میں اسلامی تحریکات بھی پورے زور سے اٹھیں اور انکا راستہ بھی پوری قوت سے روکا گیا خواہ ان تحریکوں کا تعلق مشرق وسطیٰ سے ہے یا برصغیر پاک و ہند اور افریقہ سے اسی صدی میں روس میں بالشویک، چین میں سوشلسٹ اور ایران میں مذہبی حوالے سے انقلاب برپا ہوا بہت سے ممالک ابھرے اور بہت سے بگڑے، سائنس نے اس صدی میں زقندیں لگائیں اور قلانچیں بھر کر ترقی کی، گھٹنوں کے بل چلنے والی سائنس اب برق رفتار کیساتھ آگے بڑھ اور منزلیں سمیٹتی رہی ہے۔ بیسویں صدی میں خلاء تسخیر ہوئی۔ چاند پر انسان نے قدم رکھا اور اسی صدی میں بعض ملکوں کے کروڑوں عوام کو جنگ افلاس اور سیاسی غلامی کی اتھاہ غاروں میں دھکیلا گیا۔

علامہ مرحوم نے یہ مضمون دو سال قبل ہمارے نمبر کیلئے خصوصی طور پر لکھا تھا۔ مضمون انتہائی اہم اور فکر انگیز ہے تاہم ان کے مضمون سے ادارہ کا کلی طور پر متفق ہونا ضروری نہیں۔

بیسویں صدی میں طاقت کے نئے توازن اور زاویے متعارف ہوئے۔ پچھلی صفوں میں رہنے والے ممالک امامت کے منصب پر آگئے اور آدھی دنیا کو غلام رکھنے والے خود اپنے دائروں میں سمٹ گئے امریکہ بہت آگے آگیا۔ اور برطانیہ عظمیٰ اپنے جزائر تک محدود ہو گیا، روس جس طوفانی رفتار سے آگے بڑھا تھا اسی تیزی سے بکھر کر رہ گیا۔ بہت سی سیاسی و عسکری قوتیں بگولے کی طرح اٹھ کر آندھی کی مانند پورے عالمی افق پر چھا گئیں مگر جلد ہی گردبن کر بیٹھ گئیں۔ بعض سائنسی ایجادات نے بیسویں صدی میں دنیا کو آپس میں مربوط کر کے اسے "گلوبل ویلج" بنادیا مگر یہ بھی سچ ہے کہ تہذیبی و مذہبی اعتبار سے دنیا کے اندر بہت وسیع خلیج بھی حائل ہوئی اور بعض عالمی مفکروں اور دانشوروں نے بات "تہذیبی تصادم" تک پہونچادی بلاشبہ بیسویں صدی میں اقوام متحدہ قائم ہوئی اور دنیا کو ایک عالمی پلیٹ فارم میسر آیا ہتھیار کی زبان کی بجائے قانون، مذاکرات اور استدلال کی زبان میسر آئی لیکن یہ بھی اتنا ہی بڑا حادثہ ہے کہ اقوام متحدہ، اسکے منشور، حقوق بشری کی قرارداد اور عالمی عدالت انصاف کے ہوتے ہوئے بھی بہت سی جگہوں پر اسی طرح بزور قوت چڑھائی کی گئی جس طرح کسی دور میں دارا و سکندر اور چنگیز و ہلاکو نے کی تھی، اقوام متحدہ چپ رہی اسکے منشور گونگے ہو گئے قراردادیں طاق نسیاں کی نذر ہوئیں اور عالمی عدالت انصاف ایک فریق بن کر فیصلہ دینے سے گریزاں رہی المختصر یہ کہ سو سال کی کہانی سو الفاظ میں سمیٹنا ناممکن ہے اس کیلئے سینکڑوں کتابیں لکھی جائیں گی۔ تب ایک صدی کا مفصل جائزہ مرتب ہو کر تاریخ کے سپرد ہوگا۔

بیسویں صدی رختِ سفر باندھ اور اکیسویں صدی اپنے پر کھول رہی ہے۔ آج بھی مسائل و معاملات کا وہی ایجنڈا ہے جسے بیسویں صدی ادھورا چھوڑ گئی ہے ویسے بھی انسان کا مسئلہ خود ازان جتنا قدیم ہے۔ مسائل کی اوپری سطحیں بدلی ہیں گہرائی وہی ہے جو قبائلی و جاگیری دور میں تھی صنعتی دور میں صرف مسئلے کی جہتیں بدلی ہیں۔ مسئلہ ہے کیا؟ مسئلہ دو سطروں میں سمٹ آتا ہے مگر یہ حل دو ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔

انسان کا مسئلہ ہے حق زندگی اور وہ بھی آزادی و عزت کے ساتھ رزق اور وہ استحصال کے شکنجے سے آزاد ہو اور امن اور ایسا امن جسے قائم رکھنے کے لئے تلوار کی ضرورت پیش نہ آئے۔ ان تینوں بنیادی مسائل کا حل انبیاء کرام نے الٰہی احکام و تعلیمات کی روشنی میں پیش کیا تھا مگر بعض انسانی طبقات نے اپنی اغراض کے ہاتھوں اس حل کی مزاحمت کی اور اس مسئلے کو آج تک تشنہ تکمیل بنادیا ہے اس بغاوت کے نتیجے پر گزشتہ صدیاں گواہ ہیں کہ انسانی آبادی تو بڑھ گئی مگر حسنِ زندگی برباد ہو گیا۔ وسائل رزق روز افزوں ہیں مگر انکا حصول مشکل کر دیا گیا۔ اور امن ایک ایسا خواب بن کر رہ گیا جسے سوتے میں دیکھا تو جا سکتا ہے جاگتے ہوئے برتا نہیں جا سکتا۔ اکیسویں صدی کا سورج بیک وقت اب تک منکشف ہونے

والے پانچ براعظموں پر چند دنوں بعد طلوع ہونے والا ہے امریکہ اسکا استقبال کیسے کریگا؟ آسٹریلیا اسے کس نظر سے دیکھے گا؟ افریقہ اسے کیونکر خوش آمدید کہے گا؟ یورپ اس سے کس انداز میں ملے گا؟ اور ایشیاء اسکا نظارہ کس طرح کریگا؟ کیونکہ ہر ایک کا اپنا زاویہ نظر اور مسائل کا دفتر ہے۔

عالم اسلام بھی اکیسویں صدی کا استقبال کرنے والی اس دنیا کا ایک اہم اور قابل ذکر حصہ ہے جسے عالمی ایجنڈا کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مسلمان دنیا کی آبا کا پانچواں حصہ ہیں یعنی ایک ارب مسلمان اور عالم اسلام تقریباً چھپن ممالک پر مشتمل ہے جہاں یا تو صد فیصد مسلمان آباد ہیں یا پھر اس ملک کی اکثریتی آبادی مسلمانوں کی ہے، عالم اسلام کے اپنے مسائل ہیں اور پھر عالم اسلام اپنے اندر بیشمار طبقات رکھتا ہے۔ سیاستدان، دانشور، علماء، وکلاء، طلباء، سائنسدان، صنعتکار، زمیندار، اساتذہ وغیرہ اور اسی طرح اسکے بیشمار شعبے ہیں، تعلیم، طب، سائنس، زراعت، صنعت، تجارت، قدرتی وسائل، ریاست، ریاست، بین الاقوامی تعلقات اور رسمی صلاحیت ان میں سے ہر ایک کی اپنی اہمیت ہے گویا اکیسویں صدی کے دن تھوڑے پڑ جائینگے مگر پوری دنیا اور بالخصوص عالم اسلام کے مسائل ان دنوں سے بڑھکر ہونگے۔ یہ انتظار اور منظر بڑا حوصلہ شکن زہر گداز اور قدرے دلچسپ ہوگا کہ یہ مسائل کس طرح حل ہونگے؟

خدا معلوم پردۂ غیب میں ابھی کیا چھپا ہے سائنسدان اپنے نئے عجوبوں سے دنیا کو کس طرح متحیر، مرعوب اور مسحور کرتے ہیں؟ عالمی لیڈر عالمی بساط پر کیا گل کھلاتے ہیں؟ کون سی تہذیب مرتی اور کون سی ابھرتی ہے؟ نئی صدی میں طاقت کا نیا توازن کس طرح قائم ہوتا ہے؟ کون سے نئے جزائر دریافت ہوتے اور کون سے ممالک موت کے گھاٹ اترتے ہیں؟ علم ودانش کے افق پر کون سے نئے چاند وسورج طلوع ہوتے ہیں؟ بین الاقوامی تعلقات کیا کروٹ لیتے ہیں؟ اور سماجی و معاشی میدانوں میں کیا پیش رفت ہوتی ہے؟ یہ سارے سوال اپنا جواب پانے کے منتظر بھی ہیں اور بہت حد تک مضطر بھی!

ایک مفکر ایک لیڈر اور ایک دانشور پیش آنے والے منظر کو بڑے تجسس بڑے غور اور بڑے اندیشے کیساتھ دیکھ رہا ہے اس کے دل ودماغ میں ایک جوار بھاٹا کی کیفیت ہے۔ مہریں ابھرتی اور مٹتی ہیں نقش بنتے اور بگڑتے ہیں، ہر ایک وقت کے قاضی کے فیصلے کا منتظر ہے۔

گزشتہ صدی کا جائزہ اور آئندہ صدی کا مجوزہ خاکہ بہر حال ایک وسیع اور تفصیل طلب موضوع ہے اس وسیع منظر نامے کا ایک بہت ہی مختصر مگر اہم حصہ دینی علماء کا کردار ہے جس کا جائزہ لیا جانا چاہئے۔ چونکہ عالم اسلام میں اسلام کی آواز بہت بلند ہے اور اس کو بلند کرنے اور صدیوں سے بلند رکھنے والے علماء کرام ہیں اس لئے مسلم سوسائٹی کے بناؤ اور بگاڑ میں علما کے کردار کو ایک گونہ اہمیت حاصل ہے اس امر کا جائزہ علماء کے گزشتہ اور آئندہ کردار کو متعین کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کم از کم ایک حلقہ تو اپنے بارے

میں یکسو ہو جائے تاکہ وہ نئی صدی میں اپنا کردار نئے انداز میں ادا کر سکے اور وہ کردار مثبت ہو نئی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو پرانی خامیوں سے پاک ہو۔ اور اکیسویں صدی کے تقاضوں اور عالم اسلام کی ضرورتوں کے شایان شان ہو۔ اگلے صفحات اسی جائزے اور تجزیے پر مشتمل ہیں۔ ممکن ہے بعض جگہ مبالغہ ہو گیا ہو۔ کہیں لہجہ سخت ہو گیا ہو کسی گوشے پر خوش فہمی غالب آگئی ہو کچھ حصے تشنہ رہ گئے ہوں اور بعض مقامات وضاحت طلب ہوں تاہم ایک بات طے ہے کہ نیت کا فتور اور فکری خیانت کہیں بھی نہیں، چنانچہ قارئین اس مضمون کو اسی پس منظر میں پڑھیں اور اگر بذریعہ خط یا ٹیلی فون مجھ سے رابطہ کرنا چاہیں تو میرا پتہ اور فون نوٹ فرمالیں۔

عصر حاضر میں علماء کا سکڑتا ہوا کردار

یہ حقیقت بہت تلخ سہی مگر اسے مان لینا چاہیے اور ماننے کے علاوہ چارہ بھی نہیں کہ عصر حاضر میں روایتی دینی علماء اور مذہبی زعماء کا کردار بالخصوص پاکستانی معاشرے میں سکڑ کر رہ گیا ہے اور برابر سکڑتا سمٹتا چلا جارہا ہے۔ جب کہ دینی مدارس کا ایک وسیع و عریض سلسلہ ہے مساجد کی تعداد ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہے دینی تعلیم کے حصول میں مصروف طلباء بھی لاتعداد ہیں، مذہبی تقریبات کے انعقاد کا غلغلہ بھی چاروں طرف ہے اذانوں کی آواز سے پورا ملک گونج رہا ہے اور صلوٰۃ سلام کے نغمے ہر شہر اور قصبہ تو کیا ہر کوچہ و محلہ سے اٹھ رہے ہیں لیکن بایں ہمہ علماء کا کردار محض رسمی اور ضمنی نظر آتا ہے۔ کہیں بھی قائدانہ اور بنیادی کردار دکھائی نہیں دیتا۔ یہ منظر دیکھ کر ایک گونہ حسرت اور حیرت ہوتی ہے ایک طرف تو دنیا بھر میں اسلام کا چرچا ہے اور جادو بن کر ہر ایک کے سر چڑھ کر بول رہا ہے مغرب اور امریکہ نے اپنی مادی اور بے مزا تہذیب کے جملہ مالی، سیاسی، فکری، ذہنی اور علمی وسائل اسلام کی راہ روکنے اور اسلام پسندوں کا ناطقہ بند کرنے کیلئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ اور مغرب کو سب سے زیادہ پریشانی اگر کسی جانب سے ہے تو وہ اسلام کے بڑھتے ہوئے سیاسی کردار اور فکری و روحانی یلغار سے ہے، امریکہ اور مغرب میں ریسرچ ونگ قائم ہو رہے ہیں نئے فلسفے تراشے جارہے ہیں۔ گوناگوں تہمتیں گھڑی جارہی ہیں اور اکیسویں صدی کیلئے نئے ہدف ڈھونڈھے جارہے ہیں، یہ سارا اہتمام صرف اور صرف اس دین کی روک تھام کیلئے ہے جس کی تہذیب اور فکر اکیسویں صدی کا جلی عنوان اور روشن نشان بنتی دکھائی دے رہی ہے وہ مسلم ممالک جہاں کمیونزم اور مغرب نے اپنے سارے ذرائع صرف کر کے اسلام اور اسکے فلسفے کو سرنگوں اور لوگوں کو اس سے بیزار کر دیا تھا۔ وہاں پھر سے اسلام لوگوں کیلئے نقطہ ماسکہ (Nucleus) اور قوت جاذبہ (Absorbent) بنتا جارہا ہے انڈونیشیا ہو یا الجزائر، ترکی ہو یا سوڈان، وسط ایشیائی ریاستیں ہوں یا اردن اور افغانستان ہو یا سابق یوگوسلاویہ ہر جگہ احیائی عمل اور رجوع الی الاصل زوروں پر ہے لیکن اس کے

ساتھ ساتھ ایک آدھ ملک چھوڑ کر جہاں بھی احیائی اسلامی تحریکیں جاری ہیں۔ وہاں انکی رہنمائی وہ لوگ کر رہے ہیں جو ہیں تو مخلص اور سچے مسلمان۔ لیکن روائتی حلقہ علماء سے ان کا تعلق نہیں اور ان کا شمار باقاعدہ صف علماء میں نہیں ہوتا اسکا مطلب یہ ہوا کہ دین اپنی انقلابی اور فکری کشش سے تہی دامن نہیں کچھ کمی ہے تو اسکے وارثوں اور علمبرداروں میں ہے یعنی

ع رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیانے کا ہے

شیخ الاسلام، شیخ القرآن، شیخ التصوف، ارباب محراب و منبر استادان مکتب اور ارباب جبہ و پستار عوام کے لئے مراجع و مراکز نہیں بن رہے ہے اور سیاسی و سماجی معاملات میں لوگ انکی قیادت پر مطمئن اور ان کی رہنمائی کے طالب نظر نہیں آتے۔ یہ ناخوشگوار واقعہ لحہ فکریہ تو ہے ہی نقطہ اصلاح بھی بن سکتا ہے بشرطیکہ گردو پیش پر کوئی غور کرنے والا اور اپنے انداز پر نظر ثانی کے لئے تیار ہو آخر آج امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے وارث دوسروں کے محتاج اور ضمیمہ کیوں دکھائی دیتے ہیں؟ امام جعفر صادقؒ کے پیرو دوسروں کے ترجمان اور ناطق بنے ہوئے ہیں؟ آج امام ابن تیمیہؒ اور ابن القیمؒ کے معنوی فرزند چھوٹے چھوٹے دائروں میں بند ہو کر کیوں رہ گئے ہیں؟ اور آج مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی فکر کے امین سمٹ کر گوشہ نشین کیوں ہو گئے ہیں؟ موتیوں سے کھیلنے والے آج سنگریزوں سے دل بہلا کر کیوں خوش رہتے ہیں؟ وقت کا امام کہلانے والوں سے کارِ جہاں کی زمام کیونکر چھن گئی ہے؟ اور قافلہ کے سالار کس لئے بے یار و مددگار اور دوسروں کی معاونت کے طلبگار نظر آتے ہیں؟ ظاہر ہے اتنے بڑے حادثے کے کچھ تو اسباب ہونگے کچھ خوشگوار اور کچھ ناگوار،

وقت کرتا ہے پرورش پر سوال
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

ان اسباب کا تجزیہ بھی ضروری ہے اور عصری ضروریات کا جائزہ لینا بھی لازمی ہے اس کے بغیر عروج و زوال کی یہ داستان مکمل نہیں ہوتی یہ موضوع ممکن ہے بعض ماتھوں پر تیوریاں چڑھادے لیکن قوی امکان ہے کہ لاکھوں اہل دل کیلئے یہ ایک ایسا سنگ میل ثابت ہو جس کا اندازہ کرنے میں آسانی رہے گی کہ ہم منزل سے کتنے دور رہ گئے ہیں یا کتنے قریب آگئے ہیں؟ اس بات میں اگر سارا قصور علماء کا نہیں تو تمام بوجھ عوام پر بھی نہیں ڈالا جاسکتا یہ رشتہ الفت اگر ٹوٹا ہے تو کسی کشاکش کی نشاندہی کرنی پڑیگی۔

علماء کرام کے عمومی اور اجتماعی کردار سکڑ جانے کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا ایک سبب یہ بھی سامنے آتا ہے۔ کہ علماء نے فروعات میں غیر معمولی انہماک کا مظاہر کیا ہے۔ فروعات کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے لیکن جتنی فروعات کی ہونی چاہیے، انہیں اساسیات کا درجہ دینا اور توجہات کا مرکز بنانا

دینی و اجتماعی مصالح کے خلاف ہے۔

ایک صحت مند اور بیمار آدمی کی خوراک جسطرح مختلف ہوتی ہے اور اس کا غذائی چارٹ صحت اور مرض کے حوالے سے تیار ہوتا ہے اسطرح دینی معاملات میں معاشرتی ضرورت اور عصری شعور کو سامنے رکھ کر یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ اسوقت کرنے والا کام کون سا ہے۔ صلاحیتوں کا خراج کون سا میدان مانگ رہا ہے؟ اور لوگ کس موڑ پر کھڑے رہنمائی کے طالب ہیں؟ ذہن پر زیادہ زور دیئے بغیر بھی یہ حقائق سامنے آجاتے ہیں کہ اسوقت پوری دنیا قومی تہذیب کی چکا چوند سے چندھیائی ہوئی ہے۔ مادیت کا طلسم طاری ہے بے یقینی اپنی آخری حدوں کو چھورہی ہے۔ آخرت کا تصور دھندلا رہا ہے، مذہب کا وجود لوگوں کیلئے بار گراں بن رہا ہے دنیا بھر میں مجموعی طور پر نظام حکومت نفس پرست لوگوں کے ہاتھوں یرغمال بن چکا ہے۔ سیاست 'جلبِ منفعت اور حصول قوت کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔ معیشت کا ایک ایک رشتہ سود اور استحصال کے نظام میں الجھا ہوا ہے۔ بنیادی انسانی اخلاق قصہ پارینہ کے درجے میں پہنچ رہے ہیں، بر و بحر کے ہر کنارے تک فساد پھیل چکا ہے اور نئی نسل ایک نیا اور منفی جنم لے رہی ہے، حالات اگر یہ ہیں اور حقائق اس قدر تلخ ہیں تو ہر عالم دین کو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ سوچنا چاہیے کہ اسوقت نور و بشر کا مسئلہ اٹھانے کی کتنی ضرورت ہے؟ اور اس موضوع پر دادِ سخن دینے زور تحریر دکھانے اور مناظروں کا میدان سجانے کی کس قدر افادیت ہے؟ جبکہ صورت احوال یہ ہے کہ لوگ خود ذاتِ رسول سے رہنمائی لینے کی بجائے مختلف نظاموں فکر کے خود ساختہ سر چشموں اور نفس کے وسوسوں سے رہنمائی حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اسوقت رفع الیدین اور آمین بالجہر ثابت کرنے کیلئے لٹریچر کی بھرمار آخر کون سی بنیادی ضرورت پوری کررہی ہے۔ جبکہ مسجدیں نمازیوں سے خالی اور صفیں سمٹتی جارہی ہیں ایک بار مسجدیں نمازیوں سے بھر لینے دیں بعد میں دل کی بھڑاس نکال لیجئے۔

اسی طرح علم اور تعزیہ کو ضروریات دین میں شامل کرنے اور اس کی دن رات تبلیغ کرنے اور اسکے لئے ہمہ وقت سر بکف رہنے سے امت کا کیا بھلا ہورہا ہے؟ جبکہ آج دنیا میں خود مذہب کا علم سرنگوں اور اہل مذہب کا بھرم زبوں ہورہا ہے۔ یہی حال دیگر فقہی جزئیات میں بے پناہ دلچسپی اور شغف کا ہے جین اور جوگر کلچر عروج پر ہے اور علماء کرام ابھی تک شلوار کے پائنچے اور تہمد کے کنارے ناپنے پر تلے ہوئے ہیں، ہالی وڈ کی تہذیب اپنی انتہا پر ہے۔ اور علماء کرام چہرے اور ہاتھ کے پردے کے جواز اور عدم جواز پر سینکڑوں صفحات سیاہ کررہے ہیں تہذیب مغرب میں خدا اور رسول کا نام لینا جرم ہورہا ہے۔ اور علماء کرام عمامے اور دستار کے پیچ و خم درست کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یورپ اپنے ثقافتی طائفے لے کر اسلامی تہذیب پر ٹوٹا پڑ رہا ہے اور یہاں علماء متعہ اور حلالہ کی بحث سے فارغ نہیں ہورہے۔ کوے کی حلت

و حرمت اور گھوڑے کی قربانی پر "بیش قیمت اور تحقیقی لٹریچر" مرتب فرمارہے ہیں یہ ٹھیک وہی قسمیں ہیں اور فروعات میں انہماک کا وہی عالم ہے جو کبھی سپین میں عیسائی حلقوں میں مباحث اور گرمئی گفتار کا تھا۔ وہاں بھی یہی ہورہا تھا کہ بتایئے سوئی کی نوک پر کتنے ہزار فرشتے بیٹھ سکتے ہیں ؟ اور حضرت عیسیٰ پر آسمان سے جو روٹی اترتی تھی وہ خمیری تھی یا فطیری ؟ سقوط بغداد کے وقت بھی اسی نوع کے موضوعات زیر بحث تھے ظاہر ہے موضوعات یہ ہونگے تو حادثات بھی اسی طرح کے رونما ہوں گے جس طرح تاریخ میں ہو چکے ہیں، درخت کی جڑ پر تیشہ رکھا ہوا نظر آرہا ہو تو پتوں کی تراش خراش ثانوی چیز ہو جاتی ہے، باغبان برق و شرر سے ملے ہوئے دکھائی دے رہے ہوں تو آشیانے کی فکر کرنا دانائی نہیں پورے گلستان کے بچاؤ کی تدبیر ڈھونڈنا عین حکمت اور تقاضائے اخلاص ہے، جہاں زندہ لوگ بات سننے پر آمادہ نہ ہوں وہاں سماع موتی کی بحث کا کیا حاصل ؟ اور جہاں دل ٹوٹے ہوئے ہوں وہاں تختے جوڑنے پر زور دینے کا کیا مطلب ؟

رجال دین اور عوام کے درمیان اس وقت جو خلیج نظر آتی ہے اسکو زیادہ وسیع اور گہرا کرنے میں علماء کرام کے ذوق فتویٰ طرازی کو خاصا دخل حاصل ہے حالانکہ علماء سے بڑھ کر اس سے زیادہ کون واقف ہو سکتا ہے کہ اسلام کا مزاج فتویٰ نہیں بلکہ تقویٰ ہے، فروغ اسلام اور اشاعت دین میں کسی دور میں بھی کسی مفتی کے فتویٰ نے بنیادی کردار ادا نہیں کیا بلکہ علماء صلحا اور صوفیاء کے تقویٰ نے یہ خدمت سرانجام دی ہے، مگر حیرت یہ ہے کہ اس حقیقت کو جاننے اور اسے اپنے خطبات کا موضوع بنانے کے باوجود علماء اپنے "ذوقِ فتویٰ" پر قابو نہیں پاسکے ہمارے نزدیک --- فتویٰ --- ایک ماہرانہ قانونی اور فقہی رائے کا نام ہے جس طرح کوئی عدالت زیر سماعت مقدمے اور تصفیہ طلب امور میں اٹارنی جنرل، ایڈووکیٹ جنرل یا کسی ماہر قانون یعنی وکیل سے رائے طلب کرتی ہے اسی طرح اسلامی ریاست میں علماء سے کسی مسئلہ کے بارے میں رائے طلب کی جاتی تھی اور اسی کا نام فتویٰ ہے اور آج بھی فقہی و شرعی امور میں عدالتیں ماہرین فقہ اور علماء سے آراء (یعنی فتویٰ) لیتی ہیں اور عدالتیں ان آراء اور فتووں کا بے حد احترام کرتی اور انہیں وزن دیتی ہیں جبکہ فتویٰ فیصلہ نہیں ہوتا جو فی الفور نافذ العمل ہو جائے۔ اور نہ مجاز اور آئینی و قانونی طور پر برسر عمل عدالت سے ہٹ کر اسے کوئی نافذ کر سکتا ہے لیکن ہمارے ہاں فتووں کا زیادہ تر زور فقہی و اجتماعی امور پر نہیں بلکہ مسلکی مخالفین اور بہت ہی چھوٹے مسائل پر رہا ہے بات بات پر دائرہ اسلام سے خارج کردینے کا فتویٰ مذہبی دنیا میں ایک عمومی فیشن بن چکا ہے اور ذرا سے اختلاف پر فتویٰ تیار رہتا ہے کہ فلاں کا نکاح باطل ہو گیا، فلاں کی نماز جنازہ جائز نہیں، فلاں کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، فلاں واجب القتل ہے اور فلاں کافر اور مرتد ہے وغیرہ۔ فتووں کی اس بھرمار نے فتوے کا وقار اور بھرم مجروح کیا ہے اس طرز عمل سے لوگوں کے اندر ایک خاص تاثر بلکہ کسی حد تک رد عمل ابھرا ہے جو

بہر حال علماء کے حق میں مثبت نہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ باطل کی گرفت نہ کی جائے لغویات کا نوٹس نہ لیا جائے۔ منکرات پر نکیر نہ کیجائے اور فکری واعتقادی اور عملی واخلاقی انحراف پر نہ ٹوکا جائے۔ یہ سب کچھ ہو لیکن تھوک کے حساب سے نہیں بلکہ ٹھونک بجا کر! تاکہ الفاظ وحروف کی اہمیت اور افادیت کم اور مشکوک نہ ہو اگر رائے ٹھوس ہو متنازعہ مسئلہ فی الواقع اجتماعی وسماجی اہمیت اور دلچسپی رکھتا ہو۔ بات صحیح موضوع پر کہی گئی ہو دلائل کا معیار اونچا ہو اسکا ابلاغ بہتر اور اسلوب عالمانہ ہو تو اسے معاشرے کا اجتماعی ضمیر ذہنی اور عملی طور پر فوراً قبول کرلیتا ہے۔ قادیانی ذریت کیخلاف دینی زعما کا فتویٰ ہر ایک نے قبول کیا صرف لاباحیت زدہ اور مذہب بیزار لوگوں نے اس میں ذہنی تحفظ کا اظہار کیا۔ اس فتوے کو قبولیت اسلئے ملی کہ اس پر بحث ملک کے سب سے بڑے فورم -- قومی اسمبلی -- میں ہوئی۔ باقاعدہ دلائل دئے گئے فریق مخالف کو صفائی کا پورا پورا موقع دیا گیا تب جا کر فیصلہ صادر ہوا اور آئین پاکستان کا حصہ بنا مگر آئے روز کے فتوے اور ہر بات پر فتوے کا اجراء بہر حال خوشگوار تاثر نہیں چھوڑتے۔ ہم یہ جسارت تو نہیں کرینگے کہ علماء کے ایک دوسرے کے بارے میں فتووں کا ریکارڈ پیش کردیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ شاید ہی کسی مکتب فکر کا کوئی عالم بچا ہو جو کسی نہ کسی فتوئ کی زد میں نہ آیا ہو۔ بریلوی حضرات کیخلاف دیوبندیوں کے فتوے، دیوبندیوں کیخلاف بریلویوں کے فتوے، مقلدین کے غیر مقلدین کے خلاف فتوے اور اہل حدیثوں کے اہل تقلید کیخلاف فتوے یہ سب کچھ کتابوں میں موجود ہے۔ اس رویے سے ایک خاص فضا بنی ہے جس نے ماحول کو زہر آلود اور نفرت انگیز بنادیا ہے۔ فتوؤں کا یہ فراخدلانہ اجراء دراصل مزاج کی تندی طبیعت کی انتہا پسندی اور شخصیت کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ جبکہ عوامی واجتماعی امور میں تندی نہیں نرمی انتہا پسندی نہیں معتدل مزاجی اور شدت نہیں مفاہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ علماء کے اس طرز عمل نے انکے اور عوام کے درمیان پہلے سے موجود اجنبیت کی دیوار کو اور اونچا کردیا ہے اسلئے کہ قائدانہ منصب پر فائز لوگوں کے صرف حسن کردار پر ہی نہیں طرز گفتار پر بھی عوام کی نظر رہتی ہے۔ ویسے بھی یہ عمومی عادت ہے کہ خوبیوں کو اجالنے کا رواج کم اور خامیوں کو اچھالنے کا زیادہ ہے۔ فتویٰ بازی بہر حال ایک خامی ہے اور لوگوں نے اس خامی کو علماء کے خلاف حربے کے طور پر استعمال کیا ہے اور یہ موقع گستاخی معاف خود علماء کرام نے فراہم کیا ہے۔

عہد استعمار کا شاخسانہ

علماء کرام کو اجتماعی سیاسی اور سماجی زندگی کے کاٹ پھینکنے کے اگر بہت سے اسباب وعوامل خود حلقہ علماء کے پیدا کردہ ہیں تو ان میں ایک بڑا سبب انگریزی عہد حکومت ہے جب انگریز نے یہاں قدم جمالیا تو اس نے اپنا نظام تہذیب و تعلیم نہ صرف متعارف کرلیا۔ بلکہ پوری قوت اور جملہ وسائل کے

ساتھ اسے یہاں رائج اور نافذ کیا اور ساتھ اسے غالب کرنے کی ہر ممکن تدبیر بھی کی انگریز کے نظام تمدن میں دین اور سیاست دو الگ چیزیں ہیں اور وہ بہت عرصہ پہلے انگلستان میں چرچ اور سٹیٹ کو الگ کر چکا تھا اسی طرح یہاں بھی فقہی رہنمائی اور سیاسی رہبری کے دو الگ دائرے بن گئے۔ چنانچہ جن لوگوں نے انگریز سے وفاداری کا پیمان باندھا، جنہیں جاگیریں الاٹ ہوئیں جنہیں تمغے ملے جو لوگ لندن یاترا کر کے آئے۔ جو مزاج شناس فرنگ تھے اور دینی زوال پر قانع ہوئے اور دنیوی عروج کے حریص بنے انہیں سیاسی ناخدا بننے کے تمام مواقع مہیا ہوئے بلکہ انہیں مواقع عطا کئے گئے رہ گئے علماء تو وہ درس حریت دینے میں لگے رہے بھلا وہ دو گروہ کس طرح سیاسی و معاشرتی عروج بیک وقت حاصل کرتے جن میں سے ایک انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کر رہا تھا اور دوسرا فرنگیوں کے آگے کاسہ لئے ہوئے تھا۔ ایک فرنگی تہذیب سے الجھنے والا اور دوسرا اسکی طرف لپکنے والا تھا ایک مزاحمت کر رہا تھا اور دوسرا معاونت پر تلا ہوا تھا ایک جزائر انڈیمان کی سزا کاٹ رہا تھا اور دوسرا انگریز کے تلوے چاٹ رہا تھا۔ ایک فرنگی راج کا باغی تھا اور دوسرا اسکی چاکری پر راضی تھا۔ ایک پیٹھ پر کوڑے کھا رہا تھا اور دوسرا میم صاحب کے کتے کو نہلا رہا تھا نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ استعمار کے فریم میں فٹ ہوتے گئے ان کی راہیں آسان ہوتی گئیں اور جو لوگ اللہ و رسول کی چوکھٹ پر پڑے رہے انکے لئے زندگی تاوان بنتی گئی۔ یہ بات پبلک کو سو بار ناگوار گزرے گی مگر یہ واقعہ ہے کہ علماء کے "راندۂ درگاہ" ہونے کا ایک سبب انگریز کے سیاسی اور تہذیبی نظام کا غلبہ ہے آپ اسے علماء کی ضد کہیے یا فرنگی نظام سے کد کہیے وہ بہر حال اس دائرے میں آگے نہ بڑھ سکے اور آج تک وہ برابر سمٹتے اور سکڑتے چلے جا رہے ہیں یا وہ اسکے لیے مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ وہ دن اور آج کا دن ہم ذہنی و فکری طور پر دین اور سیاست کی تفریق کے قائل ہو چکے ہیں اور معاشرتی و سیاسی سطح پر علماء سے رہنمائی کو غیر ضروری قرار دے چکے ہیں اسی طرح لارڈ میکالے کی تعلیمی سفارشات کے نتیجے میں مرتب ہونے والا تعلیمی نظام نیا بندوبست اراضی حکومتی اداروں پر انگریزی اثرات کی یلغار نیا طبقاتی سیٹ اپ اور اسطرح کے دیگر بے شمار عوامل ہیں جو علماء کی شخصیت انکے وقار انکی کارکردگی اور انکے سیاسی کردار پر اثر انداز ہوئے جو آج ذرا زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہو رہے ہیں اپنے کردار کی محدودیت کے حوالے سے صرف علماء ہی مورد الزام نہیں کچھ اور باتیں بھی ہیں جنہیں پبلک اور دانشور سننا نہیں چاہتے یا سن کر ماننے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

لیکن علماء کو چاہیے کہ وہ اس پر اکتفا نہ کرلیں کہ انکے خلاف سازش ہوئی ہے انگریز اور اسکے پروردگان نے انہیں پیچھے دھکیلا ہے اور ایک گہرے منصوبے کے تحت انکو پچھلی صفوں میں بیٹھنے پر مجبور

کردیا گیا ہے۔ بلکہ جو باتیں انکے ذمے لگتی ہیں وہ انکا مقدور بھر ازالہ کریں۔

علماء اگر لاالٰہ کے وارث ہیں تو پھر اپنا کردار قاہرانہ اور گفتار دلیرانہ بنائیں۔ پھر سے اپنی نگاہوں میں وہ جلیاں بھریں جن سے دل سینوں میں کانپ اٹھیں، اپنے سجدوں میں وہ کیف پیدا کریں جس سے روح زمین لرزا ٹھے اور ایسی اذان کو رواج دیں جو شبستانِ وجود میں سحر طلوع کردے۔ اگر کوئی دانشور غیر جانبدارانہ مگر ہمدردانہ تجزیے کے ذریعے ان پہلوؤں کو اجاگر کرے جن سے علما متفق نہ بھی ہوں پھر بھی انہیں ناراض ہونے کی بجائے غور و فکر سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ چڑیاں سارا کھیت چگ گئی ہیں جو دو چار دانے رہ گئے ہیں کہیں علماء اپنے طرز عمل سے وہ بھی نہ گنوا بیٹھیں، عوام کی سادہ لوحی اپنی جگہ مگر علماء کو حقیقت گریزی کی روش اختیار نہیں کرنی چاہیے۔

دینی مدارس کا نصاب تعلیم

اجتماعی معاملات میں علماء کرام سے رہنمائی نہ لئے جانے اور انکے کردار کے محدود ہو جانے میں ایک حد تک مدارس دینیہ میں رائج تعلیم کا بھی حصہ ہے، مروجہ نصاب تعلیم کے ذریعے جو لوگ تیار ہو رہے ہیں انکا ذہن بہت حد تک مکتبی اور انکی اپروچ بہت ہی انفرادی ہے، ہمیں زیادہ قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں کہ الجزائر، مصر عراق اور دوسرے مسلم ممالک میں کون سا نصاب تعلیمی رائج ہے اور وہاں دینی مدارس کا انداز اور اسٹیٹس کیا ہے؟ لیکن برصغیر پاک و ہند میں جو "درس نظامی" رائج ہے اس سے ہم کسی قدر واقف اور آگاہ ہیں۔ یہ نصاب تعلیم جس دور میں مرتب ہوا ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے رجحانات علمی اور ترجیحاتِ تمدنی کے عین مطابق ہو اس لیے کہ اس وقت تک دنیا ابھی "گلوبل ویلج" نہیں بنی تھی اس خطے کے لئے جو کچھ سیاست و ریاست اور مذہب و معاشرت کے لئے درکار تھی وہ درس نظامی مہیا کر رہا تھا لیکن اب اسے پوری طرح نچوڑ بھی لیا جائے تو ایک آدھ لب تر ہو سکتا ہے کسی کی تشنگی نہیں بجھ سکتی، ابتدائی فنی کتب کو چھوڑ کر (جنمیں صرف نحو اور منطق کی کتابیں شامل ہیں) منتہی کتب میں سے جو حصہ جس ترغیب سے پڑھایا جاتا ہے اس سے واعظ جمعہ اور عیدین کے خطیب روائتی مفتی اور فنی مدرس تو تیار ہو جاتے ہیں لیکن عمرانی مسائل سے کماحقہ واقفیت، مجتہدانہ بصیرت، شرعی احکام و قوانین کا عصری تغیرات اور ضروریات پر اطلاق و انطباق اور تمدنی مصالح سے آگہی جیسی خوبیاں اس نصاب تعلیم اور طرز تدریس سے قطعاً پیدا نہیں ہوتیں، مثلاً فقہ کی تدریس میں طہارت، وضو اکل و شرب کے آداب، نکاح، طلاق، اور پہننے اوڑھنے کے مسائل تو پوری شرح و بسط اور تفصیل و تحقیق کے ساتھ پڑھائے جاتے ہیں لیکن حدود معاملات بین الاقوامی معاہدوں اور تعلقات، اصول جنگ اور صلح کا باب جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں سے سرسری گزر جانے پر قناعت کی جاتی ہے۔ بہت کم لوگ ان امور میں مہارت اور ممارست پیدا کر پاتے

ہیں۔ آخر یہی فقہ تھا جو کسی دور میں مختلف ملکوں اور حکومتوں میں پبلک لاء کے طور پر نافذ رہا، ائمہ فقہ نے اجتہادی بصیرت اور بڑی جگر کاری کے ساتھ اخذ و استنباط سے کام لیا اور دینی احکام کی تمام علتوں اور مصلحتوں کو خوب واضح کیا تب جا کر یہ فقہ ریاستی دستور العمل کا درجہ پانے میں کامیاب ہوئی اور ایک لحاظ سے فول پروف فقہی نظام رائج ہوا لیکن آج مشکل سے ایک آدھ آدمی ملے گا جو مجتہدانہ بصیرت اور تحقیقی نشان کے ساتھ ان احکام کے قالب میں روح عصر سمونے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو ورنہ جو کچھ کتابوں میں ہے اس کا ترجمہ کر دینے کو علم کی معراج سمجھ لیا گیا ہے۔ اور اسکی گردان کو فقہی بصیرت یہی صورت دورۂ حدیث کی ہے وہاں بھی زیادہ زور فنی مباحث پر رہتا ہے یا اپنے اپنے فقہی مسلک کی تائید پر اور اب تو حال یہ ہے کہ جو جس گروہ سے وابستہ ہے وہ ان متنازعہ مسائل کو حدیث کی روشنی میں صحیح ثابت کرنے کو "علم الحدیث" کہتا اور اپنے آپ کو "محدث" قرار دیتا ہے حالانکہ حدیث حضور اکرم ﷺ کے قول مقدس اور عمل مبارک کا تاریخی ریکارڈ ہے اور الہی نظام اور نبویؐ معاشرت قائم کرنے کا سرچشمہ جبکہ آج دنیا جس فکری الحاد، عملی ارتداد، معاشرتی انحطاط، معاشی استحصال اور تمدنی زوال کا شکار ہے اسے دوبارہ صحتمند اور پاکیزہ اور منصفانہ بنانے کے لئے وہ تمام ضروریات اور تقاضے احادیث رسولؐ اور اسوۂ پیغمبرؐ میں موجود ہیں جنہیں بروئے کار لانا وقت کی ڈیمانڈ ہے۔ مگر یہ چیزیں اس طرز تدریس حاصل نہیں ہو سکتیں جو اس وقت مدارس میں رائج ہے کچھ اس طرح کا سلوک مدارس کے اندر قرآن مجید کے ساتھ روا رکھا گیا ہے وہ کتاب جو نصاب انقلاب ہے جو نور مبین ہے جو محکم صحیفہ ہے جو دستور حیات ہے، جو صحیفہ علم و حکمت ہے جو بندوں پر اللہ کی آخری اور روشن برہان ہے اور حق و باطل کیلئے قطعی میزان ہے اس چشمہ ء فیض سے عرب کا صحرا سیراب ہوا نئی تہذیب نے جنم لیا زندگی کے اچھوتے قاعدے ترتیب پائے، اور اسلامی ریاست قائم ہوئی لیکن مروجہ درس نظامی میں قرآن مجید کے لئے کوئی خاص گوشہ اور وقت مختص نہیں صرف دو تفاسیر جلالین اور بیضاوی پڑھائی جاتی ہیں جو کسی حد تک صرفی و نحوی ضروریات تو پوری کرتی ہیں لیکن قرآن حکیم کے الہامی و انقلابی پیغام کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں دیتیں، جلالین کہنے کو تفسیر تو ہے لیکن خود متن قرآن سے بھی مختصر اور اسی طرح بیضاوی فنی مباحث کا مجموعہ ہے جس سے زندگی میں کوئی حرارت پیدا نہیں ہوتی حالانکہ قدیم اور جدید تفاسیر ایسی کتابیں موجود ہیں جنہیں پڑھ کر قرآن مجید کے الہامی کتاب اور انقلابی نصاب ہونے پر بندے کو از سر نو یقین آتا ہے لیکن یہ تفاسیر درس نظامی کا حصہ آج بھی اس لئے نہیں بن سکیں کہ ملا نظام الدین سہالوی کا مرتب کردہ "درس نظام" حرفِ آخر قرار پا چکا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ان تفسیروں سے ہمارے علماء کے فرقہ وارانہ مزاج کی بھی تسکین نہیں ہوتی اس لئے ان میں دلچسپی نہیں لیجاتی ظاہر ہے جو طالب علم اس نصاب تعلیم سے گزر کر اور

اس طرز تدریس کے مطابق پڑھ کر عالم بنے گا وہ یک رخا کردار تو ادا کر سکے گا جامع کردار ادا کرنا اس کیلئے ممکن نہیں ہوگا اس کے نتیجے میں معاشرہ اس کے لئے اجنبی اور وہ معاشرے کے لئے اجنبی ہوگا۔

بہت ہی معذرت کے ساتھ مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ روح عصر سے صرف نظر کا رویہ سب سے زیادہ علما کرام کے ہاں رائج ہے اور یہ حضرات ایک خاص نفسیاتی فضا میں سانس لیتے اور ایک مخصوص زاویے سے زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں، اس رویے کے باعث عصری معاملات اور مسائل میں ان کا رول روز بروز محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا ہے۔ میں حتمی طور پر نہیں جانتا کہ اس چیز کا ادراک واحساس ان حلقوں میں کس قدر ہے یا بالکل ہی نہیں؟ مگر ہمارے ہاں جو مذہبی لٹریچر تیار ہو رہا ہے اور جس نوع کے مسائل برسر منبر بیان ہوتے ہیں انہیں پڑھ اور سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت اگر نور وبشر کا مسئلہ حل ہو جائے رفع الیدین کا نزاع ختم ہو جائے۔ آٹھ اور بیس تراویح کا معاملہ طے ہو جائے صلوٰۃ وسلام کا جھگڑا رفع ہو جائے۔ اور تعزیے اور ذوالجناح کا مناقشہ تحلیل ہو جائے تو پوری دنیا میں امن قائم ہو جائے گا انصاف پروان چڑھے گا معاشی استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا سیاسی بالادستی کا امریکی خواب دم توڑ جائے گا۔ اخلاقی اقدار کو استحکام نصیب ہو جائے گا، جلسوں کا ریکارڈ دیکھ لیجئے خطبات جمعہ کے کیسٹ سن لیجئے بس یہی موضوعات ملیں گے قبروں پر جانا جائز ہے یا نہیں؟ حضورؐ کے والدین مومن تھے یا نہیں؟ گنبد بنانا ثواب ہے یا مکروہ؟ دسواں اور چہلم مباح ہے یا بدعت؟ لاؤڈ سپیکر میں نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ میلاد کا جلوس نکالنا روا ہے یا ناروا؟ وغیرہ۔ حالانکہ روح کی عصر پکار اور شعور عصر کی ندا ان مسائل سے بالکل مختلف ہے شعور عصر تقاضا کر رہا ہے کہ مغرب کی بے خدا تہذیب کا شکنجہ توڑ کر باخدا تہذیب کا قیام کیسے عمل میں لایا جائے؟ تقلید مغرب میں قائم سیاسی نظام کی جگہ اسلام کا شورائی نظام کس طرح برپا کیا جائے؟ اخلاق باختہ سوسائٹی کو مکارم اخلاق کا گہوارہ کیونکر بنایا جائے؟ شکوک وشبہات میں محصور دنیا کو پھر سے مرکز یقین کیسے بنایا جائے؟ معاشی نظام کو سود سیاسی نظام کو جبر اور زر معاشرتی نظام کو مکر سماجی نظام کو ظلم اور خاندانی نظام کو شکست وریخت سے کیسے بچایا جائے؟ بے قید نجی ملکیت، بے رحم جاگیرداریت، مہاجنی صنعت اور حیاسوز ثقافت سے دنیا کو کیسے نجات دلائی جائے؟ فکری ارتداد اور عملی نفاق سے عالم انسانی کی جان کیسے چھڑائی جائے؟ اور شرق وغرب میں ایمان کی لہر اٹھانے اور عرفان کی بہار لانے کی کیا تدبیر کی جائے؟

یہ ہے روح عصر کا تقاضا اور شعور عصر کا فریضہ جسے پورا کرنا بہر حال ان لوگوں کے ذمے ہے جنہیں وراثت میں انبیاء کے منصب کا شرف حاصل ہے، علم وعرفان کے تین سرچشمے ایسے ہیں اور جن تک خوش قسمتی سے علماء کو رسائی حاصل ہے اگر ان سے فیض اٹھایا جائے تو روح عصر کو قرار اور شعور عصر کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ اور وہ ہیں قرآن مجید، سنت رسول اللہ ﷺ اور سیرت طیبہ۔ لیکن شرط

یہ ہے کہ قرآن حکیم کا مطالعہ مسلکی مصلحت کے مطابق نہیں آفاقی ضرورت کے مطابق کیا جائے تو سچی بات یہ ہے کہ کوئی تفسیر سامنے رکھے بغیر قرآن خود بول کر اپنا مفہوم اور مدعا بیان کر دیتا ہے کہ میں کیا ہوں؟ مرے دامن میں کیا ہے؟ اور میں کس لئے اترا ہوں؟ میری ایک ایک آیت میں کتنے جہان اور معنی پوشیدہ ہیں؟ میرا ایک ایک حرف جریدۂ عالم پر کیوں ثبت ہونے کے قابل ہے؟ میں نے "ضلال مبین" کے ماحول کو "نور مبین" میں کیسے بدل دیا؟ بس بات صرف اتنی ہے کہ کوئی قرآن کا سچا قاری، مخلص سامع اور صاحبِ نظر مفسر ہو، سنت ثابتہ بھی ہر طرح کے زیغ وضلال سے بچنے کیلئے بہت بڑی ڈھال ہے، رہ گئی سیرت طیبہ تو یہ وہ مینارہ نور ہے جس سے قافلے زندگی کی راہ اور منزل کا نشان پاتے ہیں، لیکن آج جس طرح سنت وبدعت کے مسئلے اٹھائے جاتے ہیں وہ سنت کے فہم سے عاری ہونے کی چغلی کھاتے ہیں، آج اسلامی ریاست کیسے قائم ہو؟ اس کے لئے سنت کے احیا کی ضرورت ہے آج عدل اجتماعی کا قیام سیرت کی روشنی میں کیسے ہو؟ یہ مطالعہ سیرت کی بنیاد ہے۔ عمامہ کتنے گز کا ہو؟ اور زلفیں کیسے ترشوائی جائیں یہ سنت وسیرت کے جوہری مسائل نہیں۔

زمانے کے تغیر کے ساتھ ہی حالات میں تغیر اور مسائل میں تنوع آچکا ہے اس تغیر کا بغور جائزہ اور اس تنوع کا بدتعمق مشاہدہ دراصل شعورِ عصر ہے، دنیا قبائلی عہد سے نکل کر جاگیری دور سے ہوتی ہوئی صنعتی زمانے میں داخل ہو چکی ہے ملوکیت سے امارت اور امارت سے جمہوریت تک کا سفر طے ہو چکا ہے غلامی سے آزادی کے مرحلے تقریباً تمام ہو چکے ہیں، انسان ہر چیز پر سوچنے اور ہر بات کہنے کا حق حاصل کر چکا ہے۔ توہمات کی فصلیں گر اور روایات کی زنجیریں کٹ چکی ہیں، جدید سوسائٹی میں انسانی رشتے نئی بنیادیں تلاش کر چکے ہیں، آقا اور غلام، سردار اور نوکر، بادشاہ اور رعایا، جاگیر دار اور مزارع یہ سب حوالے بہت حد تک دم توڑ چکے ہیں، ان جوہری تبدیلیوں کو ذہن میں رکھ کر علماء کو اپنی ترجیحات متعین کرنی چاہئیں اور اپنے موضوعات مقرر کرنے چاہیں، ورنہ زمانہ بڑا بے رحم اور تاریخ بڑی بے مروت ہے، یہ اپنا فیصلہ سنانے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔

علماء بلاشبہ انبیاء کے وارث ہیں اور رسول اعظم وآخر ﷺ کا تو سارا ورثہ علماء ہی کو منتقل ہوا ہے اسلئے کہ اب کسی پیغمبر نے مبعوث نہیں ہونا حضورؐ کے ہاتھوں جو امت تشکیل ہوئی اس کے اخلاق کی تہذیب اور اس کے عناصر کی ترتیب علماء نے کرنی ہے مگر بدقسمتی سے امت کا تصور تحلیل ہو کر فرقہ واریت کے ڈراؤنے ہیولے میں منتقل ہو گیا ہے اور یہ ذوق برصغیر پاک وہند میں کچھ زیادہ ہی بڑھا ہوا ہے۔

فرقہ بندی کے اس بے محابہ فروغ میں کچھ فرنگی حکومت کی چالیں اور سیاسی مصلحتیں بھی شامل تھیں لیکن اس پودے کی آبیاری میں خود علماء نے بھی پورا پورا حصہ لیا چنانچہ محبت ونفرت، پسند وناپسند

، قربت و غیرت اور دوستی و عداوت کا پیمانہ امت نہیں رہی بلکہ فرقہ بن گیا۔ ہر شخص فرقے کی میزان میں تولا جانے لگا۔ فرقے کی آنکھ سے دیکھا جانے لگا فرقے کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا اور فرقے کے سانچے میں ڈھالا جانے لگا جب علماء فرقہ بندی کے جواز کے لئے قرآن و حدیث اور فقہاء کے اقوال کا سہارا لینے لگے اور ایک دوسرے سے بڑھ کر ان فرقوں کی دینی حیثیت اور افادیت پر زور دینے لگے تو عوام کو لامحالہ فرقوں میں تقسیم ہونا تھا اور لازماً کسی نہ کسی فرقے سے جڑنا تھا اور فرقہ جب ہے ہی تفرقے کا نام تو پھر وحدت اور یکجہتی کہاں سے آتی؟

ظاہر ہے جو قوم فرقوں میں بٹ جائے یا بانٹ دی جائے تو اسکے جملہ اہداف و مقاصد امت کے تصور سے مختلف ہی نہیں متصادم ہو جاتے ہیں امت عقیدہ پر عمل کی وحدت سے تشکیل پاتی ہے جیسا کہ فرقے اپنے مختلف رسوم اور شعائر سے مشخص ہوتے ہیں، جب علماء نے فرقہ وارانہ ترجیحات از سر نو متعین کیں تو نفرت و محبت کا ہدف بدل گیا۔ اسلام کے اعتقادی و فکری دشمن سے وہ نفرت نہیں رہی جو اپنے فرقے کے مخالف سے پیدا ہو گئی امت کی ذلت پر اتنا ملال نہ رہا جتنا اپنے فرقے کی شکست پر رنج محسوس ہوا، امت کے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ جانے سے علماء امت کے پیشوا نہ رہے بلکہ اپنے اپنے دھڑے کے رہنما بن گئے۔ جس طرح ہر دھڑے دوسرے کو نیچا دکھانے پر تل گیا ہے اسی طرح علماء بھی ایک دوسرے کی پسپائی کی آرزو کرنے لگے ہیں۔ ظاہر ہے جب علماء اپنے ہی ہم منصبوں سے برسر پیکار ہونگے تو پھر اعزاز اور وقار کہاں رہیگا؟ مگر رفتہ رفتہ لوگ اس مذہبی محاذ آرائی کی ضرر رسانیوں کا مشاہدہ کرتے گئے شعور عصر بھی نسبتاً پختہ ہو گیا گردوپیش سے بھی آگہی کا دائرہ وسیع ہو گیا اور مواصلاتی رابطوں نے لوگوں کو نئے زاویوں اور مسائل کی نئی جہتوں سے آشنا کیا تو لوگوں کی فرقہ بندی سے وابستگی کمزور پڑتی گئی اور لوگوں نے محسوس کیا کہ اسوقت اقوام عالم کی صفوں میں اگر پوری امت مل کر کوئی بڑا کردار ادا نہیں کر رہی تو چھوٹے چھوٹے فقہی گروہ بھلا کیا کر سکیں گے؟ علماء چونکہ ان فرقوں کے رہنما تھے وہ بھلا پیچھے کیسے ہٹتے؟ اس طرح عوام اور علماء کے درمیان رشتہ کمزور پڑ گیا نماز، روزہ، زکوٰۃ، نکاح، طلاق کی حد تک لوگوں نے علماء سے رابطہ برقرار رکھا لیکن وہ معاملات جن کا سیاسی و معاشرتی اصلاح اور بگاڑ سے تعلق تھا اس سلسلے میں عوام نے علماء کے جائے دوسرے مراکز ڈھونڈھ لئے یوں علماء معاشرے کے اجتماعی کردار اور منظر سے قریب قریب غائب ہوتے چلے گئے، حق یہ کہ علماء نے جتنا زور اپنے اپنے فرقوں کی توسیع و استحکام پر لگایا ہے اگر اتنی قوت اور محنت غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں لانے اور اور پہلے سے موجود مسلمانوں کے اخلاق و اطوار سدھارنے میں کھپاتے تو خدا شاہد ہے نہ یہ امت بے امام ہوتی نہ دینا پرستوں کے ہاتھ معاملات کی زمام ہوتی اور نہ علماء کی ذات اسی قدر موردِ الزام ہوتی۔

فرقہ وارانہ مزاج نے علماء کو محدود دائرے میں محصور کردیا اور وہ اعلیٰ سماجی سیاسی اور اجتماعی کردار نظروں سے او جھل ہو گیا جسے ادا کرنا اصل میں علما کے شایانِ شان تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء کی معقول تعداد نے سیاسی و سماجی کردار کے حوالے سے بڑی ذمہ داری کا ثبوت دیا لیکن اس سے کہیں بڑی تعداد نے اس جانب توجہ نہیں دی یوں صلاحیتوں کا ایک قیمتی اور بڑا حصہ امت کی ہدایت کی جائے گروہی عصبیت میں کھپ گیا ورنہ علماء کے پاس جو مساجد کا ایک وسیع و عریض سلسلہ ہے، طلباء اور معتقدین کا بیش بہا اثاثہ ہے اور تحریر و تقریر کا جو سرمایہ ہے وہ دوسروں کے ہاں نہیں اسکا ذمہ دارنہ استعمال امت کو بلاشبہ امامت کا منصب سونپ سکتا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہو پایا۔ واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی امور میں اجتماعیت کا تصور چل سکتا ہے گروہی عصبیت کا نہیں، فرقہ وارنہ مزاج نے زندگی اور وقت کی پوری ترجیحات کو الٹ کرر کھ دیا جس کے نتیجے میں دینی حلقوں کی ساری بساط الٹ کرر ہ گئی۔

دین بنیادی طور پر --- دعوت --- کا دوسرا نام ہے اگر کوئی پوچھے کہ دینا میں سب سے مشکل کام کون سا ہے تو اسکا جواب ہو گا --- دعوت کا کام --- اس لئے کہ دعوت دماغ پگھلانے اور ہڈیوں کا گودا گھلانے کا تقاضا کرتی ہے کوئی انبیاء کرام اور مصلحین امت سے دریافت کرے کہ دعوت انسان کو کن کن زہر گداز اور جگر پاش مراحل سے گزارتی ہے، دعوتِ دین کے اجزائے ترکیبی میں پختگی علم، ضبط نفس، فراخ حوصلگی، صبر وثبات، سلامتی فکر و ذہن اور قوت برداشت شامل ہیں۔ داعی کبھی تھڑدلا نہیں ہوتا، بے حوصلہ نہیں ہوتا، چڑچڑا نہیں ہوتا، بد خواہ نہیں ہوتا کم نگاہ اور طالب جاہ نہیں ہوتا داعی کو زندگی کا ہر لحہ پل صراط پر سے گزر کر بسر کرنا ہوتا ہے ذرا سا افراط اور معمولی سی تفریط داعی کو غیر متوازن بنا کر اپنے مدعی اور مقصد سے بہت دور لے جاتی ہے علماء کرام وارثان انبیا ہونے کے ناتے داعی کا منصب رکھتے ہیں اس لئے انہیں عام آدمی کے مقابلے میں دلسوزی دردمندی اور خیر خواہی کے جذبات سے معمور اور درشتی و تلخ کلامی سے دور ہونا چاہیے۔ کیونکہ داعی اپنی منزل کہکشاں سے ہو کر نہیں پتھروں پر چل کر حاصل کرتا ہے، دارارقم، صحن حرم، شعب ابی طالب اور وادی طائف داعی کی منزل کے سنگ ہائے میل ہیں، داعی کسی چٹان سے سر نہیں پھوڑتا بلکہ جوئے رواں کی طرح اپنا راستہ بناتا اور رخ موڑتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایک دور میں دینی لوگوں کو مناظرہ بہت مرغوب رہا ہے اس عہد کی یادگار ابھی باقی اور یہ نفسیات ابھی تک قائم ہے اہل نظر کا کہنا ہے کہ حسنِ مقال بہر کیف جدال سے بہتر ہے کہیں مناظرہ ناگریز ہو بھی تو "قول احسن" اور "عنوان شائستہ" کو مدنظر رکھنا چاہیے، چیلنج، فتویٰ، تحقیر اور الزام تراشی سے راہ ہدایت اگر بالکل مسدود نہیں تو محدود ضرور ہو جاتی ہے۔

عیسائیوں، ہندوؤں اور قادیانیوں سے تو مناظرے کا پھر بھی جواز ہے لیکن اہل اسلام کا فروعی مسائل

پر ایک دوسرے کے دوبدو ہونا اور ڈھنگ سجانا ناقابل فہم سی بات ہے، اور موضوع بھی وہی از کار رفتہ کہ نماز میں ہاتھ سینے پر ہونے چاہئیں یا ناف پر، تراویح کی رکعتیں آٹھ ہیں یا بیس، تیجہ، دسواں اور چہلم مباح ہے یا مکروہ، انہی مناظروں کے نتیجے میں ایسے لٹریچر کا طوفان بندھا ہے کہ دینی حلقوں کا وقار خاک میں مل کر رہ گیا ہے۔ علمی بحث اور تحقیقی مذاکرہ اور چیز ہے اور فن مناظرہ بالکل چیز سے دگر، اول الذکر سے ذوق مطالعہ بڑھتا اور ثانی الذکر سے صرف سماجی مقاطعہ واقع ہوتا ہے لوگوں نے جب علماء کو ان مسائل میں ہمہ وقت الجھا ہوا اور سرگرداں پایا تو انہوں نے اپنے طور پر یہ سوچ لیا کہ جن سے آجتک یہ فروعی مسائل طے نہیں ہوئے ان سے دنیا کے عمومی مسائل کیا حل ہونگے؟ جو کسی فقہی تعبیر میں تطبیق پیدا نہیں کر سکے وہ زندگی کی تفسیر کیا کر سکیں گے؟ دلیل ہیرے کی ایک ایسی کنی ہے جو پتھر کا جگر چیر دیتی ہے لیکن مناظرہ ایک ایسا معاملہ ہے جسکا نتیجہ آج تک نہیں نکل سکا۔

علماء کرام اگر داعی کا کردار اپنائیں تو انہیں ہر فرد بشر اپنا مدعو نظر آئے گا اور ہر مدعو محبت توجہ ہمدردی اور شفقت کا مستحق ہوتا ہے اسے جھڑکا، جھٹکا اور ٹوکا نہیں جاتا اسے پیار سے بلایا، محبت سے پاس بٹھایا اور دلیل سے سمجھایا جاتا ہے، تبلیغ ودعوت کوئی ذاتی مسئلہ تو نہیں کہ آدمی ذاتیات پر اتر آئے، یہ تو الٰہی فریضہ ہے جسے صرف اس غرض اور حرص سے ادا کیا جاتا ہے کہ شاید مدعو کے لئے ہدایت اور داعی کے لئے مغفرت کا موجب ثابت ہو قیامت کے روز داعی کو اس کا اجر تو ضرور ملے گا کہ اس نے اپنے حسن کلام ذاتی ایثار اور عمدہ کردار سے کئی لوگوں کو سیدھی راہ دکھائی لیکن اسکا کوئی نیک بدلہ نہیں ملے گا کہ اس نے اپنے بھڑکیلے مزاج، غصیلے انداز اور کٹیلے الفاظ سے بہت سے لوگوں کو دھتکار اور بھگایا تھا۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے فرض کیا ان میں سے کوئی بھی الزام علماء کرام کے ذمے نہیں لگتا لیکن سماجیت اور اجتماعیات میں انکا کردار معدود کیوں ہو گیا ہے؟ یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ باقی ہے، اس سوال کا جواب کسی ایک گروہ کے رہنما اور عالم دین کے ذمے نہیں بلکہ علماء امت پر قرض ہے کہ وہ خود تجزیہ کر کے بتائیں کہ ڈور کا سرا کہاں الجھ رہا، پانی کہاں مر رہا اور معاشرے اور علماء کا باہمی رابطہ کہاں کٹ رہا ہے؟ گزشتہ کل بھی علماء امت کے والی اور نگران تھے اور آج بھی علماء کو ہونا چاہیے۔ انہیں اپنے فرض منصبی کے حوالے سے ضرور غور کرنا چاہیے کہ دنیا دگرگوں اور تاروں کی گردش تیز تر کیوں ہو رہی ہے' متاع دین ودانش اگر بیچ بازار لٹ رہی ہے تو یہ کس کافر ادا کے غمزۂ خوں ریز کا کرشمہ ہے؟ عجم کے لالہ زار وہی ہیں لیکن کوئی رومی کیوں نہیں اٹھ رہا؟ خاک بغداد شیخ جیلانیؒ اور امام غزالی کو کیوں ترس رہی ہے؟ اور ایران کی آب وگل تو پہلے والی ہے لیکن کوئی رازی کیوں نمودار نہیں ہو رہا؟ اگر مسئلہ کسی دیرینہ بیماری اور دل کی نا سمجھی کا ہے تو پھر اسکے لئے آب نشاط انگیز بھی علماء کو ڈھونڈنا پڑے گا۔

جناب فرانس روبنسن (F.Robinson)
معروف مغربی سکالر ترجمہ : افتخار شروانی

اکیسویں صدی اور امت مسلمہ

۲۰۰۰ء میں مسلم دنیا کی حالت پر غور کرنے کے لئے اس کا پچھلی دو صدیوں کی ابتدا کی صورت حال سے موازانہ مفید ثابت ہوگا۔

انیسویں صدی کے شروع میں مسلم دینا کے وہ ایک ہزار سال ختم ہوگئے تھے، جن میں یہ طاقت کا سرچشمہ تھی کہ اس زمانے میں کل دنیا میں اسلامی نظام موجود تھا جس کی بنیاد وہ طویل تجارتی شاہراہیں تھیں جو ایشیا سے افریقہ تک اور سمندروں کو پار کرتی ہوئی حیرہ احمر سے چین تک پھیلی ہوئی تھیں۔ انہیں شاہراہوں پر علماؤ اور صوفیا بھی سفر کرتے تھے، وہی کتابیں ہر جگہ مطالعہ کی جاتی تھیں اور علم کی ایک ہی زبان تھی، جو مراکش اور سپین سے وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا تک پڑھی اور بولی جاتی تھی۔ ان ہزاروں سالوں میں مسلم دنیا تہذیب کی رہبر تھی۔

۱۸۰۰ء میں مسلم دنیا کا زوال اس وقت شروع ہوا جب سلطنت عثمانیہ کو اپنے بعض علاقے روسیوں اور آسٹریا ہنگری کی مملکت کے حوالے کرنے پڑے، دو کلیدی سال تھے، ایک ۱۷۹۸ء جس میں نپولین نے مصر پر حملہ کیا اور دوسرا ۱۷۹۹ء جس میں میسور کی سلطنت نے انگریز ولزلی سے شکست کھائی۔ دو اہم ناکامیاں ابتدا تھی ایک ایسی صدی کی جس میں مسلمانوں کو پے درپے یورپ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

۱۹۰۰ء تک حالات اور بھی بگڑ گئے تھے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ مسلمانوں کی آخری قابل ذکر طاقت، سلطنت عثمانیہ کا ڈھانچہ یورپ کی توسیعی یلغار کے سامنے کھڑا نہ رہ سکے گا۔ ۲۰ سال کے عرصے میں یہ حکومت اناطولیہ میں اپنی بقا کی جنگ میں مصروف تھی۔ ایران پر برطانوی اثر ورسوخ کا غلبہ تھا۔ شمالی یمن، عرب اور افغانستان کو چھوڑ کر تقریباً تمام مسلم دینا کسی نہ کسی شکل میں یورپ کی محکوم تھی، مسلم دنیا کے خواص واشراف اسلامی علوم کی جگہ یورپی علوم کو ترقی کا زینہ سمجھنے لگے تھے، یورپ کا طرز زندگی اور یورپ کی سوچ مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں سرایت کررہی تھی۔

اکیسویں صدی شروع ہوئی تو صورتِ حال پچھلی دو صدیوں کے مقابلے میں زیادہ روشن نظر

آ رہی تھی، آج تقریباً تمام مسلم معاشرے آزاد ہیں، بعض نے اپنی آزادی کو محدود ہو جانے کی کوششیں ناکام بنادی ہیں۔ جیسے ایران اور عراق، خواص کو یہ بھی احساس ہے کہ اگر انہوں نے کسی صورت میں اپنی آزادی کا سودا کیا تو انہیں اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ خصوصاً اسلامی شدت پسندی کی تحریکوں کی شکل میں۔ اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض ملکوں میں ان کی آزادی ان معاہدوں سے متاثر ہوئی ہے جو ان کے خواص نے مغربی ممالک کے ساتھ کئے ہیں۔ بعض میں ایسا محض اس اندیشے سے ہوا ہے کہ کہیں مغربی فوجی طاقت ان کے خلاف استعمال نہ ہو۔

بہت سے علاقوں میں بعض معاشرے ایک اور خطرے سے دوچار ہیں۔ مثال کے طور پر ان میں مغربی اقدار اور صارفی ثقافت (Consumerist Culture) کی یلغار اتنی شدید ہے جتنی اس سے پہلے کبھی نہ تھی خصوصاً وہ جو برقیاتی (Electronic) ذرائع سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض معاشروں میں جہاں اسلامی شدت پسندی نے چند نازیبا حرکتیں تو کی ہیں لیکن وہیں اس یلغار کو روکنے میں بھی ایک کردار ادا کیا ہے۔ فی الحال معاشی اور اقتصادی طاقت کی کنجی مغربی معاشرے کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے برعکس، تیل اور گیس کے بیشتر ذخائر مسلمان ملکوں میں ہیں اور مغربی ممالک اب تک وہ تباہی نہیں بھولے ہیں جو ۱۹۷۰ء کے بعد تیل کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے انہیں سہنا پڑی تھی۔ یہ بھی ہے کہ اس وقت مغرب کو مسلم دنیا کے متعلق باقی دنیا کی رائے تشکیل دینے میں ایک بلندی کا درجہ حاصل ہے، بلکہ یوں بھی ہے کہ خود مسلم دنیا کو اپنے آپ کو سمجھنے کے لئے مغربی معاونت کی اہمیت واضح ہے اس کے برعکس، جمہوریت کا وہ طاقتور ہتھیار زمینوں کو ہموار کرنے والا آلہ 'Internet' تمام مسلم دنیا میں مسلم تنظیموں کو یہ اہلیت بخش رہا ہے کہ وہ اپنا علم کھلے میدان میں بلند کریں اور اپنے مقاصد، اپنے تخیلات، اپنی تشریحات ان لوگوں کے لئے واضح انداز میں بیان کریں جو ان کا مطالعہ کرنا پسند کریں۔ اس اہلیت سے علم اور تحقیق پر مغربی شکنجہ تو زم نہیں ہو سکتا لیکن یہ ایک پشتے کا کام ضرور دے سکتی ہے۔

مغرب کے اس بلند درجے کے باوجود مسلم دنیا کے متعلق مغرب کا دوہرا اور دوغلا معیار اور بہت سی صورتوں میں صریح لاعلمی، نہایت اہم موضوع ہے۔ اکثر (فلسطینیوں، کشمیریوں اور چیچنیا) کے لئے ایک قانون ہے اور ان پر ظلم و تشدد کرنے والوں کے لئے دوسرے، اس کے باوجود یہ آثار ہیں کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد مغربی خیالات اور رجحانات میں یکسانیت اور یک رخی کم ہوئی ہے اب یورپ نے امریکہ کے مقابلے میں بین الاقوامی مسائل پر وضاحت سے اپنی علیحدہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے خیالات کی حمایت میں اپنی Rapid Reaction Force بھی استعمال کریں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ اس فورس کو یورپ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال کرے گا۔ یہ بھی یقینی بات ہے کہ تمام

یورپی ممالک میں اس امر میں مکمل اتفاق نہ ہو کہ یہ مفادات کیا ہیں؟ اس کے باوجود ۱۹۹۹ء میں یورپ ہی نے کوسوو (Kosovo) میں پہل کی اور فلسطینی مسئلے پر بھی یورپ (جیسا کہ ان کے اخبارات سے ظاہر ہے) امریکہ کے مقابلے میں زیادہ متوازن رائے رکھتا ہے۔

اس رائے کی حمایت میں کہ مسلم دنیا کی ترقی کا امکان ۲۰۰۰ء میں ۱۸۰۰ء یا ۱۹۰۰ء سے زیادہ ہے۔ بعض عوامل پر غور کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ دو مزید عوامل ایسے ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنے والی صدی میں مسلمان ملکوں کے اثر اور رسوخ میں اضافہ ہوگا۔ پہلا تو یہ ہے کہ پچھلے پچاس سال میں مسلمانوں نے مغربی ملکوں میں اس طرح اپنی جگہ بنائی ہے جیسے عثمانیہ سلطنت کی فوجوں نے بھی کبھی نہیں کیا۔ معاشی کشمکش اور بہتر زندگی گزارنے کی خواہش کے زیر اثر مسلمان بڑی تعداد میں یورپ اور شمالی امریکہ نقل مکانی کر رہے ہیں۔ یہ مسلمان نہ صرف اسلام اور جدیدیت کے متعلق نئے خیالات منظر عام پر لا سکتے ہیں جو مسلمان معاشروں کے لئے ایک خمیر کا کام دیں بلکہ ان کی موجودگی سے مغربی ممالک کی حکومتیں بھی مسلمانوں کی تشویش اور دنیا کے متعلق ان کے خیالات سے زیادہ متاثر ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ صیہونی عنصر کے اثر ورسوخ میں کمی ہو جائے۔ مثال کے طور پر یہ مسلمان ضرور بارسوخ عہدوں پر فائز ہوں گے اور اس طرح مغربی معاشرہ ان کے خیالات پر زیادہ توجہ دے گا۔ اس دوہرے عمل میں دیر لگ سکتی ہے اور اس پر قطعی فیصلہ کرنا بھی مشکل ہے ایک غور طلب امر یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں مسلمانوں کی آزادی میں اضافہ ہو بہت سے مسلمان ملکوں میں ۲۵ سال سے کم عمر کے باشندے کل آبادی کا دو تہائی ہیں جیسے کہ ۱۹۷۰ء میں ایران میں ہوا۔ عمر کا یہ تناسب انقلابی نتیجے پیدا کر سکتا ہے۔ اگر یہ نتیجے اسلامی نظریے سے منسلک ہوں تو اس سے دنیا کے معاملات میں اسلامی خیالات کا فروغ ہو سکتا ہے۔

مسلمان جو آج دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں، مستقبل قریب میں ایک چوتھائی کے قریب ہو سکتے ہیں آبادی کے اس اضافے سے بہت سی مشکلیں بھی پیدا ہوں گی لیکن امکان یہی ہے کہ آنے والی صدی میں اسلام کے ماننے والوں کی تعداد عیسائیوں، ہندوؤں اور چینیوں کے مقابلے میں زیادہ ہوگی۔

اکیسویں صدی کے اس معمول سے امید افزا سیاق و سباق میں اسلام اور مسلم معاشرے کے درمیان رشتوں کے موضوع پر چند معقول سوال پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے اول تو یہ اختیار واقتدار کا مسئلہ ہے۔ اسلام کے نام پر کس کو فیصلہ کرنے کا اختیار اور حق ہے؟ انیسویں صدی تک اس موضوع پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ اختیار علماً کے پاس تھا، بے شک علماً کے درمیان اختلافات بھی تھے، لیکن تمام مسلم دنیا میں علماً کے طریقہ تعلیم میں ایک قسم کی یکسانیت تھی، اکثر ایک ہی قسم کی کتابیں استعمال ہوتی

تھیں۔ علماً ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرتے تھے اور ایک دوسرے سے سیکھتے تھے۔ ان کے اختلافات کے باوجود ان کا مستقبل کا تصور مشترک تھا' بعض اوقات حاکم ان کی رائے سے ناخوش ہوتے تھے جیسے جہانگیر اور شیخ احمد سرہندی یا صفوی شاہ' سلطان حسین اور مجلسی۔ لیکن اس معاملے میں کسی کو شبہ نہیں تھا کہ تشریح و تفسیر کا اختیار کس کو ہے۔ بلاشبہ' زبان اور مہارت کی بنأ پر صرف علمأ ہی کو اسلام کی تشریح کا حق تھا۔

دو تبدیلیاں' ایسی ہوئیں جن کی وجہ سے مستند تشریح کا معاملہ بالکل بدل گیا ایک تو وہ نمایاں فرق ہے جو اسلام میں پچھلی دو صدیوں میں مسلم حاکمیت کے زوال اور مغرب کی غالب حیثیت کے پس منظر میں پیدا ہوا۔ اس سے اصلاح اور احیأ کی تحریک پیدا ہوئی۔ عقیدے اور عمل کا دنیا سے بے نیازی اور کسی روحانی رہبر کی وساطت سے اللہ سے رشتہ قائم کرنے کی بجائے اللہ سے کسی کے توسط کے ذریعے رشتہ استوار کرنے کو برا سمجھا گیا اور نجات حاصل کرنا انسان کا اپنے ضمیر سے منسلک کیا گیا۔ اس زمین پر انسان اللہ کا جانشین ہے یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ خوف خدا کی بنیاد پر معاشرہ تشکیل دے۔ اقبال انسان سے اللہ کی بارگاہ میں عرض کراتا ہے: "اللہ' تو نے رات بنائی' میں نے چراغ جلایا' تو نے مٹی بنائی' میں نے پیالہ تشکیل دیا۔" اسی طرح اسلام کی دنیاوی ضروریات کی تاکید کی گئی۔

دوسری تبدیلی تھی "انیسویں صدی میں چھپائی کا رواج" قرآن' حدیث اور متعلقہ علوم کا مقامی زبانوں میں ترجمہ' تعلیم کی توسیع' اس طرح اسلام کے ماخذ ہر شخص کو حاصل ہونے لگے۔ اور تشریح و تفسیر پر علمأ کی اجارہ داری ٹوٹ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے زیادہ تعداد میں علمأ کے فتوؤں پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنا دین خود سمجھنے کی کوشش کی۔ اجتہاد عام لوگوں کو میسر آگیا۔ ان میں وہ اسلام پسند بھی شامل تھے جن کی تعلیم علمأ کے مدارس سے باہر ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے اپنی آواز صرف مدارس سے ہی نہیں بلکہ معاشرے کے ماحول میں بلند کرنی شروع کی' جیسا کہ اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ اب اجماعِ علمأ کی بجائے عوام کے پاس آگیا' پچھلے پچاس سال میں اس تاریخی تبدیلی سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس صورت حال میں اس تبدیلی کو حکومت کے اداروں کے ذریعے کیسے عمل میں لایا جائے۔ جیسا کہ پاکستان کے آئین کی تبدیلیوں کی مثال سے واضح ہوتا ہے' پاکستان میں اور پاکستان سے باہر یہ موضوع آنے والی صدی میں لوگوں کی ہمت اور جستجو کا مرکز بنا رہے گا۔

دوسرا اور پہلے سے منسلک موضوع استناد' بھروسے اور اعتبار کا ہے شروع ہی سے جب مسلمانوں نے دیکھا کہ وہ یورپ کے محکوم ہو گئے ہیں یا یورپ ان کا رقیب بن گیا ہے تو ان کو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ وہ یورپی تہذیب کی کونسی باتیں اپنا سکتے ہیں' جس سے وہ نہ تو نقالی کا گناہ کریں اور نہ ہی اسلام

کی روح قربان ہو لہٰذا انیسویں صدی میں ہی مسلمان یہ غور کر رہے تھے کہ کیا یورپ کے کھانے اور لباس کے طریقے، تصویریں کھینچنے اور مسجدوں میں بجلی استعمال کرنا ان کے لئے صحیح ہے یا نہیں۔ کیا اس بات کی اجازت ہے کہ وہ کوئی یورپی زبان (جیسے انگریزی) سیکھیں؟ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، مسلمانوں نے اپنی اس تشویش کا حل نکال لیا اور ان کی توجہ زیادہ بنیادی مسئلوں پر مرکوز ہو گئی۔ مثلاً کیا جمہوریت کی یورپی شکل قبول کرنا ممکن ہے جب کہ اس میں عوام کی حاکمیت لازمی ہے اور مسلمان صرف اللہ کی حاکمیت میں ایمان رکھتا ہے، کیا مغربی قوانین اور قانونی ضابطے نافذ کرنا ممکن ہے جب کہ مسلمانوں کے لئے اللہ کے احکامات موجود ہیں؟ کیا مغربی معاشی نظام اپنانا ممکن ہے جو شریعت کے احکام کے منافی ہے؟ کیا علم حاصل کرنا مغربی انداز مناسب میں ہے جس کی بنیاد اسلامی اقدار سے غیر متعلق ہے؟ کیا انسانی حقوق کا مغربی انداز فکر نافذ کرنا ممکن ہے۔ جب کہ وہ بھی صریحاً ہر اسلامی مقصد سے خارج ہے؟ جب سے مسلمانوں نے مغربی تسلط سے سیاسی آزادی حاصل کی ہے ان کی تمام تر کوششیں استناد کے ان موضوعات کا حل تلاش کرنے میں لگی ہوئی ہیں، قابل اعتبار ترقی کے سیکولر (Secular) اور مذہبی مستقبل کے تصورات کے درمیان ایک مکالمہ جاری ہے۔ بیسویں صدی کے تین عظیم انقلاب، روس اور چین کے علاوہ ایرانی انقلاب کے مستحکم ہونے پر یہ واضح ہو گیا ہے کہ جدیدیت کا ایک کامیاب اسلامی تصور ممکن ہے یہ سب جانتے ہیں کہ ایرانی انقلاب سے تمام مسلم دنیا میں اسلامی تحریکوں کی ہمت افزائی ہوئی ہے اور ترقی کے سیکولر حامیوں کو سخت دھچکا لگا، البتہ یہ بھی صحیح ہے کہ ایرانی نظام حکومت کے اندر جو کشمکش جاری ہے، اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ جدید اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کے طریقوں پر وہاں کافی اختلافات ہیں، آنے والی صدی میں معتبر، مستند اور اسلامی جدیدیت کا موضوع تمام مسلم دنیا میں اہم ترین مسئلہ رہے گا۔

اس مسئلے کے ساتھ ساتھ کہ مسلم معاشرہ کس نظام کو مستند سمجھتا ہے ایک تیسرا موضوع ہے جو اس مسئلے سے جڑا ہوا ہے یعنی وہ کشمکش جو تمام مسلم دنیا میں اسلام "پرست" جن کی طاقت کی بنیاد شہری اوسط درجے اور کم اوسط درجے کے طبقے پر منحصر ہے اور اشراف و خواص جو عموماً نو آبادی نظام کے وارث اور اکثر (ہمیشہ نہیں) مغرب سے قربت کی بنا پر طاقت اور وسیلے حاصل کرتے ہیں کے درمیان جاری ہے یہ بھی غور طلب ہے کہ ان اسلامی گروہوں کی رہبری مغرب کے تعلیم یافتہ پیشہ ورانہ اہلیت کے لوگ کرتے ہیں اور ان کا انتظام یونیورسٹی کے طلبہ کے پاس ہے انہوں نے وہ خلا پر کیا ہے جو مقامی سطح پر شہروں اور قصبوں میں حکومتی نظام کی ناکامی سے پیدا ہوا ہے، اس سے نمٹنے اور اس آبادی کی ضرورتیں ایک حد تک ان گروہوں نے سکول، شفاخانے، بہبود کے مراکز اور نفسیاتی امداد مہیا کر کے پوری کی ہیں۔

دیہاتی علاقوں سے جو لاکھوں لوگ شہروں کی طرف آئے ہیں' ان کیلئے بھی ان گروہوں نے کشش پیدا کی ہے یہ سب کو معلوم ہے کہ ان تحریکوں کی تقریریں اور خطبے مغربی ثقافت اور طاقت کی سخت مخالفت سے پُر ہیں۔ ان کا مقصد سرمایہ داری یا اشتراکیت (Socialism) کے مقابلے میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ اور وہ اپنا مقصد طاقت پر قبضہ جمانے کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں ایران اور سوڈان میں اسی طرح کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ آنے والے عشروں میں اسلامی گروہوں اور انکے مدمقابل خواص کے درمیان کشمکش کی کہانی سامنے آئے گی۔ اس کشمکش کے نتیجے میں ہی اس مستند اور معتبر شکل کا فیصلہ ہوگا۔ جو سیاسی نظام اپنائے گا۔ یہ امید کرنی چاہیے کہ ایرانی انقلاب کے بعد اہل مغرب نے سبق سیکھ لیا ہوگا اور وہ خوامخواہ ایسی صورت میں مداخلت نہیں کریں گے جہاں نئی اسلامی ریاستیں وجود میں آجائیں۔ البتہ اگر اس قسم کی تبدیلی سعودی عرب میں آجائے جس کا لازمی اثر خلیج کی ریاستوں پر بھی ہوگا۔ تب تک امید افزا ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کے وسائل دنیا کی معیشت کیلئے مرکزی اہمیت کے حامل ہیں اور کوئی بھی اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ مغرب' خصوصاً امریکہ' میں دانشمندی کا مظاہرہ ہوگا۔

لیکن اگر ایسا ہو بھی جائے تب بھی یہ ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ اسرائیل دانشمندی کا مظاہرہ کرے گا کیونکہ اس قسم کی تبدیلی اس کی نظر میں اس کی سالمیت کیلئے ایک خطرہ ہوگی۔

مسلم معاشرے میں اسلامی تحریکوں کی توسیع سے چوتھا موضوع سامنے آتا ہے: مسلم معاشرے میں عورت کا مقام' احیائے اسلام اور مغرب کے اقتدار کی پچھلی دو صدیوں میں معاشرے میں عورت کا صحیح مقام اور کردار گرما گرم بحث کا موضوع بنا رہا ہے۔ غیر ملکی تسلط کے دوران' جب مغربی اقتدار تمام ماحول پر چھائی ہوئی تھیں تو مدرسوں' مزاروں اور مسجدوں کے باہر جو علاقہ بچا تھا' اس میں مسلمان عورتیں اپنے گھروں کی چاردیواری میں اسلامی طرز زندگی کی مالک بن گئیں۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے ان کی ہدایت کیلئے ''بہشتی زیور'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تاکہ عورتوں کو اسلام کے متعلق اتنا علم ہو کہ وہ اپنے اور اپنے کنبے کیلئے کس طرح اسلامی معیار قائم رکھ سکتی ہیں۔ جب بعض مسلم حکومتوں نے جیسے مصطفیٰ کمال کے ترکی اور رضا شاہ پہلوی کے ایران میں سیکولر طرز زندگی اپنانے کی کوشش کی تو عورتیں تبدیلی کا نشان اس طرح بن گئیں کہ انہیں ماحول پر حجاب سے روکا گیا اور جب اسلامی حکومتیں وجود میں آئیں تو عورتوں پر حجاب کی پابندی عائد ہوگئی۔ لیکن بنیادی اسلام بھی جدید معاشری نظام اور ریاستی تنظیم میں عورت کا اپنا مقام حاصل کرنے کیخلاف نہیں ہے۔ ہر چند کہ الجیریا میں اسلامی جماعت (FIS) عورتوں کے گھر سے باہر کام کرنے کے خلاف ہے اور ایرانی انقلاب کے فوراً بعد عورتوں کو سرکاری دفتروں سے گھر بھیج دیا گیا تھا۔ وہ اسلامی اقدار جو اسلامی تحریکیں پھیلا رہی تھیں ان کا

تقاضا یہی تھا کہ عورتیں اپنا گھر سے باہر آزادی سے حرکت کریں۔ اور جدید معاشی نظام میں کام کریں۔ آج کل جو شخص بھی ایران، خصوصاً تہران جاتا ہے اس سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ عورتیں معاشی نظام میں ہر سطح پر کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اس میدان میں دلچسپ امکانات ہیں، مسلم معاشروں کا علم کی بنیاد پر معاشی نظام کی تشکیل سے فرار ممکن نہیں ہے اور اس کیلئے انہیں تمام آبادی کی ذہنی صلاحیتوں کی ضرورت ہوگی، آدھی آبادی اس سے خارج نہیں ہوسکتی۔ ان کیلئے لازمی ہوگا کہ عورتیں پوری طرح سے اس میں حصہ لیں 'اسلامی تحریک کے حمایتی ضرور اس ترقی کی شرائط طے کرینگے لیکن ان کو اس میں آسانیاں بھی پیدا کرنی ہوں گی۔ یہ بات قابل بحث ہے کہ یہ اسلامی اشخاص ایک ایسے عمل میں امداد کرینگے جن میں عورتوں کی مخصوص ضروریات اور ان کی ترجیحات میں وسعت پیدا ہو۔ اسلام میں عورتوں پر زیادہ تحریر و تقریر کے امکان پر نظر رکھئے 'اسلامی نسوانی تحریک (Feminine) پر نظر رکھئے۔

احیائے اسلام کی جاری اثر و رسوخ اور توسیع کی وجہ سے اکیسویں صدی کے سامنے ایک اور موضوع ابھرتا ہے جس میں ایک قسم کا طنز پوشیدہ ہے: انفرادیت اور قوم کے مطالبات کے درمیان کشاکش، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے 'اٹھارویں صدی کے اواخر سے احیا اور اصلاح کا مقصد، مسلم طاقت کے تناظر میں، قوم کو نیچے سے ابھارنا تھا' ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا طریق کار یہ تھا کہ ہر مسلمان فرد کے ضمیر پر یہ ذمہ داری ڈالی جائے کہ وہ ایک اسلامی معاشرہ تشکیل دے اور اس کے لئے ہر مرد اور عورت کو اتنی تعلیم دی جائے کہ وہ یہ ذمہ داری پوری کرنے کا اہل ہو جائے۔ ذاتی ذمہ داری کو اتنی اہمیت دینے سے چند غیر متوقع نتیجے رونما ہوتے ہیں۔ اس سے خود انحصاری کی ہمت افزائی ہوتی ہے اس نظریے کی کہ مرد اور عورتیں آزادی سے خود فیصلہ کرنے کی مجاز ہیں اس بات کی تاکید کہ عام دنیاوی زندگی میں جن باتوں کی قدر و قیمت ہے جیسے کنبہ 'رشتے' احساسات، جنسی تعلقات 'ان میں اپنا کردار خود ادا کرنا' اس بات پر زور کہ خود اعتمادی اور غور و فکر کے ذریعے ہر ذمہ دار مسلمان کو اپنے اعمال کا اس لئے جائزہ لینا ہے کہ وہ کس حد تک اللہ کی ہدایتوں پر عمل کر رہا ہے۔ یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ یہ تبدیلیاں جو احیاء کے عمل سے رونما ہوئی ہیں مسلمانوں میں انفرادیت کو سہارا دے رہی ہیں ایک احساس ہے طاقت کا جو اس علم سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ دنیا انسانیت سے تشکیل پاتی ہے۔ وہ احساس جو ذاتی آزادی اور انفرادی امکانات کے ساتھ اس علم سے پیدا ہوتا ہے کہ فرد خود انتخاب کرتا ہے۔ زندگی کے اصل معنی اور اس کے نشانات اور غور و فکر سے خودی کی ترقی میں ایک اضافی اہمیت پیدا ہوتی ہے۔ انسانی تکمیل کے امکانات وسیع ہوتے ہیں اور انفرادی راستہ اختیار کرنے کا تصور زیادہ واضح ہوتا ہے۔

لہذا طنزیہ ہے کہ احیائے اسلام نے جو قوم کو جگانے کی تحریک تھی ان خیالات اور رویوں کی

ہمت افزائی کی جو قوم کو للکار رہے تھے اس میں ترقی کا اور بھی امکان ہے اگر مسلم معاشروں میں سرمایہ داری نظام زیادہ آزادی سے کام کرے، آنے والے عشروں میں ہمیں یہی توقع کرنا ہوگی کہ احیائے اسلام کی دنیاوی شکل کا سہارا لئے ہوئے 'انفرادیت کی قوت اور ملت اسلامیہ کی اقدار کے درمیان زیادہ کھچاؤ پیدا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس بات کے پیش نظر کہ احیاء کی توقعات کا زیادہ خمیازہ عورتوں کے حصے میں آتا ہے' تو یہ کھچاؤ بھی ان کے لئے زیادہ پریشان کن ہوگا۔ تو یہ ہیں وہ پانچ نمایاں موضوع جن سے مسلم معاشرے کو آنے والی صدی میں نمٹنا ہوگا' پہلا 'اللہ کی ہدایت کی تعبیر و تشریح کا اختیار' دوسرا مسلم معاشروں کیلئے صحیح راستہ مقرر کرنے میں استبداد کا مسئلہ' تیسرا طاقت کے حصول کیلئے "اسلام پرستوں" اور نوآبادی نظام کے وارثوں میں مقابلہ' چوتھا معاشیات اور ریاست کی ترقی میں عورتوں کا کردار' پانچواں بڑھتی ہوئی انفرادیت اور ملت اسلامیہ کی اقدار میں کشمکش۔

پچھلی دو صدیوں میں مسلم معاشروں کو انہی اہمیت کے مسئلوں سے نمٹنا پڑا تھا یا تو نوآبادی نظام حکومت کی پابندیوں کے ماحول میں اور یا نوآبادی نظام کے خاتمے کے فوراً بعد مداخلتی پدرانہ نظام میں' تجربے یا آزاد خیالی کے لئے یہ بالکل خوش آئندہ حالات نہیں تھے۔ خوف زدہ لوگ تعمیری یا تخلیقی خیالات کے اہل نہیں ہوتے۔ اکیسویں صدی میں بظاہر مسلم معاشروں کو تجربے کرنے کیلئے زیادہ آزاد ماحول حاصل ہوگا یہ تو ایک نیک شگون ہے۔ (بشکریہ المعارف لاہور)

ڈاکٹر عمر فاروق غازی
ڈائریکٹر، سید مودودی انسٹیٹیوٹ لاہور

مغربی فکر و تہذیب: چیلنجز اور تقاضے

زیر غور موضوع میں مغربی فکر و تہذیب چیلنج اور تقاضے غور طلب ہیں آگے بڑھنے سے پہلے ان کے مفہوم و مدعا کو سمجھ لینا ضروری ہے تاکہ بعد میں موضوع پر مجموعی حیثیت سے بحث کی جا سکے۔

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق فلک کا وہ نقطہ جو شمال کے ۹۰ ڈگری بائیں واقع ہے، جہاں سورج غروب ہوتا ہے مغرب کہلاتا ہے۔ یہ دراصل سابقہ رومی دنیا کے مغربی حصے کا نام ہے۔ مشرقی تہذیب کے مقابلے میں مغربی ثقافت کے حامل وہ غیر کمیونسٹ ممالک جو یورپ اور امریکہ میں پائے جاتے ہیں انہیں Occidental اور Continental یعنی براعظم یورپ کے مکین کہا جاتا ہے۔(۱) چنانچہ شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک کے علاوہ ان میں برطانیہ، آئرلینڈ، ہالینڈ، نیدرلینڈ، بیلجئم، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، فرانس، سپین، پرتگال، اٹلی، جرمن، ڈنمارک، ناروے، سویڈن، فن لینڈ وغیرہ شامل ہیں۔(۲)

"مغربی تہذیب: چیلنج اور تقاضے" پر بات کرتے ہوئے یہ چیز ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اقتصادی شعبے کے برعکس تہذیب و تمدن اور حضارت و ثقافت کے اثرات یکطرفہ اور ہمہ گیر ہوتے ہیں معاشیات میں تجارتی کاروبار اور لین دین کے دوران لو اور دو (Give and take) کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن تہذیب و ثقافت کے اوزان و پیمانے اس سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں محکوم و مرعوب اور پسماندہ اقوام کے پاس دینے کے لئے کچھ نہیں ہوتا وہ محض اثر پذیری جہت (Recerving End) میں ہوتے ہیں جبکہ فاتح اور ترقی یافتہ قومیں تہذیب پھیلانے والی سمت (Giving End) پر ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسعد کے الفاظ میں:-

"It lies in human nature that nation and civilizations which one particially and economically more virile, great a strong fascination on the weaker or less activecommunities and influence them in the intellental and social spheres without having influenced themselves. Such is the situation to day with regard to the nations between the western and the Muslim world" (3)

مغربی کلچر اور تہذیب کی بنیادیں رومی تہذیب پر استوار کی گئی ہیں جس میں مندرجہ ذیل نظریات عقائد اور اصول پائے جاتے تھے :

☆ رومی سلطنت کی فتوحات کے مقاصد و اہداف میں توسیع مملکت اور اپنی قوم کے مفادات کی خاطر دیگر اقوام کا استحصال شامل تھا۔

☆ رومی قوم کے لئے بہترین معیار زندگی (Better living standared) کا حصول اور ایک مخصوص طبقے کے مفادات کو یقینی بنانا۔

☆ مشہور رومی اصول انصاف صرف رومیوں کے لئے تھا۔

"The famous Roman Justice" was justice for the Romans only

☆ خالصتاً مادہ پرستانہ ذہنیت کو اپنایا گیا تھا اور فائدہ مند و غیرہ دینی رویہ (utilitarian and Anti-religious) کو اختیار کیا گیا تھا۔

☆ رومی دیوتاؤں کو عملی زندگی (Real life) میں کوئی موثر کردار (Role) نہیں دیا گیا اور وہ "No Room for him" کے قائل تھے۔ (۴)

یہ تھی وہ مٹی جس سے مغربی تہذیب کا خمیر تیار کیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے دیگر بیرونی و اندرونی عوامل بھی مغربی فکر کی ترقی اور اس کے پروان چڑھنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر اسد رقم طراز ہیں کہ :

"This was the soil out of which Modern Western Civilization greve. It undentatedly received many other influence in the cource of its development, and notified the cultural inheritance of Rome in more then respect. But the fact remains that all that is real today in western cities and outlook on life is directly traceable to the old Roman civilization" (5)

مذکورہ بالا پس منظر کے پیش نظر ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ دراصل موجودہ غالب مغربی فکر جس کی اساس مادیت 'لادینیت اور حواس و عقل کی غیر مشروط اطاعت' حصول مسرت اور نفع عاجل اور خود سے برتر کسی قوت کی نفی پر ہے اپنی نام نہاد محکم بنیادوں سے ماورا' محض حقیقت کی قائل ہی نہیں۔ مذہب اس کے نزدیک ہدایت وہمی کا نام ہے اور اللہ ایک وجود موہوم ہے وہ اس کی طرف پیش قدمی کیلئے تیار نہیں بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں حضرت ابراہیم کے برعکس وہ چہرہ دعا کرتی ہے کہ میں نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر دیا ہے اور اس سائنس 'ٹیکنالوجی اور ترقی کا مذہب اختیار کر لیا ہے۔

جو مجھے ایسے گلشن بے خار کی طرف لے جائے گا جہاں نہ احتیاج ہے نہ خوف نہ کوئی پابندی ہے نہ قدغن، مگر اس راستے کی یہ محض ایک مفروضہ منزل ہے دوسری ممکنہ منزل وہ ہے جس کی طرف خود مغربی دانشور اشارہ کر رہے ہیں یعنی ایسی اتھاہ گہرائی جس کی تاریکی اور عمق ہی سے جھر جھری آجاتی ہے(۶)

تہذیب مغرب کا سب سے خطرناک چیلنج فرد کی غیر محدود آزادی و حریت (Limit less freedom of individual) ہے جس میں کسی قسم کی اخلاقی، معاشرتی اور سماجی قدروں کی پابندی کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اسی مادر پدر آزادی نے بے راہ روی کو فروغ دیا ہے اور قدیم و جدید دونوں نسلوں کے مابین نظریاتی اور عملی بُعد (Generatio Gap) کو جنم دیا ہے معاشرتی زندگی میں نظم و ضبط اور ڈسپلن ختم ہو رہا ہے اور آزاد منش اور فری لانسر والا رویہ عام ہو چکا ہے۔ شخصیات کا احترام و عزت مفقود ہے اور ادارے اپنا تقدس و مقام کھو بیٹھے ہیں۔ جبکہ اسلام ایک لگے بندھے نظام اور مضبوط سسٹم کا قائل ہے اور انسانی ترقی کیلئے بقول ڈاکٹر اسد ایک مستقل مقدار (startic quarntity) فراہم کرتا ہے جو کہ انسانیت کی انفرادی اور اجتماعی ترقی اور فروغ کی ضامن ہے۔ چنانچہ فرضی نمازوں کی تعداد، فرضوں، نوافل سنتوں کا تعین۔ قیام، رکوع، سجود، قعدہ اور جلسہ وغیرہ کے دوران پڑھی جانے والی سورتوں کی تسبیحات اور تکبیرات کی تعداد تک مقرر کر دی گئی ہے اور رمضان المبارک کے روزوں کی تعداد بھی متعین ہے الغرض اسلام کا منظم نظام عبادات انسان کی زندگی میں منظم رویے کو پروان چڑھاتا ہے(۷)

مغربی فکر اور تہذیب کا دوسرا چیلنج اہل مغرب کا نسلی برتری کا تصور ہے یونانی اور رومی اپنے آپ کو مہذب Civilized اور اپنے علاوہ دوسروں کو خصوصاً مشرق کے باسیوں کو Heathem وحشی قرار دیتے ہیں نسلی برتری کا یہ زعم باطل مغربی دنیا میں بھی سرایت کر چکا ہے اور وہ بھی پوری انسانیت پر اپنی عظمت و برتری اور فوقیت کے معتقد ہیں اسلام دوراہے پر Islam at teh Goes Roads کا مصنف لکھتا ہے:

"Since that time the Occidental, believe that their racial superiority over the rest of mankind is a matter of fact; and the more or less pronounced contempt of non-Europeon and nations is one of the standing factors of western civilization" (8)

گزشتہ ہزار ی (Millimieum) میں جنوبی افریقہ میں نسلی تفریق کا گھناؤنا کھیل کھیلا جاتا رہا اور ملک کے اصل باشندوں کو محض کالے ہونے کی وجہ سے زندگی کے تمام حقوق سے محروم رکھا گیا اور گوروں کی برتری کو تسلیم کیا گیا۔ جنوبی افریقہ کی آزادی کے ہیرو نیلسن منڈیلا کو ۲۸ سال قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار کیا گیا۔ اسی طرح مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے بالٹیک کی تین روسی

ریاستوں کو محض عیسائی ہونے کے ناطے آزاد ریاستوں کے طور پر قبول کرلیا گیا اور مشرقی تیمور کے صوبے کو انڈونیشیا سے الگ کر کے ایک خود مختار حیثیت عطا کی گئی۔ دوسری جانب گزشتہ پچاس سالوں سے زائد جاری مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی تحریک کی تاحال شنوائی نہ ہوئی اور نہ ہی چیچنیا کے مسلمانوں کو انصاف فراہم کیا گیا۔

بیسویں صدی کے نصف آخر کے شروع شروع میں ایک جدید چیلنج ترقی یافتہ دنیا کے سٹیج پر نمودار ہوا اور اب نہ صرف وہاں اپنی گرفت مضبوط کر چکا ہے بلکہ ساری دنیا کو ایسے مضبوط شکنجے میں جکڑ لینے کے لئے تیار ہے۔ امریکہ' یورپ اور معاشی طور پر آسودہ ممالک ایک نئے عہد میں داخل ہو رہے ہیں جسے عہدِ اطلاع یا اطلاعی عہد (Information Age) اور مابعد صنعتی دور (Post-industrial Era) کا نام دیا گیا ہے۔ مستقبل دان الون ٹوفلر نے اس پیش رفت کو تیسری لہر (Third wave) کا نام دیا ہے بقول اس کے پہلی لہر نے انسانوں کو شکار اور غذا کی تلاش میں سرگرداں حیوان کے دائرے سے نکال کر کاشت کار کے درجے تک پہنچایا' مشینی دور کی بدولت صنعتی انقلاب (Industrial Recalations) کی طرح ڈالی گئی اور اب ہم اس تیسری لہر کے شانے پر ہیں جو ایک بالکل نئے معاشرے' نئی معاشرت اور جدید طرز فکر کو جنم دے رہی ہے۔

حال ہی میں فوکویاما جو کہ جاپانی نژاد امریکی عالم عمرانیات ہے' کی تازہ تصنیف The Great Distruption" انتشارِ عظیم شائع کردہ پروفائل بکس' لندن ۱۹۹۹ء کے مطابق "اطلاعی معاشرہ" کے سبب نام نہاد جمہوری دور میں واضح اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ آج لوگوں کو آزادی ہے کہ ٹی وی یا کیبل کے درجنوں چینلز میں سے جسے چاہیں دیکھیں' انٹرنیٹ پر جس سے چاہیں پینگیں بڑھائیں تفریح کے درجنوں ذرائع میں سے جس سے چاہیں لطف اندوز ہوں۔ ڈھیلے ڈھالے اخلاقی رویوں کے صدقے' من مانی کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے۔ نوجوانوں کو تو چھوڑیئے' بچوں کے رویوں اور طرز زندگی پر بھی والدین کی قدغنیں غیر قانونی قرار دی جا رہی ہیں کھانے پینے کی پابندیاں بڑی حد تک ختم ہو چکی ہیں عوام پر سے حکمرانوں کا اختیار کم ہو گیا ہے[۹] بیوروکریسی کے سخت ضابطے ڈھیلے پڑتے جا رہے ہیں اور فرد کے اختیار اور آزادی میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قید و بند' ممنوع و مباح' جائز و ناجائز' کی حشیں بے معنی ہوتی جا رہی ہیں[۱۰] اقدار کی اس شکست و ریخت اور معاشرے کے اس انتشار کو انتشار عظیم (The Great Distruption) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ایک بھیانک اور تلخ حقیقت ہے۔ یہ سنہرے ماضی کی خواب ناک وادیوں میں گم ہو جانے کی خواہش نہیں بلکہ ایک کربناک حقیقت ہے جسے شماریاتی طریق پر بڑھتے ہوئے جرائم' بے پدر اولاد' کاروبار اور سیاست میں اخلاق اور اعتماد کا فقدان' تعلیمی مواقع کے زوال اور بیکار

نوجوانوں کی بے مصرف فوج کے بڑھتے ہوئے اعداد کی روشنی میں ناپا جاسکتا ہے۔(۱۱)

صنف نازک اور جنسی تعلقات کے بارے میں بھی مغربی تہذیب نے مہلک چیلنج پیش کیا ہے۔ عورت اور صنفی روابط کے متعلق مغرب ہمیشہ سے بے راہ روی کا شکار رہا۔ یہاں بھی افراط و تفریط اور دو انتہاؤں کے درمیان سخت کشمکش جاری رہی اور اس تناؤ میں کبھی اعتدال اور توازن پیدا نہ ہوا۔ سید قطب شہید کے الفاظ میں "عورت اور صنفی تعلقات سے وابستہ نقطۂ نظر سے پیدا ہونے والی بے چینی و اضطراب اور عدم تعاون اس بے اعتدالی سے کسی طرح بھی کم نہیں جو انسان اور اس کی فطرت سے متعلق غلط نکتہ نظر سے پیدا ہوتی ہے' کیونکہ ان دونوں خرابیوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے یعنی اس وجود کی دونوں صنفوں کی حقیقت سے ناواقفیت اور اللہ کی ہدایت سے روگردانی"(۱۲)

مذکورہ بالا چیلنج کی صداقت کا اندازہ مندرجہ ذیل دو واقعات سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے:

☆ آسٹریا میں ایک کپڑے کی دوکان والوں کے اعلان پر سینکڑوں شہری ان کی مختلف برانچوں پر ملک بھر سے اُمڈ پڑے کیونکہ انہوں نے عریاں آنے والے افراد کو ۵۰۰۰ شلنگ (۳۶۰ ڈالر) دینے کا اشتہار دیا تھا وہاں کے ایک معروف تجارتی مرکز میں ستر کے قریب عریاں افراد صبح دکان کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ کپڑوں کے لئے ووچر حاصل کرنے کا طریقہ کار یہ تھا کہ ان کو کیش حاصل کرنے تک مسلسل برہنہ رہنا تھا اور کیش کاؤنٹر پر انہیں وقتی طور پر تن ڈھانپنے کے لئے ایک تولیہ دیا جاتا۔ دوکان کھلنے سے پہلے گھنٹے میں تقریباً دو سو افراد کیش ووچر حاصل کر چکے تھے۔ یہ پیشکش ہر پیر کو یکم مارچ تا ۱۳ مارچ ۲۰۰۰ء تک جاری رہی۔

☆ اسی طرح آئرلینڈ طلاقوں کی سرزمین بن گیا ہے اور طلاق کی خواہش مند عورتوں کی تعداد مردوں سے دوگنی ہو گئی ہے۔ گزشتہ برس میں یہ شرح ۱۳۵ فیصد بڑھ گئی جس کے دوران ۸۷۸۰۰ جوڑوں میں علیحدگی ہو گئی۔ عدالتوں میں ہر ہفتے ۲۵۰ درخواستیں دائر ہوتی ہیں۔ گزشتہ سال طلاق کی ۳۲۴۰ درخواستوں میں سے عدالتوں نے ۲۴۴۴ طلاقیں کرا دیں ملک میں اتنی بڑی سماجی تبدیلی آئی ہے کہ لوگ شادی شدہ زندگی سے بیزار ہو گئے ہیں جس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ حالیہ برسوں میں ۳۰ فیصد ناجائز بچے پیدا ہوئے جو یا تو غیر شادی شدہ عورتوں کے ہاں پیدا ہوئے یا ایسے جوڑوں کے ہاں جو شادی کے بغیر رہ رہے ہوں(۱۳)

الغرض! انسانی تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ الحاد' لادینیت اور مذہب سے بیگانگی انسانی اخلاق کو تباہ، برباد کر دیتے ہیں اور آج کے انسان کا اخلاقی دیوالیہ پن اسکا کھلا ثبوت ہے علامہ اقبال نے اس کی یوں تصویر کشی کی ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں میں
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا (۱۴)

مغربی فکر و تہذیب کے پیش کردہ چیلنجوں اور خطرات کا تقاضا ہے کہ ہم سید قطب شہید کے الفاظ میں صحیح علمی نقطہ نظر اختیار کریں، ہمیں انتہا پسندی اور بے راہ روی کے تمام مظاہر اور اس کے پیچھے پنہاں حقیقی اسباب کا کھوج لگانا ہوگا کیونکہ ہمارا ضابطہ حیات مستقل مطالعہ پر قائم ہے اور اللہ کے مقرر کردہ دستور زندگی سے ماخوذ ہے۔ ہماری تہذیب اور مغربی تہذیب کی راہیں جدا اور اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔ حیاتِ انسانی، انسانی اخلاقیات اور تمدن و معاشرت کے بارے میں ہمارا ایک مستقل نقطہ نظر ہے، زندگی اور تاریخ کی تعبیریں ان سے الگ ہیں۔ غرض ہر اس عنوان میں فرق نظر آئے گا جس کو دورِ جدید کے اجتماعی نظاموں نے اختیار کیا ہے اور جس پر اسلامی نظام نے روشنی ڈالی ہے۔ (۱۵)

مولانا مودودیؒ نے بجا طور پر فرمایا ہے:

''مذہب کا کمال یہ ہے کہ اس نے انسان کو ایک معاشرے کی صورت میں منظم کر کے اسکے تمام معاشرتی مسائل کا عادلانہ حل پیش کیا ہے مذہب سے بیگانگی کی بنا پر انسان اس دنیا کا نہیں، کسی اور دنیا کا باسی ہوتا'' (۱۶)

مغربی فکر و تہذیب کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیں مندرجہ ذیل اقدامات کرنے ہونگے:

☆ اسلامی نظریہ حیات کے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور اخلاقی پہلوؤں کو جدید علوم و فنون اور عصر حاضر کی احتیاجات کی روشنی میں علمی و سائنسی انداز میں پیش کیا جائے۔
☆ امت مسلمہ کو تمام اجتماعی مسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مشترکہ موقف اختیار کرنا چاہیے اور سعودی عرب کو مرکزی مقام کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے۔
☆ عالم اسلام میں اسلام کے شورائی اور جمہوری نظام کو نافذ کرنا چاہیے۔
☆ اسلامی دنیا کو سُود سے پاک معیشت پر مبنی بینکاری نظام کو اپنا کر عملی نمونہ پیش کرنا چاہیے۔
☆ ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اسلام کے اخلاقی اقدار کو اپنانا چاہیے۔
☆ VOA, B.B.C اور VOG کی طرز پر VOI (Voice of Islam) کا ادارہ قائم کرنا چاہیے تاکہ

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں اسلامی کلچر اور روایات کو فروغ دیا جاسکے۔

☆ بین الاقوامی عدالت انصاف (International Court of Justice) کے انداز پر بین الاقوامی اسلامی عدالت (International Islamic Court of Justice) قائم کی جانے چاہیے۔

☆ ورلڈ اسلامک ریسرچ کونسل کا قیام عمل میں لایا جائے۔

فہرست کتابیات

(1) The Conare oxford Dictionary, 7th Edition, by J.B sykes, Oxford Press, 1983, Page: 1223

(2) "Word Mah" Published by Govt of Pakistan

(3) Islam at the Cross Road" Dr. Mohammed Asad, 6th Edition, Ashraf Printing Press, Lahore, 1975, page 8

(4) Ebit, Page 42, 43

(5) Ebid , page 42

(۶) ترقی اور انتشار عظیم مقالہ مقالہ از پروفیسر عبدالقدیر سلیم، ماہنامہ ترجمان القرآن، شمارہ مارچ ۲۰۰۰ء ص ۵۵

(7) "Islam at the Cross Road" Page 33,34

(8) Ebid, Page 63

(۹) "ترقی اور انتشار عظیم" ص ۴۴

(۱۰) ایضاً ص ۴۴، ۴۵

(۱۱) ایضاً ص ۴۵، ۴۶

۱۲۔ "اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل" "ترجمہ الاسلام ومشکلات الحضارۃ" مصنف سید قطب شہیدؒ، ترجمہ ساجد الرحمان صدیقی مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، ۱۹۸۲ء ص ۷۲

۱۳۔ "نوائے وقت" لاہور ایڈیشن یکم مارچ ۲۰۰۰ء

۱۴۔ "ضرب کلیم" از علامہ اقبال "صفحہ ۶۹

۱۵۔ "اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل" ص ۷۵

۱۶۔ "افکار معلم" مقالہ بہ عنوان "مذہب انسانی زندگی کی ناگزیر ضرورت" ڈاکٹر طاہرہ بشارت، جلد ۱۳، شمارہ مارچ ۲۰۰۰ء ص ۱۳، ۱۴۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرشید رحمت
صدر شعبہ علوم اسلامیہ' بہاولپور یونیورسٹی

امت مسلمہ اور یہودی عزائم .... لمحہ فکریہ!

ہمارے اس مختصر مقالہ کا مقصد تحقیقی انداز میں یہ واضح کرنا ہے کہ امت مسلمہ من حیث المجموع کی "زبوں حالی" اگرچہ ہمارے اپنے اعمال و افعال کی مرہون منت ہے لیکن اس سلسلہ میں اس مطالعہ کی بھی اشد ضرورت ہے کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ اسلام کے بارہ میں دوسری ملتیں کیا سوچ رہی ہیں اور ان کا امت مسلمہ اور نظریہ اسلام کے بارہ میں کیا نکتہ نظر ہے۔

ہم نے اپنے اس مقالہ میں انتہائی احتیاط سے ان امور کی کسی حد تک نشاندھی کردی ہے جو عصر حاضر میں امت کے انتشار اور نتیجتاً زوال کا سبب بن رہے ہیں۔

اس مقالہ سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں البتہ امت مسلمہ کے سنجیدہ طبقہ کو ذھنی طور پر اس کے لئے تیار کرنا ہے کہ وہ بھی خواب غفلت سے بیدار ہو کر مستقبل کی منصوبہ بندی کریں تاکہ رب تعالیٰ کی وہ مشیت پوری ہو سکے' ليظهره على الدين كله (۹ : ۳۳) کہ وہ ذات اس دین کو دنیا کے بقیہ تمام ادیان پر غالب دیکھنا چاہتی ہے اگر آج امت مسلمہ کے درد مند اور اہل دل افراد کسی حد تک اس مشن کے لئے تگ و دو کریں تو یقیناً وہ اس مشیت ایزدی کی تکمیل میں اپنے لئے سعادت و فلاح دارین کا سامان فراہم کریں گے۔

ہم نے ان تلخ حقائق کی طرف اشاراتی انداز میں اپنا نکتہ نظر پیش کیا ہے کیونکہ ایسے تمام امور نہ تو دستاویزی انداز میں بآسانی میسر ہیں اور نہ ہی پروپیگنڈا کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں بلکہ ان افراد کی حکمت عملی (Stratedidy) یہ ہے کہ منصوبہ بندی اس انداز میں کی جائے' کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔ حتی المقدور خفیہ انداز میں اپنا ہر لائحہ عمل مرتب کرتے ہیں تاکہ عام انسان کا ذہن ان کی طرف متوجہ بھی نہ ہو سکے۔

یہاں یہ حقیقت بھی انتہائی افسوسناک ہے کہ یہ اقوام' امت مسلمہ کی تباہی و بربادی کیلئے دن رات حکمت عملی سے کام کر رہی ہیں اور امت مسلمہ خواب غفلت میں مدہوش ہے الاماشاء اللہ بقول معروف رصافی:

كلما ايقظتهم زادوا رقادا۔

"کہ میں جب انہیں بیدار کرنے کیلئے تگ ودو کرتا ہوں' وہ مزید مدہوش ہو جاتے ہیں۔"

اس سلسلہ میں جب ہم قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں اس میں واضح انداز میں یہ اعلان ہے :

ولتجدن اشدهم عداوة للذين آمنوا اليهود والذين اشركوا (۸۲:۵)

"تم تمام انسانوں میں اہل ایمان کے شدید ترین دشمن یہودیوں اور مشرکوں کو پاؤ گے"

یہاں یہ امر حیران کن ہے کہ بیشتر مفسرین نے قرآن حکیم کی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اس امر کی نشاندھی نہیں کی کہ تمام اقوام سے بڑھ کر یہ افراد مسلمانوں سے کیوں بیر رکھتے ہیں البتہ علامہ زمخشریؒ م ۵۳۸ھ نے اپنی تفسیر الکشاف میں صرف ایک سطر میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

ولعمری انهم لكذلك واشده وعن النبی ﷺ ما خلا يهوديان بمسلم الاهما بقتله۔

"قسم بخدا یہ افراد ایسے ہی ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آنحضور ﷺ سے مروی ہے اگر دو یہودی کسی ایک مسلمان کے پاس اکٹھے ہو جائیں وہ اس مسلمان کو مار ڈالنے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔"

اس سلسلہ میں امام مسلم کی روایت بھی قابل غور ہے جو بہت حد تک ہمارے نکتہ نظر کی تائید کر رہی ہے۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لا تقوم الساعة حتى يقاتل المسلمون اليهود فيقتلهم المسلون حتى يختبئى اليهودى من دراء الحجر والشجر يا مسلم يا عبدالله هذا يهودى خلفى فتعال فاقتله الا الغرقه فانه من شجر اليهود ۔

(مشکوۃ' ج ۲' ص۔ ۳٦٦)

آپ ﷺ نے فرمایا۔ قیامت اس وقت تک برپا نہ ہو گی جب تک مسلمان یہود سے جنگ نہ کریں اس جنگ میں مسلمان یہودیوں کو اتنا ماریں گے کہ یہودی درخت اور پتھروں کے پیچھے جا چھپیں گے' اس وقت درخت اور پتھر بول اٹھیں گے اے اللہ کے بندے' یہودی میرے پیچھے چھپا ہے آؤ اسے قتل کرو۔

اس حدیث مبارکہ کے ایک معنی تو ظاہری ہیں کہ غلبہ اسلام کے وقت ایسا ہو گا لیکن اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہر نظریہ اور تحریک کے پیچھے یہودی ذہنیت کار فرما نظر آئے گی۔ اگر دور حاضر کی اہم تحریکوں کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً یہ امر واضح ہو گا کہ حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اکثر اوقات عام انسان اپنی سادگی کی بنا پر ان تحریکوں کا آلہ کار بن کر ایسے کام سر انجام دیتا ہے جو شاید اس

کیلئے مادی فوائد کے حامل تو ہوں لیکن ایسا عمل مسلمانوں کی ملی زندگی کیلئے سم قاتل کی حقیقت رکھتا ہے۔

اصل عنوان پر کچھ کہنے سے پہلے چند امور انتہائی غور طلب ہیں۔ کائنات میں سیدنا آدم علیہ السلام کے بعد سب سے اہم نبی سیدنا نوح علیہ السلام ہیں۔ جنہیں آدم ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے بعد سب سے اہم اور قابل ذکر نبی سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام۔ عربوں کا نسلی تعلق حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ہے۔ اسحاق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا۔ ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔

آنحضور ﷺ کی آمد سے قبل کائنات کی امامت و سرداری بنی اسرائیل کے پاس تھی (انی فضلتکم علی العالمین (۲:۴۷) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نسبی تعلق بھی بنو اسرائیل سے تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شعور میں یہود کی بداعمالیوں کی وجہ سے اس قوم کو اپنی طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا' اس وجہ سے اس دور کے یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سخت دشمن ہو گئے انہوں نے اپنی پوری توانائیاں اس پر صرف کیں کہ کسی طرح یہ دین دنیا میں پھیلنے نہ پائے لیکن وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب تک پہنچا کر رہے۔ یہ اور بات ہے کہ رب تعالیٰ نے انہیں زندہ بچا لیا۔

آپ کے رفع آسمانی کے بعد آپ کا پیش کردہ دین جس کا نام یقیناً اسلام تھا اپنی سادگی کی وجہ سے تیزی سے پھیلنے لگا جو آپ کے معاندین یہود کے لئے کسی طرح قابل قبول نہ تھا۔

اس اہم موڑ پر تاریخ میں ایک ایسی شخصیت سامنے آتی ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ دین کو بگاڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ یہ پولوس کی شخصیت ہے جسے تاریخ عیسائیت میں (Saint Paul) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دنیا کے مشہور گرجے اسکے نام سے موسوم ہیں...... اس نے بعد میں ایک ڈرامہ رچایا اور عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے سامنے ایک من گھڑت کہانی پیش کر کے دین عیسائیت میں داخل ہوا اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نے اسی دین میں ایسے عقائد و نظریات شامل کیئے کہ ایک توحید پرست دین 'مشرکانہ ادیان میں شمار ہونے لگا۔ بقول ایک عیسائی مورخ روما کے بھیڑیئے نے ناصرہ کی کھال اوڑھ لی۔

آنحضور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد وہی مرحلہ دوبارہ پیش آیا اب کی بار ایک ایسا نبی آیا جس کا تعلق بنو اسرائیل کے برعکس بنی اسماعیل سے تھا۔ یہود اپنی ذہانت کی وجہ سے سمجھ چکے تھے کہ اب قیادت و سیادت بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسماعیل میں آنے والی ہے۔ اس تعصب کی وجہ سے انہوں نے آنحضرت ﷺ کو عارفانہ تجاہل کے تحت پہچاننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ آنحضور ﷺ کی

ذات کے بارہ میں ظاہری علامات ان کی مذہبی کتابوں میں درج تھیں۔
"یعرفونہ کما یعرفون ابنأ ھم" یہ قوم اپنی ضد' عناد پر قائم رہی۔ مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست میں اس کا سب سے بڑا سرغنہ عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ مدینہ و خیبر کے یہود نے بارہا یہ کوشش کی کہ اس نبی کا خاتمہ کر دیا جائے لیکن وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

خلافت سیدنا ابو بکرؓ و عمر بن الخطابؓ کے زمانہ میں انہیں اسکی جرأت نہ ہو سکی۔ البتہ حضرت عثمانؓ کے دور حکومت میں آپؓ کی طبعی نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ابن سبا نے وہ کچھ کر دکھایا جو آخر میں سیدنا عثمانؓ کی شہادت پر منتج ہوا۔ اسکے بعد ملت اسلامیہ شیعہ' سنی دو فرقوں میں بٹ کر رہ گئی۔

اس سے پہلے یہی حربہ عیسائیت میں بھی استعمال کیا گیا اور انہیں دو بڑے گروپس میں (رومن کیتھولک' پروٹیسٹنٹ) میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس طرح یہود نے عیسائیوں سے ان کے تشدد اور تعذیب اور مسلمانوں سے ان کی خیر و بھلائی کا انتقام لیا۔

وقتی عداوت وقتی کشمکش کا نتیجہ ہوتی ہے کبھی وقتی دشمنی کا سبب وقتی محرومی ہوتی ہے لیکن دائمی دشمنی کسی دائمی محرومی کا آئینہ دار ہوتی ہے ظاہر ہے اگر کسی قوم کو اسلام اور مسلمان سے دائمی دشمنی ہے تو اسکا مطلب واضح ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اس قوم کے افراد کے دل میں دائمی محرومی کا احساس جاگزیں ہے

صلیبی جنگیں :

مسلم اندلس میں تحفظ حاصل کرنے کے بعد یہودیوں نے اپنی چالبازی سے عیسائیوں کی نفرت اور دشمنی کا رخ مسلمانوں کی طرف پھیر دیا جس کے نتیجہ میں عظیم صلیبی جنگیں برپا ہوئیں۔

سلطنت عباسیہ کے زوال کے بعد (جس میں ابن علقمی کا کردار ناقابل فراموش ہے) جب مسلمانان عالم میں اتحاد ختم ہو چکا تھا' ان کی مرکزیت فنا ہو چکی تھی اور تن آسانی نے انکے شجر اقبال کو گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔ عیسائی اقوام نے متحد ہو کر سرزمین اسلام ایشیاء کوچک شام اور فلسطین پر یلغار کی جو ان صلیبی جنگوں کی تمہید تھی جس میں دو صدیوں تک دنیا کی دو طاقتیں ایک دوسرے سے نبرد آزما رہیں۔

صلیبی جنگیں جہاں یورپ کی آئندہ ترقیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں وہاں انہوں نے ایشیائی اقوام خصوصاً مسلمانوں کے قومی تنزل کا ایک باب کھولا ...... یہ صلیبی جنگیں دراصل شام اور فلسطین میں یروشلم یعنی بیت المقدس کو حاصل کرنے اور اس سرزمین میں مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کیلئے لڑی گئیں۔ ان جنگوں کی تعداد تقریباً نو ہے۔ جو ۱۰۹۵ء سے ۱۲۹۶ء تک جاری رہیں۔ ان جنگوں کے دو ہی مقصد تھے پہلا یہ کہ عیسائی یاتریوں کو معبد مقدس کی زیارت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اس کا دوسرا مقصد ارض

فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم کرنے کی راہ ہموار کرنا تھا...... ہر چند ان جنگوں میں پورے عالم عیسائیت نے حصہ لیا لیکن یہودی دراصل اس تیرسے دو سرا شکار کھیل رہے تھے کہ انہوں نے اپنے دشمن عیسائیوں کو مسلمانوں سے برسرپیکار رکھا بالآخر عیسائی دنیا عالم اسلام سے ٹکرا کر نہ صرف پاش پاش ہوگئی بلکہ یورپ کی عیسائی مملکتیں جو جنگ میں شامل تھیں بشمول پاپائے روم یہودیوں کی مقروض ہوگئیں اس طرح یہود درپردہ یورپ پر قبضہ کرنے اور عیسائیت کو کمزور کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوگئے۔

یہود کی ایک اور چالاکی:

نومبر ۱۹۶۴ء میں ایک عالمی خبر رساں ایجنسی کی وساطت سے اخبارات میں ایک حیرت انگیز خبر شائع ہوئی کہ یہود نے اپنی نام نہاد ریاست اسرائیل کی وساطت سے پاپائے روم کی خدمت میں یہ محضر نامہ پیش کیا کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو مصلوب کرنے میں یعنی سولی چڑھانے کی ذمہ داری سے بریت کا اعلان کرتے ہیں۔ لہٰذا اس تاریخی حقیقت کو تاریخ کے اوراق سے حذف کردینا چاہیے۔ یہ جرم تو حضرت مسیح علیہ السلام کے دور کے یہودیوں کا ہے۔ اس پر پوپ نے اس عذر نامہ کو قبول کرلیا اور اعلان کردیا کہ قوم یہود اس جرم (صلیب مسیح) سے بری الذمہ ہے۔

موجودہ اناجیل اربعہ سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہود ہر لحاظ سے اس میں شریک تھے اب دو ہزار برس کے بعد ان کا بری الذمہ قرار پانا اور وہ بھی نائب مسیح (پاپائے روم) کی عدالت سے۔ یہ تاریخ کا ناقابل یقین اور حیرت انگیز فیصلہ ہے اس سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ یہود اور عیسائی آپس کی قدیم دشمنی بھلا چکے ہیں جو قوم اپنے اسلاف کے کسی عمل یا اقدام سے برأت نہ کرے وہ اس جرم کے اندر شریک مانی جاتی ہے یہ قوم یہود کی ایک اور فتح ہے جو وہ عیسائیت پر حاصل کرچکے ہیں۔

عیسائی دنیا پہلے دو حصوں میں اور پھر کئی حصوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی یہودیوں نے اعلانیہ اور خفیہ سازشوں سے عیسائیوں کی نصف آبادی کو اپنا حلیف اور آلہ کار بنالیا ہے اور اپنے دشمنوں مثلاً رومن کیتھولک اور آرتھوڈکس چرچ کی زندگی اجیرن کردی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب آدھی عیسائی دنیا یہودیوں کی ایجنٹ ہے ان ایجنٹوں میں ایک طبقہ خاص طور پر قابل ذکر ہے یہ یورپ کے رہنے والے پروٹیسٹنٹ ...... یہ مغربی عیسائیت سے جسے لاطینی عیسائیت بھی کہا جاتا ہے ٹوٹ کر الگ ہوگئے۔ اب خود ان میں کئی فرقے وجود میں آچکے ہیں۔ مثلاً تو تھریہ' کالونیہ (Presbterians) اور اہم ترین چرچ آف انگلینڈ' اور اس کی شاخیں Baptist 'ایونجلیکل موڈرنسٹ وغیرہ۔

امریکہ جو دنیا کے تمام یہودیوں کی اصل آماجگاہ ہے اسکے صدارتی انتخاب میں کسی طرح ایک شخص جو رومن کیتھولک فرقہ سے متعلق تھا صدر کے عہدہ تک پہنچ گیا' اسے بعد میں قتل کردیا گیا۔ یہ

جان ایف کینیڈی جو امریکہ کی تاریخ صدارت میں پہلے رومن کیتھولک صدر تھے۔

دنیا میں یہودیت کیلئے کام کرنے والی تنظیمیں اور ان کی آلہ کار جماعتیں بے شمار ہیں جن کی تعداد ہزاروں میں ہے ان تمام تنظیموں کی اعلیٰ ترین باڈی کا نام زنجری (Zingry) جو بین الاقوامی صیہونی یہودیت کا مخفف ہے۔ دنیا میں یہود کے لئے کام کرنے والی بے شمار تنظیمیں ہیں جو بنیادی طور پر اس اعلیٰ ترین باڈی کے تحت کام کرتی ہیں۔ ہم اس مقالہ میں صرف چند اہم اور قابل ذکر تنظیموں ان کے طریق کار، حکمت عملی کی وضاحت پیش کر رہے ہیں:

۱۔	صیہونیت	Zionism
۲۔	فری میسنری	Free Massionary
۳۔	عظیم سازشی منصوبہ	Protocal of the learned elders of Zion
۴۔	استشراق۔	Orientalism
۵۔	کے۔جی۔بی	K.G.B
۶۔	نیو ورلڈ آرڈر	New World Order

صیہونیت:

یہودیت ایک دین ہے جبکہ صیہونیت سے مراد وہ سیاسی تحریک ہے جس کا مقصد فلسطین میں یہودی حکومت کا قیام اور ان تمام علاقوں پر قبضہ کرنا ہے جو تاریخ کے کسی دور میں ان کے قبضہ میں رہے۔ لفظ صیہون ایک پہاڑ کا نام ہے جس پر سیدنا داؤد علیہ السلام نے اپنے دور حکومت میں ایک شاندار محل تعمیر کرایا تھا جو بعد میں تخریب کاری کا شکار ہو کر زمین بوس ہوا۔ یہودیوں نے اسی حوالہ سے اس دور عروج کو ذہن میں رکھ کر ایک ایسی تحریک کا آغاز کیا جو ہر لحاظ سے انسانیت کی دشمن ہے۔

اسرائیلی حکومت کے قیام سے قبل ہی یہود نے اکناف عالم میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ اس کے بعد وہ پورے عالم کو اپنی گرفت میں لانے کیلئے سرگرم عمل ہو جائیں گے۔

۱۸۸۰ء سے قبل یہود یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ دنیا کے کسی خطہ میں اپنا قومی وطن بنا سکیں گے۔ ۱۸۸۰ء میں ایک یہودی تھیوڈر ہرزل (Theodor Herzl) نے اپنی کتاب (A Jew-ish State) میں اس کا پورا عملی منصوبہ شائع کیا۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ۱۸۹۶ء میں لندن سے شائع ہوا۔

یہ سازشی منصوبہ اگرچہ کئی حصوں پر مشتمل ہے لیکن اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دو ہزار برس

قبل یہودیوں کو جس سر زمین سے رومیوں نے نکال باہر کیا تھا اس کو پھر سے حاصل کیا جائے اصل منصوبہ تو یہ ہے کہ دریائے نیل سے لے کر فرات تک اور شمالی حجاز سے لے کر (جس میں مدینہ طیبہ بھی شامل ہے) شام کی انتہائی شمالی سرحدوں تک کا پورا علاقہ مسلمانوں سے چھین لیا جائے۔ بعد میں ان علاقوں میں دنیا بھر کے بکھرے ہوئے یہودیوں کو لا کر بسا دیا جائے۔

ان علاقوں کو وہ صرف اپنا مقبوضہ حصہ بنا کر مسلمانوں کو وہاں غلام کی حیثیت سے نہیں رکھنا چاہتے بلکہ وہ ان کو ختم کر کے یا ملک سے نکال باہر کر کے زمین خالی کرانا چاہتے ہیں اس مقصد میں انہیں پہلی کامیابی ۱۹۴۸ء میں ہوئی جب فلسطین کے ایک حصہ پر ان کی ریاست قائم ہوئی۔ ۱۹۶۷ء میں ۱۹ سال بعد انہیں دوسری کامیابی ملی۔ جس میں باقی ماندہ فلسطین اور جزیرہ نما سینا انہوں نے چھین لیا۔

اب جس منصوبہ سے دنیائے اسلام کو شدید خطرہ ہے یہ وہ خطرناک فعل جس کے لئے دو ہزار سال سے بے تاب ہیں اور اس کی خاطر وہ گزشتہ ایک سو سال سے ایک خاص لائحہ عمل کے تحت کام کر رہے ہیں کہ مسجد اقصیٰ اور قبہ صخرہ کو گرا کر ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے اور اس پورے علاقہ پر قبضہ کیا جائے جسے اسرائیل اپنی میراث سمجھتا ہے۔ یہودی اس منصوبہ پر عمل درآمد سے قبل اس امر سے خوبی واقف تھے کہ فلسطین پر قبضہ اور ریاست اسرائیل کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ترکوں کے حوالہ سے خلافت عثمانیہ موجود ہے۔ چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق سب سے پہلے سلطان ترکی عبدالحمید کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی گئی کہ ہمیں فلسطین میں ایک خطہ زمین دے دیا جائے ہم اس کی بڑی سے بڑی قیمت دینے کے لئے تیار ہیں۔

سلطان اپنی ذہانت کی وجہ سے اس منصوبہ کو بھانپ گئے انہوں نے صاف کہہ دیا جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک ترکی سلطنت موجود ہے اس کا کوئی امکان نہیں کہ فلسطین یہودیوں کے حوالہ کیا جائے۔ تمہاری ساری دولت پر میں تھوکتا ہوں۔ چنانچہ اس کے فوراً بعد سلطان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازشیں شروع ہو گئیں۔ جس میں فری میسن اور دونمہ جیسی تنظیمیں پیش پیش تھیں۔ بالآخر کمال اتاترک کے ہاتھوں خلافت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر دیا گیا اور اس طرح خلافت کی ردا تار تار ہو کر قصہ پارینہ بن گئی۔ جس کے نتیجہ میں عالم اسلام ایک ایسے انتشار کا شکار ہوا جس سے اتحاد کی تحریکیں بے اثر ثابت ہوئیں۔

فری میسنری: Free Massionary

یہ تحریک پوری دنیا مین فری میسنری کے نام سے مشہور ہے اور اسی نام سے معروف ہے یہ دو الفاظ کا مجموعہ ہے' Free بمعنی آزاد جو کسی ضابطہ قانون کا پابند نہ ہو Massionary بمعنی پیشہ طریق

عمل۔ اس تنظیم کا ہر فرد اپنے ہم خیال کو brother (بھائی) کہہ کر بلاتا ہے۔ پوری دنیا میں یہی لفظ ان کے لئے وجہ امتیاز ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تنظیم کا آغاز کب سے ہوا اور کس دور میں باقاعدہ طور پر یہ وجود میں آئی۔ اس سلسلہ میں یقین سے کہنا مشکل ہے اس سلسلہ میں اتنا کچھ لکھا گیا تو یہ سب مفروضات معلوم ہوتے ہیں۔

بعض محققین کا یہ خیال ہے کہ اس کا آغاز اسوقت ہوا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام صحراء نوردی میں مصروف تھے۔ بعض دوسرے افراد کی یہ رائے ہے کہ اسکے پہلے بانی کا نام ہیرو ڈ ثانی Herod II تھا جو رومی سلطنت کی جانب سے یروشلم کا گورنر تھا۔

اس سلسلہ میں تیسری رائے یہ ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس کا باقاعدہ آغاز بارہویں صدی عیسوی میں برطانیہ سے ہوا۔ چنانچہ ۱۷۱۶ء میں برطانیہ کے دارالعوام میں فری میسنری کا ایک ممبر باقاعدہ سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اس کی باقاعدہ لاج ۱۷۱۷ء میں لوگوں کے سامنے آئی اور یہ آج بھی اپنے مقاصد کیلئے کام کر رہی ہے اور اپنے نظریات کا پروپیگنڈا کر رہی ہے۔

کسی معاشرہ یا سوسائٹی میں اس تنظیم کا طریق کار یہ ہے کہ جب اسے یہ محسوس ہو کہ وہ اس ماحول میں پرسکون انداز میں کام کر سکتی ہے تو یہاں اپنے نام اور لاج (دفاتر) کا اعلان کیا جاتا ہے اگر کہیں سے خطرہ کا احساس ہونے لگے یا یہ کہ عامتہ الناس ان کے طریقہ کار کے بارہ میں مشکوک نظریات رکھنے لگیں تو۔ یہ فوراً اپنا بوریا بستر گول کر لیتے ہیں اور اپنے دفاتر کے نام بدل کر نئی شکل میں آتے ہیں۔

تاریخی طور پر یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ جرمنی میں ہٹلر نے یہ محسوس کیا کہ فری میسنز کی یہ شاخیں یہود سے گہرا تعلق رکھتی ہیں اور انکی کارگزاریاں دن بدن خطرناک ہوتی جارہی ہیں۔ اس پر فری میسنز نے اپنا نام تبدیل کر کے کلب آف جرمن نائٹ رکھ لیا۔ دنیا کا دوسرے حصوں میں بھی ان کا طریق کار ایسا ہی ہے۔

اس خطرہ کے بارے میں سب سے پہلے ہاورڈ یونیورسٹی امریکہ کے صدر نے کانوکیشن کے موقع پر جو صدارتی خطبہ ۱۲ جولائی ۱۷۹۸ء کو پیش کیا اس میں اس نے گریجویٹ کو خبردار کیا کہ فری میسنز کس طرح خطرناک سیاسی و مذہبی عزائم سے مسلح ہیں اور ان کے عزائم کو پوری طرح بے نقاب کیا۔

کمیونزم کا آغاز:

اس موقع پر ایک تخریبی فورس تیار کی گئی جو مستقبل میں عالمی انقلابات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ کارل مارکس اور فریڈرک انجلز نے اپنی معاشی ضروریات کے لئے اس تنظیم سے مالی امداد لی خاص طور پر جب وہ کمیونزم کیلئے اپنا لٹریچر تیار کر رہے تھے۔ عین اسی دور میں اس تنظیم کا ایک گروپ فرینکفرٹ

کے ایک پروفیسر سے نظریہ کمیونزم کے خلاف ایک کتاب لکھوا رہے تھے جس کا مرکزی موضوع یہ تھا کہ اولاً آرین نسل کو یورپ اور بعد میں پوری دنیا پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ انہی نظریات کی بدولت نازی ازم پروان چڑھا۔

دو مختلف اور متضاد نظریات کے لئے مقالات اور تصانیف لکھوانے کا مقصد صرف یہی تھا کہ ان نظریات کے حامی جب آپس میں صف آرا ہوں گے تو ایک دوسرے سے لڑ کر ایک دوسرے کو کمزور کرتے رہیں گے۔ چنانچہ جنگ عظیم دوم میں ایسا ہو کر رہا۔

جنگ عظیم دوم کا مقصد صرف یہ تھا کہ سیاسی طور پر صیہونیت کو روئے زمین پر غلبہ دلایا جائے اور عظیم تر اسرائیل کے لئے راہ ہموار کی جائے۔ اس کے متوازی' بین الاقوامی کمیونزم کے لئے بھی راہموار کی جارہی تھی کہ وہ مستقبل میں عیسائیت کی بجائے ایک زوردار نظریہ بن کر دنیا کے سامنے آسکے۔

اس تنظیم کے بارے میں ہمارے مطالعہ کا ماحصل یہ ہے کہ یہ اپنے طریق کار کو دنیا کا سامنے کم سے کم ظاہر کرتی ہے بلکہ اس کے برعکس زیر زمین رہ کر اپنے عزائم کے لئے راہ ہموار کرتی ہے۔

فری میسنری کے اصول اور اس میں داخلہ کا طریق کار :

فری میسنری کی شہرت اسکے خفیہ طریق کار کی وجہ سے ہے یہ اپنی دستاویزات کو حتی المقدور خفیہ رکھتی ہے' خاص طور پر جب کسی فرد کو اس کا ممبر بنایا جاتا ہے اس موقعہ پر اصل حقائق سامنے آتے ہیں اس تنظیم میں داخلہ اور اسکا ممبر بننے کے اصول وضوابط اسقدر خوفناک وبھیانک ہیں جنہیں ضبط تحریر میں لانا خاصا مشکل ہے۔

فری میسنری کے ممبر کو حلف برداری کے دوران یہ بتایا جاتا ہے کہ اسے اپنے مقاصد کے ساتھ انتہائی وفادار اور مخلص رہنا ہے اور اگر اس ممبر نے اس سلسلہ میں کسی راز کو افشا کرنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ ناگہانی موت ہے۔ چنانچہ جن افراد نے ان سے غداری کی وہ اگلے دن مردہ پائے گئے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں فری میسنری تحریک اٹھارویں صدی کے آخری ایام میں قائم ہوئی یہ کہنا درست نہیں اس سے مراد غالباً فری میسن کی تشکیل جدید ہے اس امر کے واضح ثبوت مل چکے ہیں کہ یہ تحریک سولہویں صدی عیسوی سے ہندوستان میں کام کرنے لگی تھی۔ اٹھارویں صدی سے قبل اس کا طرز عمل زیادہ تر مشرقی تھا اور اس کے ذہین افراد عموماً ایشیا اور بطور خاص ایران اور عراق کے یہودی تھے اٹھارہویں صدی عیسوی میں عالم اسلامی کے عظیم الشان مراکز قسطنطنیہ' قاہرہ' بغداد' تہران اور دہلی تھے۔ سترہویں صدی سے اس تحریک نے مشرق میں دہلی کو اپنا مرکز بنایا۔

سلطنت مغلیہ جو کبھی غیر معمولی ذہن اور بیدار مغز بادشاہوں کی سلطنت تھی رفتہ رفتہ کمزور

ہوتی چلی گئی جب تک اس کے حکمران بیدار مغز تھے یہ سازش بہت حد تک کامیاب نہ ہو سکی۔ کمزور اور نااہل حکمرانوں کے آتے ہی اس تحریک نے اپنا کام کر دکھایا۔

سترھویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان میں اور بطور خاص دہلی میں شیعہ اور سنّی کے مابین جو اختلافات اور معرکے بپا ہوئے انہیں اس نکتہ نظر سے از سر نو جانچنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں فری میسن کے متعلق واضح سوال مولانا اشرف علی تھانویؒ سے پوچھا گیا جس کا جواب انہوں نے رسالہ "التقی فی احکام الرقی" اور طلسم کشائی فری میسن میں دیا ہے۔ دونوں رسالے غالباً ۱۹۰۱ء میں لکھے گئے۔

فری میسن جسکے بارے میں ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ سراتاپا خفیہ تحریک ہے اس کا اصل دائرہ کار اعلیٰ طبقات ہیں۔ بادشاہ، شہزادے، امراء اور موجودہ جمہوری نظام میں صدر مملکت، وزیر اعظم، بڑی مذہبی شخصیتیں، بڑے تاجر، اور بااثر افراد ان کے خاص ہدف ہوتے ہیں۔ مسلمانوں میں چند تحریکیں اور تنظیمیں یا تو براہ راست یہودی تنظیمیں ہیں یا ان کی آلہ کار ایجنٹ ہیں۔ ان میں قادیانی، بہائی، دروزی، نصیری، ازارقہ اور اسماعیلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ احمدیوں کا ہندوستان میں قادیان اور پاکستان میں ربوہ کے بعد ان کا سب سے منظم مرکز اسرائیل کے شہر حیفہ میں واقع ہے۔ اس وقت جب کہ اسرائیل میں کسی مسلمان کا رہنا انتہائی مشکل ہے قادیانیوں کو اسرائیل میں کام کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔

اس طرح ایران کے بہائیوں کا مرکز اسرائیل میں کوہ کرمل اور عکہ ہیں جہاں وہ اپنے اعمال و افعال کھلے بندوں سر انجام دیتے ہیں۔ یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ فری میسن تحریک سو فیصدی یہودی دماغ کی پیداوار ہے اور اس کے تمام ارکان شعوری یا غیر شعوری طور پر یہودیوں کی عالمی حکمرانی کے لئے کام کر رہے ہیں۔

عظیم سازشی منصوبہ (Protocol of the Learned Elders of Zion)

دنیا کو اس عجیب و غریب دستاویز کا علم سب سے پہلے ایک روسی پروفیسر Sergyli A.Nilus کی وساطت سے ہوا جس نے اسے ۱۹۰۵ء میں روسی زبان میں شائع کیا اس کے دیباچہ میں وہ لکھتا ہے کہ اسے اس دستاویز کا ایک نسخہ ایک دوست کے ذریعہ حاصل ہوا تھا۔ یہ اصل دستاویز کا مختصر ترجمہ تھا۔ اصل دستاویز غالباً عبرانی زبان میں تھی جسے فری میسن تحریک سے متعلق ایک عورت نے حاصل کیا تھا۔

دراصل نائلس نے جیسے ہی یہ کتاب پڑھی وہ سناٹے میں آگیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ اس انتہائی سنگین اور گھناؤنی سازش کو بے نقاب کرنا انسانیت کی بڑی خدمت ہوگی۔ نائلس کو سب نے بڑی فکر عیسائی تہذیب کو یہودی یلغار سے بچانے کی تھی .... دراصل یہودی طرز فکر، انداز کار اور ان کے منصوبوں،

پروگراموں اور ان کے عزائم اور مقاصد کو سمجھنے کے لئے خود انہی کی تیار کردہ دستاویز پروٹوکول اولین اہمیت کی حامل ہے۔

پروٹوکول درحقیقت کسی ایک مصنف کی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے۔بلکہ یہ ایک طرح کا اجتماعی کام ہے جو یہودیوں کی ایک بہت بااثر شخصیت نے مرتب کیا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ذہین ترین یہودی متعدد مرتبہ مل کر بیٹھے اور ایک عرصہ تک بحث و تمحیص کرنے کے بعد کچھ اصول و کلیات طے کئے اور اپنا منصوبہ اور نقشہ تیار کیا۔ اس دستاویز کے بارے میں یہودیوں نے اب یہ کہنا شروع کر دیا ہے: "کہ وہ جعلی ہے اور اسے لکھ کر ان کی طرف سے منسوب کر دیا گیا ہے"

جن تعلیم یافتہ افراد نے اس دستاویز کا بغور مطالعہ کیا ہے اور پھر ان حالات کا جائزہ لیا ہے جو عالمی سطح پر ہو رہے ہیں یا مسلم ممالک میں جو ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں وہ یقیناً یہ کہیں گے کہ ان حالات میں تو واقعی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر یہ ڈائری جعلی ہے تب بھی لکھنے والوں نے یہودیوں کے دماغ کو ٹھیک طور پر پیش کیا ہے۔

اس دستاویز کے آغاز میں عظیم تر اسرائیل کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور اس کے ارد گرد علامتی سانپ کی شکل بنائی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کو پر امن ذرائع سے علامتی سانپ کی سی چالاکی اور مکاری سے کام لے کر پوری دنیا کو فتح کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔

یہ دستاویز دنیا کی بڑی زبانوں کے علاوہ اردو، عربی اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہے اردو زبان میں چھوٹے صفحات پر اس کے ۱۳۵ صفحات اور انگریزی میں تقریباً ۱۱۰ صفحات ہیں۔ عام لائبریوں اور بک سٹال پر اس کا حصول ناممکن ہے۔

استشراق Orientalism

استشراق کی کہانی خاصی طویل ہے درحقیقت یورپ میں مطالعہ اسلام اور اس حوالہ سے کتب کی اشاعت نیز مغربی یونیورسٹیوں میں اسلام کے حوالہ سے شعبہ جات کا قیام علمأ یہود سے اس کا آغاز ہوا اور اسکے بعد عیسائی سکالرز بھی اس میں شامل ہوتے چلے گئے۔ استعمار کے دور حکومت میں اس سلسلہ میں خاصا کام ہوا۔ اسلام اور اسکے رہنما کے سلسلہ میں جس قدر غلط نظریات علمی دنیا میں پیش کئے گئے وہ اس نام نہاد علمی تحریک کی کارستانی ہے استشراق صرف انگریزی زبان تک محدود نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ کی ہر زبان میں کام ہو رہا ہے۔

اس تحریک کے ماہرین دنیا کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ اسلامی تہذیب بھی بابل اور نینوا کی قدیم

تہذیبوں کی طرح ایک مٹی ہوئی تہذیب ہے۔ مستشرقین کے اس گروہ نے اسلامی تہذیب کے تمام فضائل کی نشوونما کا سبب ماقبل اسلام تہذیبوں کو قرار دیا اور اس بنیاد پر یہ موقف اختیار کیا کہ عربوں کا معاشرہ، جاہلیت کے عرب کی نسلی میراث تھا اس کا اخلاق و تصوف عیسائیت سے ماخوذ ہے۔ قانون اور شریعت یہودیت اور رومن لاء سے مستعار لیا گیا اور فلسفہ یونان سے۔

مستشرقین کا ایک اور گروہ عیسائی مبلغین سے متعلق ہے وہ افراد اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ اسلام، عیسائیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسلئے اسلامی تہذیب کا مطالعہ اس غرض کے لئے کیا گیا کہ اسلامی تہذیب کے کمالات کا سرچشمہ ماقبل اسلام تہذیبوں کو قرار دے کر ان افراد کو جو کسی طرح اسلام سے متاثر تھے یہ باور کرالیا جائے کہ تہذیب، ثقافت، علوم و فلسفہ، اخلاق و تصوف اور قانون و معاشرت میں اسلام کا کوئی کارنامہ نہیں۔

مستشرقین کا تیسرا گروہ مغرب کی طاقتور استعماری قوموں کے سیاسی عزائم کی خاطر اسلام کا مطالعہ اس غرض سے کرنا چاہتا ہے کہ مسلمان قومیں ان کے معاشی و سیاسی مقاصد میں حائل دکھائی دیتی ہیں۔ اسی مقصد کے لئے اسلام کا مطالعہ کیا گیا اور اپنی تصانیف میں یہ تاثر ظاہر کیا کہ مسلمانوں کا ماضی چاہے کتنا ہی تابناک اور شاندار کیوں نہ ہو مگر ان کا مستقبل اس کے بغیر روشن نہیں ہو سکتا کہ وہ مغربی تہذیب اپنائیں اور مغربی و امریکی اقوام کے ساتھ سازگاری پیدا کریں۔ اس موضوع پر لٹریچر عربی، انگریزی اور اردو زبانوں میں موجود ہے۔

کے جی۔ بی۔ K.G.B

یہ سیاسی اور خفیہ تنظیم امریکی ادارہ سی آئے اے کے طرز پر کام کرتی رہی ہے۔ روس کے موجودہ زوال تک اپنے مقاصد کیلئے سرگرم عمل رہی ہے۔ جس طرح ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اشتراکیت کے مرکزی قائدین یہودی تھے انہوں نے بظاہر اپنے نام بدل لئے تھے۔ کارل مارکس دونوں طرف سے یہودی تھا اور لینن خالصۃً یہودی نژاد تھے۔ لینن اور سٹالین کی مائیں اور بیویاں یہودی تھیں۔ ان کی ظاہری اشکال بہت حد تک یہودیوں سے مشابہ ہیں۔ روسی انقلاب سے ذرا پہلے یہودی غیر معمولی طور پر سرگرم عمل تھے۔ پہلی جنگ عظیم چھڑ جانے کے بعد ایک بند ٹرین میں بٹھا کر لینن اور اس کے تقریباً ۲۰۰ رفقا کو جرمنی سے روس کی سرحد میں دھکیل دیا گیا۔ اس کے ۱۶۵ ساتھیوں کے نام ملتے ہیں ان میں سے ۱۲۸ یہودی تھے۔

روس میں سرخ انقلاب کی کامیابی کے بعد مخالفین اور انقلاب کو تسلیم نہ کرنے والوں کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنے اور ان کی سرکوبی میں کے۔ جی۔ بی نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ یہ جاسوسی

ادارہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر مختلف مشن کے لئے کام کرتا رہا ہے۔ اس تنظیم کا براہ راست کنٹرول روس کی اعلیٰ کونسل کے سپرد تھا یہ تنظیم کسی بھی لحہ اور کسی بھی وقت ضرورت پڑنے پر مخالفین کو اغوا کر سکتی تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک صورتحال یہ تھی کہ کے جی بی اور اس کے ذیلی ادارے داخلی سالمیت کے لئے وقف تھے لیکن جب جرمنی کو شکست ہو گئی تو اس کا دائرہ مزید وسیع کر دیا گیا۔ روس کے جاسوس اور ایجنٹ تمام دنیا میں پھیل گئے۔ انہیں اجازت تھی کہ وہ اپنے مقاصدِ حصول کے لئے مخالفوں کو اغوا اور قتل بھی کر سکتے ہیں۔ روس نے جب علاقوں اور ملکوں میں اپنی فوجیں خواہ کسی بہانے داخل کیں وہاں کے جی بی نے کمیونزم کی ترویج، تعلیمی پالیسی کا کنٹرول، کمیونزم کے مخالفین کا خاتمہ کرنے کے لئے سارے ہتھکنڈے استعمال کئے آخر میں افسر کو ماتحت اور ماتحت کو افسر کا جاسوس مقرر کیا گیا۔

کے۔جی۔بی صرف زمین پر ہی جاسوسی کارروائیوں میں مصروف نہیں، بلکہ فضائی وسعتوں (خلاء) میں بھی اس کے جاسوس سیارے محوِ گردش رہتے ہیں۔ یہ سارے کمپیوٹر کے ذریعہ کام کرتے ہیں اور زمین پر دشمن کے فوجی اڈوں کی رپورٹ اور تصاویر بھیجتے ہیں۔ روسی نظام سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے شہریوں کو اس خفیہ تنظیم نے لاکھوں کے حساب سے پراسرار طور پر موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ بعض اوقات دوسرے ملکوں میں روسی سفیر کے جی بی کے افسر ہوتے ہیں۔ جاسوسی کے علاوہ کے جی بی دوسرے ملکوں میں منظم ہڑتالیں، مظاہرے بلوے اور توڑ پھوڑ کروانے میں پوری طرح ماہر ہے۔

نیو ورلڈ آرڈر New World Order

سویت یونین کے بظاہر ٹوٹ پھوٹ کے بعد سیاسی میدان میں امریکہ کا راج ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۱ء میں صیہون ایک نئی شکل کے ساتھ نیو ورلڈ آرڈر کے نئے نام سے سامنے آیا۔ جس کے مقاصد وہی ہیں جواب تک بیان ہوئے ہیں۔ البتہ لباس کی تبدیلی میں نیا نظام پیش کیا جا رہا ہے۔

یہودی پوری دنیا میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہیں وہ اپنے مالی نظام کے حوالہ سے پوری دنیا میں چھا چکے ہیں۔ امریکہ جیسی سپرپاور ان کے ہاتھوں میں ہے ہمارا قدیم حریف اپنے مقاصد کے حصول کیلئے عیسائیوں کو آلہ کار بنا کر اسلام کو ختم اور مسلمانوں کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہے۔ اسی کو آج نیو ورلڈ آرڈر کا نام دیا جا رہا ہے۔

امریکہ بہادر نے نیو ورلڈ آرڈر کو اقوام عالم کیلئے امن، آشتی اور انصاف کا سرچشمہ قرار دیا لیکن مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے مقابلہ میں فلسطین اور عراق کے بارے میں اس کی جانبدارانہ پالیسیاں، دنیا کے مسلم ممالک کے پرامن ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول میں رکاوٹیں کھڑی کر کے امریکہ دنیا پر اپنا امتیاز

قائم نہ رکھ سکا۔

اس کے علاوہ ان افراد نے ایک چال یہ چلی کہ عالم اسلام میں جو افراد اسلامی عقائد و نظریات پر پختہ یقین رکھ کر ہر قسم کے جرائم اور عیوب سے پاک ہوں۔ انہیں بنیاد پرست قرار دیا جائے۔ بعد میں ان پر دہشت گرد ہونے کے الزام میں ان پر سیاسی اقتصادی اور معاشرتی پابندیاں عائد کر کے انہیں عدم استحکام کا شکار بنایا جائے۔ امت مسلمہ میں فرقہ بندیاں، نسلی و لسانی فسادات کو فروغ دے کر انہیں آپس میں لڑایا جائے، تبھی نیو ورلڈ آرڈر کے مقاصد کا حصول ممکن ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کی موجودگی میں یو۔این۔ او جو پہلے ہی عضو معطل اور بڑی طاقتوں کے رحم و کرم پر کام کر رہی تھی۔ مزید عضو مفلوج بن کر رہ گئی اسلامی ممالک پر ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے اور پر امن ایٹمی پروگرام کے قیام پر سخت احتجاج اور پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ جس کا واضح ثبوت پریسلر ترمیم اور سی ٹی بی ٹی کے معاہدوں میں نظر آتا ہے۔

عالم اسلام کے خلاف غیر مسلم قوتیں ملت واحد کے طور پر متحدہ ہو کر صلیبی جنگوں کے بعد مختلف محاذ کھول رہی ہیں۔ امریکہ نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعہ مسلمانوں کو اس قدر کمزور کرنا چاہتا ہے کہ وہ مغرب کے اقتصادی، ثقافتی اور فوجی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ نیو ورلڈ آرڈر موجودہ زوال کو دائمی بنانا اور رہی سہی غیرت و حمیت کو ختم کرنے کی گہری سازش ہے۔

حرف آخر:

عالم اسلام کی اس صورت حال کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے با آسانی کیا جا سکتا ہے کہ ہم مسلمان اغیار کے ہاتھوں استعمال ہو کر اپنی قوم و ملت کو کس قدر گھمبیر مسائل سے دوچار کرتے ہیں اور اپنی غیرت ایمانی کیلئے "چہ ارزاں فروختیم" کا دستاویزی ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ تلخ حقیقت اب چونکہ پریس سے گزر کر تاریخ کا روپ دھار چکی ہے اس لئے اس سے انکار ممکن نہیں۔ تفصیل کچھ یوں ہے:

> "جنوری ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں نیویارک ٹائمز نے یہ سنسنی خیز خبر شائع کی کہ غیر ملکی جاسوسی کا ادارہ سی آئی اے اپنے خفیہ فنڈز سے تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے بعض اخبارات، مذہبی سیاسی جماعتوں اور انکے رہنماؤں کو ہر سال کروڑوں ڈالر کی رقم فراہم کرتا ہے۔ ان رہنماؤں میں سے ایک غیر ملکی سربراہ مملکت کو ۱۴ سال کے دوران ۹ لاکھ ساٹھ ہزار ڈالر دیئے گئے۔ یہ پاکستان کے سابق صدر ایوب خان تھے۔ سابق صدر اور سی آئی اے کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ طے پایا تھا کہ سابق صدر سی آئی اے کو اس کی بین الاقوامی سرگرمیوں کے سلسلہ میں پاکستان کی حدود میں بعض خصوصی مراعات اور سہولتیں فراہم کریں گے اور اسکے صلہ میں انہیں -/70,000 (ستر ہزار) ڈالر سالانہ تاحیات ملتے رہیں

گے۔ جو انکے غیر ملکی اکاؤنٹ میں ہر سال پابندی سے جمع ہوتے رہیں گے۔ اس خفیہ معاہدہ پر ۱۹۶۰ء سے عمل درآمد شروع ہو گیا اور ۱۹۷۰ء کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔"

(وکیل انجم سیاست کے فرعون (مطبوعہ فیروز سنز لاہور ۱۹۹۲ء ص ۷۵۔۷۶)

اس ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امت مسلمہ کے بعض ارباب اقتدار کیا فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اسلامی ممالک میں اکھاڑ پچھاڑ کس امر کا پیش خیمہ ہے۔

امت مسلمہ کے اجتماعی مرض کی نشاندہی کسی حد تک کردی گئی ہے۔ طوالت کے ڈر سے ہم نے بہت سے حقائق عمداً حذف کردیئے ہیں۔ اب امت کے دردمند اور سنجیدہ اصحاب کا فریضہ ہے کہ وہ عالمی حالات کا بغور جائزہ لے کر امت مسلمہ کیلئے ایک معیاری طریق عمل تجویز کریں تاکہ مستقبل کی منصوبہ بندی اس کی روشنی میں طے پائے۔

قرب قیامت اور دنیا کے خاتمہ سے پہلے روئے ارض پر وہ دور سعادت یقیناً آئے گا جس میں اللہ تعالیٰ ایمان اور عمل صالح کی شرائط پوری کرنے والے مسلمانوں کو لازماً اس دھرتی کی خلافت اس طرح عطا کریگا جس طرح ان سے پہلی قوموں کو عطا کی تھی اور ان کیلئے اس دین کو اس سرزمین پر غلبہ عطا کریگا۔ جسے اس نے ان کیلئے پہلے ہی سے پسند فرمالیا تھا۔

العاقل يكفيه الاشارة:

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کے یہ اشعار اس خواب کی تعبیر کی طرف اشارہ کناں ہیں:

آسمان ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے!!

ڈاکٹر محمود الحسن عارف
صدر نشین شعبہ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی

اکیسویں صدی میں علوم عصریہ اور عوامی خدمت کی اہمیت

اکیسویں صدی کی آمد آمد ہے اس موقع پر مغربی ملکوں میں خصوصاً جوش و خروش کا مظاہرہ کیا جارہا ہے ایسے لگتا ہے جیسے دنیا نئے سرے سے جنم لے رہی ہو، یا پھر ہمارے سائنس دانوں نے ستاروں سے آگے کوئی نیا جہاں دریافت کر لیا ہو، اور یکم جنوری ۲۰۰۱ء کو دنیا اس میں نقل مکانی کرنے جارہی ہے۔

دوسری طرف اسلامی دنیا، ...... گومگو کے عالم میں ہے ...... جدید پڑھا لکھا طبقہ اسکے حق میں پرجوش نعرے بلند کر رہا ہے اور قیامت پرست مذہبی رہنما اسکے خلاف جوشیلی تقریریں کر رہے ہیں۔ ان حالات میں "الحق" اکوڑہ خٹک کا یہ اقدام یقیناً باعث تحسین و تبریک ہے کہ اس نے اس حوالے سے اپنے اوراق کا دامن دونوں طبقوں کیلئے پھیلا دیا ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ

ع صلائے عام ہے یار ان نکتہ دان کیلئے

اس سے پہلے، کہ ہم اس موضوع پر کچھ عرض کریں، مناسب ہو گا کہ یہ دیکھا جائے کہ زندہ قومیں اپنے قومی اور مذہبی دن کیوں مناتی ہیں؟...... دراصل "قومی دن" قوموں کو اپنے وجود و تشخص کا احساس بخشتے ہیں اور آنے والی نسلیں ان دنوں سے وابستہ قومی یادوں کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتی ہیں۔ اس تناظر میں جب ہم سال نو کے طوفان بد تمیزی بپا کرنے والے جشنوں اور اس موقع پر ہونے والے بے ہنگم شور و غل کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہیں رہتے کہ یہ سب کچھ شاندار ماضی کو "تابناک مستقبل" سے ملانے کا ایک بھونڈا انداز ہے اور چونکہ مغرب نے "اظہار مسرت" کا دنیا کو جو "نیا اسلوب اور آہنگ" دیا ہے اس میں "جسمانی کرتبوں" کو تمام تر اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے 'من' اور 'من کی دنیا' کے ہر نظارے کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اسی لئے وہ ان موقعوں پر اظہار مسرت کیلئے اسکے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتے اور نئی صدی کا آغاز بھی اسی طریقے سے کرنے کا پروگرام بنایا جارہا ہے۔

اسکے برعکس اسلام میں اظہار مسرت کیلئے 'تن' کی دنیا کی بجائے 'من کی دنیا' کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے اسلئے اسمیں عید جیسے خوشی کے موقع پر بھی خطبے نماز اور دعا کے ذریعے اظہار مسرت کا طریقہ سکھایا گیا ہے پھر احکام اسلام کی رو سے وقت اور زمانہ ایک مسلسل جاری و ساری رہنے والا عمل ہے۔ بقول

شاعر مشرق، علامہ اقبال

تو اسے پیمانہ ء امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں ہر دم جوان ہے زندگی

اسلام میں زمانہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا اور ہر دم جوان اور ہر آن رواں رہنے والا زندگی کا ایسا دریا ہے جو ازل سے ابد تک جاری رہے گا اور جسکے سوتے ازل کے چشموں سے پھوٹتے اور ابد کی وادیوں تک پہنچتے نظر آتے ہیں...... اسی لئے رسول کریم ﷺ نے زمانے کو برا بھلا کہنے سے روکا ہے اور قرار دیا ہے کہ 'زمانہ' درحقیقت اللہ بزرگ و برتر کے تکوینی احکام کا مظہر ہے، فرمایا۔ لا تسبوالدھر نجان اللہ ھوالدھر زمانے کو برا بھلامت کہو اس لئے کہ زمانہ خدا ہے۔

۱۔ زمانے کی اہمیت

تاہم ایک اعتبار سے اسلام نے زمانے کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے وہ اس طرح کہ زمانہ اختلاف لیل و نہار سے عبارت ہے جس میں لوگوں کیلئے بڑی عبرتیں اور بصیرتیں پنہاں ہیں(۱) جن میں سے ایک یہ ہے کہ وقت کے یہ پیمانے لوگوں کو وقت گزرنے کا احساس دلاتے ہیں اور ان پیمانوں کے ذریعے بندہ اپنے مسافر ہونے اور اس دینا کے 'مسافر خانہ' ہونے سے باخبر رہتا ہے۔

شب و روز کے ان پیمانوں میں ایک اور بصیرت یہ ہے کہ بندہ ان کے ذریعے اپنے گزرے ہوئے ماضی کا تجزیہ (analyses) اور اپنے مستقبل کیلئے منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ نئی صدی کی صبح کا آغاز اسی حوالے سے بہر حال اہمیت رکھتا ہے۔

وقت اور زمانے کی جس مقدار کو صدی کہا جاتا ہے یہ مقدار اسی بنا پر اہمیت رکھتی ہے کہ زندہ اور اولوالعزم قومیں، تاریخ کے اس نازک اور اہم حصے میں پچھلے حالات کا جائزہ لیکر مستقبل کے لئے منصوبہ بندی، کرتی ہیں اور آئندہ کے لئے ایسے اقدامات تجویز و طے کرتی ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی صلاحیتوں اور اپنے وسائل کو بہتر طریقے پر استعمال میں لا سکتی ہیں۔ اسلئے نئی عیسوی صدی (millenium) کی ابتداء بھی اسی قسم کا موقع ہے۔

اس موقع پر ایک طرف عیسائیت اپنے معاشی غلبے کے بعد مذہبی غلبے اور پوری دنیا پر اپنے استبداد کا پروگرام بنا رہی ہے تو دوسری طرف اسلامی دنیا اپنے آپ کو مغرب کے معاشی، سیاسی اور مذہبی محاصرے سے بچانے کے بارے میں غور و فکر میں مصروف ہے۔

۲۔ منصوبہ بندی کا فقدان...... ہمارا قومی المیہ

یہاں اگر یہ کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا کہ 'منصوبہ بندی کا فقدان ہمارا قومی شعار ہے تو بالکل بجا

ہوگا اس لئے کہ خواہ ملکی سطح ہو یا نجی اور انفرادی سطح ہر سطح پر منصوبہ بندی نہ کرنا ہماری روایت کا ایک حصہ ہے ہماری مثال تو صحرا میں بھٹکے ہوئے اس مسافر جیسی ہے جسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس کی منزل مقصود کیا ہے اور جو ہر شجر سایہ دار کو اپنی منزل مقصود سمجھ کر اسے اپنی قرار گاہ بنا لیتا ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد اسے پتہ چلتا ہے، کہ اسے تو دراصل کہیں اور جانا تھا۔

اسلامی دنیا (OIC) اس وقت ۵۰ سے زائد اسلامی مملکتوں پر محیط ہے اور اسے (آرگنائزیشن آف اسلامک کنٹریز کو) منصہ شہود پر آئے ہوئے تیس برس ہو رہے ہیں (اسکی ابتداء ۱۹۶۹ء سے ہوئی تھی) مگر تیس برسوں میں کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی جسے اس عالمی تنظیم کے "اعمال خیریہ" میں شامل کیا جائے۔ اسی طرح ہمارے ملک میں مذہبی جماعتیں اور تنظیمیں کئی سو کی تعداد میں ہونے کے باوجود کسی منظم منصوبہ بندی اور واضح پلاننگ کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہیں ان حالات میں نئی صدی کے نئے منصوبوں کی بات کرنا نقار خانے میں طوطی کی آواز کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتا، بایں ہمہ بھی اس "ساز کہن" کو بجانے میں کیا حرج ہے؟

۳۔ اندیشہ ہائے دور دراز

بیسویں صدی کے اختتام اور...... اکیسویں صدی کے آغاز پر...... عیسائی دنیا...... خصوصاً ایشیاء پر قبضے اور غلبے کے سنہری خواب دیکھ رہی ہے۔ پوپ جان پال نے نہرو سٹیڈیم (بھارت) میں ۵۰ ہزار عیسائیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "آنے والی صدی ایشیاء میں عسائیت کی صدی ہے انہوں نے جنونی ہندوؤں کے مظاہروں کے باوجود اپنے مذہب کی تبلیغ کو فریضہ قرار دیا۔" عیسائی دنیا نے بہت عرصے سے مسلمانوں میں تبلیغ کیلئے دو ذریعے اور طریقے اپنا رکھے ہیں گمان غالب ہے کہ وہ اس صدی میں ان ذریعوں کو مزید وسعت دیں گے۔ ان میں سے ایک طریقہ بہبود عوام کا ہے اور دوسرا طریقہ لوگوں کو جدید تعلیم education مہیا کرنا ہے۔ عیسائیوں کے تمام مذہبی ادارے انہی خطوط پر دنیا بھر میں عیسائیت کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں۔ اپنے اداروں کے ذریعے انکی اولین کوشش تو یہ ہے کہ وہ لوگوں کو عیسائی بنائیں اور اگر کسی کو عیسائی نہ بنا سکیں...... تو تب وہ کوشش کرتے ہیں وہ انکو 'نا مذہب' secular بنادیں یا کم از کم انکے عیسائیوں کے بارے میں تعصب ہی کو کم کر سکیں۔

عیسائیوں کے ان ہتھکنڈوں کا ازالہ صرف تقریروں اور نعروں سے ممکن ہے اور نہ ہی مناسب...... اس کیلئے اگلی صدی میں مسلمانوں کی مذہبی تنظیموں کو بڑی گہری منصوبہ بندی، محنت اور قربانی کی ضرورت ہوگی اور اسکے لئے کام کی حسب ذیل ترتیب متعین کرنا ہوگی۔

۱۔ جدید تعلیمی اور فنی اداروں کا قیام

نئی صدی اور جدید دنیا کی سب سے اولین ضرورت تو ایسے تعلیمی اور فنی اداروں کا قیام ہے جہاں جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ قدیم تربیت بھی مہیا کی جائے یہ کام جب مذہبی اداروں اور دینی تنظیموں کے تحت فروغ پذیر ہوگا اور اس میں قدیم وجدید طریقوں کا امتزاج عمل میں آئے گا تو اسکا رنگ ہی منفرد ہوگا۔

اس پہلو پر کام کرنے کیلئے سب سے پہلے تو ذہن سازی کی ضرورت ہے ہمارا مذہبی طبقہ ابھی تک جدید فکری اور فنی تعلیم کی اہمیت سے کماحقہ آگاہ نہیں ہے یا اگر آگاہ ہے تو اس سے تجاہل عارفانہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔

اس سلسلے میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اسلام میں "علم کے حوالے" سے "دینی اور دینوی" کی تقسیم کی کوئی گنجائش نہیں ہے اسلام نے ان تمام اساسی علوم کو اہمیت دی ہے جو انسان کیلئے کارآمد ہیں امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیا علوم الدین میں علم کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے اس میں انہوں نے علوم کو اچھے اور برے علوم کی دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا ہے اور یہ تقسیم انکے استعمال کے اعتبار سے ہے، مثال کے طور پر علم طلسم و نیر نجات کو انہوں نے برے علوم کے تحت رکھا ہے اس لئے کہ یہ علوم انسانوں کے لئے کارآمد نہیں ہیں۔(۳)

اس سلسلے میں اگر "کارآمد" ہونے ہی کو مدار ٹھہرالیا جائے تو جدید علوم وفنون کی اہمیت از خود واضح ہو جاتی ہے اور پھر نبی اکرم ﷺ نے الحكمة ضالة المومن کہہ کر مسلمانوں کو جن علوم کی طرف متوجہ کیا تھا کیا وہ صرف مذہبی علوم ہی تھے؟ اگر ایسا تھا تو انہیں ضالة المئومن(۴) (مومن کی متاع گم گشتہ) قرار دینے میں کیا حکمت ہے؟ اور پھر اگر اس فہرست میں جدید علوم وفنون شامل نہیں ہیں تو پہلی اور دوسری صدی ہجری میں جب آج سے بدرجہا بہتر اور افضل لوگ موجود تھے یونانیوں کے علوم و فنون کی بند کوٹھریاں کیوں کھولی گئیں اور بڑے بڑے مذہبی لوگوں اور دینی رہنماؤں نے ان علوم کو کیوں سیکھا؟ اور دوسروں کو سکھایا اور ان علوم پر کتابیں، تصنیف و تالیف کیں اور پھر ان میں سے بہت سے علوم مثلاً منطق، فلسفہ اور قدیم عربی ادب...... آخر کس بنا پر ابھی تک دینی مدارس کے نصب میں داخل اور شامل ہیں؟

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے تو دین اور دنیا کی تفریق نہیں کی تھی۔ بلکہ اسلام کے نزدیک تو علوم کی دو قسمیں تھیں۔ العلم علمان، علم الابدان وعلم الادیان۔ (امام شافعی) تمام علوم ہی دینی اور اسلامی ہیں..... تو پھر ان علوم سے اتنی پہلو تہی کیوں اور کس لئے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھی جائے کہ انہی علوم کو اپنی ڈھال بنا کر غیر مسلم اپنا کلچر اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت مسلم معاشرے میں پھیلا رہے ہیں ان حالات میں ان علوم سے ہماری پہلو تہی ایک مجرمانہ فعل کے سوا کچھ نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ دینی اور مذہبی ادارے تو پہلے ہی بمشکل اپنے ادارے چلا رہے ہیں وہ بیچارے ان جدید تعلیم گاہوں کا بوجھ کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ یہ سوال بہت اہم ہے لیکن جدید تعلیم و تربیت مہیا کرنے والوں کیلئے یہ مسئلہ کوئی اہم نہیں ہے اسلئے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہاں تمام دینی اداروں کا انتظام وانصرام عطیات اور چندوں پر ہوتا ہے لیکن "جدید تعلیم وتربیت" کا تمام تر نظام "خود کفالتی" یا "منافع بخش اسکیم" کے تحت انجام پذیر ہوگا اس اسکیم کیلئے صرف اچھی اور باوقار تعلیم گاہ مہیا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اسکے تمام اخراجات ...... ان اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے یا ان کے سرپرست خود برداشت کریں گے۔

دینی اور مذہبی اداروں کے تحت "جدید تعلیم" مہیا کرنے کا یہ تجربہ ہندوستان، ترکی، شام الجزائر، مصر انڈونیشا ملائیشیا اور سعودی عرب وغیرہ میں "منافع بخش" طریقے پر کامیاب رہا ہے اور عالمی طور پر بے حد فائدہ مند ہے۔ اور خود پاکستان میں بھی اس طرح کے کئی ادارے منافع بخش طور پر عمدگی اور کامیابی سے چل رہے ہیں۔(۵) ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ لوگوں کے لئے ان کے شایان شان عمدہ اور اچھا تعلیمی ماحول مہیا کیا جائے۔ اور اس نہج پر کام کو آگے بڑھایا جائے اسکی ایک صورت تو یہ ہے کہ خود بڑے بڑے دینی ادارے اپنی نگرانی میں یہ فریضہ سرانجام دیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے ہاں سے فارغ ہونے والے طالب علموں کو یہ ہدف دیں اور اسکے لئے انہیں ضروری مشاورت اور نگرانی مہیا کریں۔

ان دینی اداروں سے ملحق اداروں یا انکے زیر سرپرستی اداروں میں نصاب تعلیم پر بھی نظر ثانی کی جائے۔ اور حکومت پاکستان نے جن جن مضامین میں اپنا مرتب کردہ مواد رکھنے کی گنجائش رکھی ہے اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے نصاب تعلیم کو ممکنہ حد تک عمدہ اور دینی بنایا جائے اسطرح ان اداروں سے جو لوگ فارغ التحصیل ہونگے وہ پورے ملک میں ان اداروں کیلئے نیک نامی کا باعث بھی بنیں گے اور ان کالے انگریزوں کا ٹھیک علاج ثابت ہونگے۔ جو "بدیسی" اداروں کے تحت تعلیم حاصل کر کے ملک میں بے دینی اور انارکی پھیلا رہے ہیں۔ اس مقصد کے تحت، پرائمری، مڈل، ہائی سکول اور فنی تربیت کے اداروں کا قیام ایک منظم طریقے سے عمل میں لایا جانا چاہیے۔ اس مقصد کے لئے حکومت کے مختلف اداردوں سے مالی اور فنی امداد واعانت بھی حاصل ہوسکتی ہے۔(۶)

۲۔ رفاہ عامہ (ہسپتال، کلینکس) وغیرہ کا قیام:

غیر مسلموں کی تبلیغی، دعوتی سرگرمیوں کا توڑ کرنے کے لئے دوسرا راستہ ایسے رفاہ عامہ اور بہبود کے اداروں کا قیام عمل میں لانے کا ہے جو عوام کے لئے بہتری اور بھلائی کا ذریعہ ثابت ہوں، جیسا کہ اوپر تذکرہ ہوا۔ عام طور پر ہمارے ہاں جو مذہبی ادارے اور تنظیمیں کام کر رہی ہیں ان کی تمام تگ و دو اور دوڑ دھوپ صرف مساجد اور مدارس قائم کرنے اور انکے چلانے تک محدود ہے اور ملک و قوم کے لئے رفاہی کاموں کی بجاآوری کو سب اپنے دائرہ اختیار سے باہر خیال کرتی ہیں حالانکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے اسلام اللہ تعالیٰ کا وہ آخری اور کامل ترین دین ہے جو حقیقت اور سچائی کے بین الاقوامی اصولوں استوار پر ہے اسکا مادہ سلم ہے جس کے معنی امن و سلامتی کے ہیں۔ گویا اسلام ایسا مذہب ہے جو جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی سلامتی کا علمبردار ہے، اور اس کا دعوی ہے کہ اس مذہب کو قبول کرنے والے دنیا اور آخرت میں امن و سلامتی کے حق دار ٹھہرتے ہیں اور یہ کہ اس نظام حیات پر عمل کرنے سے انکے جسم اور ان کی روح مختلف قسم کی پریشانیوں اور بیماریوں میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس لئے قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: اذ جاء ربه بقلب سليم (۷) "جب وہ اپنے رب کے پاس سے قلب سلیم لے کر آئے" قلب سلیم سے ایک تو مراد یہ ہے کہ ان کا دل ہر روحانی عارضے سے صحیح و سالم تھا اور دوسرا مطلب یہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ جسمانی طور پر بھی انکا دل ہر مرض اور ہر عیب سے پاک و منزہ تھا۔

ہمارے اس دعوی کی مزید تائید ان احادیث طیبہ سے بھی ہوتی ہے جن میں نماز کی پابندی کرنے والے کو تمام موذی امراض سے صحت و سلامتی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے قلبی اور روحانی وظائف کا اس کی ظاہری اور جسمانی حالت پر بھی بڑا اثر پڑھتا ہے اور اب تو میڈیکل سائنس نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ مذہبی اعمال اور وظائف کرنے والے بڑی بڑی بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ پھر اسلام نے لوگوں کو روحانی امراض سے سلامتی کا خالی مژدہ ہی نہیں سنایا بلکہ اپنے ماننے والوں کو اس بات کی بھی ہدایت فرمائی ہے کہ وہ دوسروں کے لئے مجسمہ امن و سلامتی بن جائیں رسول رحمت ﷺ نے اپنے ایک پاکیزہ ارشاد میں فرمایا: المسلم من سلم المسلون من لسانه ويده (۸) "مسلمان تو وہ ہے جس کی زبان سے اور جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں" پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے۔ من قتل نفساً بغير او فساد في الارض فكانما قتل الناس جميعا ومن احياها فكانما احيا الناس جميعاً (۹) "جو شخص کسی کو ناحق قتل کرے گا بغیر اسکے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے، کی سزا دی جائے اس

نے گویا تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جو شخص اسکی زندگی کا موجب ہوا تو گویا وہ تمام لوگوں کی زندگی کا موجب ہوا۔

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کی زندگی کے رفاہی پہلو کو اتنی اہمیت عطا فرمائی کہ اسی پر نجات کامل کی اساس رکھی ہے مثال کے طور پر ایک حدیث طیبہ میں ایک فاحشہ عورت کی صرف اس بنا پر مغفرت کیے جانے کا ذکر ہے کہ اس نے ایک پیاس سے مرنے کے قریب کتے کو اپنی اوڑھنی کے ذریعے، کنویں سے نکال کر پانی پلایا تھا اور ایک عابد وزاہد عوت کی صرف اس بنا پر مبتلائے عذاب کئے جانا کا بیان ہے کہ اس نے اپنی پالتو بلی کو رسی سے باندھ دیا تھا جس کی بنا پر وہ بھوک اور پیاس سے ہلاک ہو گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رفاہ عامہ اور عوام الناس کی خدمت اور بھلائی کے کام اسلام میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور اسلام میں انکی اہمیت کسی طرح بھی روزے، زکوٰۃ اور دیگر فرائض کی بجاآوری سے کم نہیں ہے۔

یہ بات یہیں تک محدود اور موقوف نہیں ہے بلکہ نبی اکرم ﷺ نے اس نوع کے معمولی سے اعمال پر بھی ثواب اور اجر اکی بشارت دی ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث مبارکہ میں راستے میں کانٹے یا کسی اور تکلیف دہ شے کے اٹھانے پر اجر و ثواب کی خوشخبری دی گئی ہے اور بعض دوسری ولایات میں رفاہ عامہ کے لئے کئے ہوئے کتاوں کو ایسا صدقہ جاریہ قرار دیا گیا ہے جن کا ثواب ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بڑے اعمال پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے ثواب اور اجر کا انداز کیا ہوگا۔

۳۔ صحت و تندرستی کے مسائل

اسلام کے رفاہ عام اور افادہ عوام کے اس پروگرام میں لوگوں کی صحت و تندرستی کے لئے اختیار کردہ تدابیر اور مساعی کو خصوصی فوقیت حاصل ہے اوپر گزر چکا ہے کہ قرآن حکیم میں ایک انسان کی جان بچانے کے عمل کو تمام انسانیت کی جان بچانے کا عمل قرار دیا گیا ہے اور خود نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ اور اسلام کی سوا چودہ سو سالوں کی تاریخ سے اسکا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

قدیم زمانے میں ہسپتال کو بیمارستان کہا جاتا ہے اس میں مزید تخفیف ہوی تو یہ لفظ مارستان بن گیا اسلامی تاریخ میں پہلا مارستان یا ہسپتال خود نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں قائم کیا یہ واقعہ ۵ھ میں غزوہ خندق کے موقع پر پیش آیا۔

سیرت طیبہ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ اس جنگ میں معروف صحابی اور قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ شدید طور پر زخمی ہو گئے نبی اکرم ﷺ نے ان کے لئے مسجد نبوی میں خیمہ نصب فرمایا اور حضرت رفیدہ اسلمیہؓ کو انکی مرہم پٹی پر مامور کیا۔ حضرت رفیدہ دن میں کئی مرتبہ حضرت سعدؓ کی عیادت اور دیکھ بھال فرماتی تھیں لیکن تمام تر احتیاطی تدابیر اور علاج معالجہ کے باوجود ایک صبح لوگوں نے

دیکھا کہ حضرت سعدؓ بن معاذ کے خیمہ سے خون کی ایک دھار باہر کی طرف بہہ رہی ہے، دیکھا گیا تو حضرت سعد کا زخم کھل گیا تھا اور خون زیادہ بہہ جانے کی بنا پر ان کا اسی زخم سے انتقال ہو گیا یہی حضرت سعد تھے جن کے جنازے پر رسول اللہ ﷺ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر چل رہے تھے پوچھنے پر آپؐ نے بتایا کہ ان کے جنازے پر ستر ہزار فرشتے بھی نازل ہوئے ہیں۔

علاوہ ازیں طب اور میڈیکل کے شعبے کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ خود نبی اکرمؐ نے اس پیشے کو اپنے طرز عمل سے مشرف فرمایا، نامور محدث امام ترمذی نے اپنی جامع میں ایک خصوصی باب 'کتاب الطب' کے عنوان سے قائم کیا ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کے طریقہ علاج کے بارے میں بہت سی روایات شامل فرمائی ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نہ صرف روحانی امراض کے معالج تھے بلکہ آپؐ جسمانی عوارض اور بیماریوں کے لئے بھی طبیب کامل تھے، اس طرح اس پیشے کیلئے اس سے بڑا اعزاز کیا ہوگا کہ اسے 'سنت نبوی' ہونے کا اعزاز حاصل ہے بشرطیکہ یہ پیشہ خدمت عوام کے جذبے کے ساتھ اختیار کیا جائے۔

اسلام سے پہلے ہسپتالوں کے وجود کا کوئی مستند حوالہ نہیں ملتا کچھ لوگ اسے ایک اسطیری قبطی حکمران مناقیوش کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کچھ لوگ یونان کے معروف حکیم بقراط کی طرف لیکن حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی مذکورہ سنت سے استفادہ کرتے ہوئے اسلامی تاریخ میں پہلا ہسپتال یا مارستان نامور اموی خلیفہ الولید اول (۸۶۔۹۶ھ / ۷۰۵۔۷۱۵ء) نے قائم کیا اس میں کئی اطباء رکھے اور ان کی تنخواہیں (ارزاق) مقرر کیں۔[۱۲]

نامور مورخ علامہ ابو جعفر الطبری نے لکھا ہے کہ الولید نے کوڑھیوں کو علیحدہ رکھنے کا حکم دیا اور ان کیلئے عام لوگوں سے اختلاط ممنوع قرار دیا اور انکے لئے معاشی مدد مقرر کی۔ الطبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ الولید نے ان کو عطیات دیئے اور انہیں بھیک مانگنے سے منع کیا اس نے ہر اپاہج کے لئے ایک خادم اور ہر اندھے کیلئے ایک عصاکش (رہنما) مقرر کیا۔[۱۳] کیا مریضوں کیلئے اتنی فیاضی اور دریادلی کے ساتھ آج کے دور میں بھی اسطرح کے سلوک کی کوئی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں ہسپتال کے قیام کا یہ تو نقطہ آغاز تھا حقیقت تو یہ ہے کہ تاریخ اسلام کا ہر باب بڑے بڑے ہسپتالوں کے ذکر سے بھرا ہوا ہے، چنانچہ جب بنو عباس نے "بغداد" کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا جسے "عروس البلاد" کہنا چاہیے تو اس شہر کے ہر حصے میں ہسپتالوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بغداد کا سب سے بڑا اور مرکزی مارستان بغداد کی جنوب مغربی جانب مضافات شہر میں نہر کرخایا کے کنارے واقع تھا۔ اس ہسپتال کو نامور عباسی خلیفہ ھارون الرشید عباسی (۱۷۰ھ / ۷۸۶۔ ۱۹۳ھ / ۸۰۹ء) نے قائم کیا تھا یہ ہسپتال اگلی کئی صدیوں تک

عوام کی خدمت انجام دیتا رہا۔ بغداد ہی میں ایک بڑے ہسپتال کی بنیاد بدر المعتضد (۲۷۹ھ / ۸۹۲ء۔ ۲۸۹ھ / ۹۰۲ء) کے غلام المعتضدی نے دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر المخرم کے علاقے میں رکھی تھی (۱۴) بغداد ہی کے علاقہ حربیہ میں ایک اور مارستان شہر "المنصور" کے شمال میں واقع تھا جس کیلئے ۳۰۲ھ / ۹۱۴ء میں وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے ایک وقت مقرر کردیا تھا اس وزیر کے زمانے میں کئی ہسپتال مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں قائم ہوئے جن کی نگرانی وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے ابو عثمان سعید بن یعقوب الدمشقی کے سپرد کی تھی۔ یہ تو صرف ابتداء تاریخ اسلام کا محض ایک ورق تھا ورنہ اس دور میں ہر ایک شہر میں کئی کئی ہسپتال کام کرتے تھے جن میں باقاعدہ مریضوں کے قیام وطعام اور انکے لئے ادویات وغیرہ کا اہتمام ہوتا تھا ان ہسپتالوں سے ہزاروں لوگ بلا اجرت استفادہ کرتے تھے اور ہسپتالوں کا قیام اسلامی حکومت کیلئے لازمی فعل کی حیثیت رکھتا تھا ان سرکاری ہسپتالوں کیساتھ ساتھ پرائیویٹ طور پر بھی کئی ہسپتال قائم تھے جنکی سرپرستی مختلف صاحب حیثیت اور متمول لوگ کرتے تھے اور ان ہسپتالوں سے بلا تفریق مذہب وملت لوگوں کو خدمت مہیا کی جاتی تھی۔ (۱۵)

ان ہسپتالوں کیلئے اطباء کا انتخاب خالصتاً میرٹ پر ہوتا۔ اسمیں مسلمان اور غیر مسلم کا فرق ملحوظ نہ رکھا جاتا، چنانچہ نامور حکمران ہارون الرشید عباسی کا طبیب خاص جبریل بن خت یشوع ایک عیسائی تھا، جو شاہی طبیب ہونے کیساتھ ساتھ بغداد کے ہسپتال کا چیف میڈیکل آفیسر بھی تھا۔

ہسپتالوں میں مریضوں کو مفت ادویات مہیا کرنے کیساتھ ساتھ ان کی مالی امداد واعانت کا پہلو بھی مدنظر رکھا جاتا تھا پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کوڑھیوں اور اپاہجوں کو حکومت کی طرف سے ایک ایک خادم بھی مہیا کیا جاتا تھا۔

اس تفصیل سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ہسپتالوں اور شفاخانوں کا قیام مسلمانوں کے شاندار ماضی کا ایک لازوال کارنامہ ہے اور اس کار خیر کی ابتداء کرنے کا شرف بھی مسلمانوں کو ہی حاصل ہے۔ اس وقت ہمارے ملکی مسائل میں یہ دو شعبے، (تعلیم اور رفاہ عامہ کے پروگرام) بہت اہمیت رکھتے ہیں یہ درحقیقت رابطہ عوام کا ذریعہ بھی ہیں۔ موجودہ صدی میں علماء اور عوام کے مابین جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے اگر اگلی صدی میں یہ دونوں راستے اختیار کئے گئے تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ علماء اور عوام کے درمیان ٹوٹا ہوا رابطہ پھر بحال ہو جائے گا۔ رابطہ عوام کا یہ کام، اپنی سطح اور اپنی حیثیت کے مطابق انجام دیا جائے، چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں اس پروگرام پر چند سو روپے ماہانہ کے ذریعے اور بڑے شہروں میں چند ہزار روپے ماہانہ کے ذریعے اس پر عمل کیا جاسکتا ہے مگر تجربہ شرط ہے۔ ہمارے خیال میں اگلی صدی غلبہ اسلام کی صدی ہے لیکن اسکے لئے خصوصاً دیندار اور مذہبی طبقے کو اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے پر انجام

دینا ہونگی، اقبال کے ان امید افزاء اشعار پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔

شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی
آسمان ہو گا سحر کے نور سے آئندہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

حوالہ جات

۱۔ آل عمران (۳/ ۱۹۱۔ ۱۹۲)

۲۔ نوائے وقت، لاہور، مورخہ ۷۔ نومبر ۱۹۹۹ء

۳۔ تفصیل کے لئے دیکھئے الغزالی احیاء علوم الدین، جلد اول۔ قاہرہ

۴۔ ابن ماجہ السنن مقدمہ

۵۔ مثلاً کراچی اور لاہور میں "اقراء" کے تحت چلنے والے ادارے اسکی واضح مثال ہیں۔

۶۔ حکومت کے متعدد ادارے، مثلاً ایجوکیشن فاؤنڈیشن وغیرہ، مختلف شرائط کے تحت تعلیمی اداروں کو گرانٹس وغیرہ مہیا کر رہے ہیں۔

۷۔ الصافات (۳۷ ؟ ۸۴)

۸۔ البخاری، الجامع الصحیح (کتاب الایمان)

۹۔ المائدہ (۵/ ۳۲)

۱۰۔ دیکھئے النووی ریاض الصالحین

۱۱۔ ابن حجر العسقلانی :الاصابہ (جلد اول مقالہ سعد بن معاذ اور جلالہ ۔ مقالہ رفیدہ اسلمیہ)

۱۲۔ المقریزی، خطط، ۲: ۴۰۵

۱۳۔ الذہبی، تاریخ الاسلام، ۴، ۶۷

۱۴۔ ابن ابی اصیبعہ ۱: ۲۲۱۔ ۲۱۴

۱۵۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اردو دائرہ معارف اسلامیہ بذیل مادہ "بیمارستان"

پروفیشنل اور تجربہ کار ٹاؤن پلانرز کے زیرِ نگرانی عظیم الشان رہائشی منصوبہ جات

3 مرلہ، 5 مرلہ کے پلاٹس پر رہائشی مکان تعمیر کر کے آسان اقساط پر فروخت کیے جائیں گے

اسلام آباد سے قریب پُر شور اور پُر آلود زندگی سے بالکل پاک پُر فضا اور بہترین نظارے اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے بہترین سیرگاہ شاہ پور ڈیم، مجوزہ نیو انٹرنیشنل اسلام آباد ایئرپورٹ، موٹر وے پی اے ایف ہاؤسنگ سکیم، P.E.C.H.S ہاؤسنگ سکیم سے قریب تر، 120 فٹ چوڑی فتح جھنگ مین روڈ پر اور راولپنڈی سے 25 منٹ کی مسافت پر واقع ہے۔

طریقہ کار ادائیگی:

2000 روپے فی مرلہ ایڈوانس

200 روپے فی مرلہ قسط

کمرشل پلاٹ:

سائز 15 x 30

نقد ادائیگی پر رعایتی قیمت: 40,000 روپے وصول کیے جائیں گے

رہائشی پلاٹ: 5 مرلہ، 10 مرلہ اور ایک کنال کے رہائشی پلاٹس دستیاب ہیں

... کے علاوہ کوئی بھی شخص رقم وصول کرنے کا مجاز نہیں

اب موٹروے سٹی خیبر بلاک کی بکنگ کا اعلان کرتے ہیں جو کہ جماعتِ اسلامی کے مجوزہ مرکز قرطبہ سٹی اور تعمیر ملت ایجوکیشن سٹی (شفاء انٹرنیشنل ہسپتال اسلام آباد) کے درمیان نیو انٹرنیشنل اسلام آباد ایئرپورٹ اور بین الاقوامی شاہراہ موٹروے کے قریب واقع ہے۔

طریقہ کار ادائیگی:

1000 روپے فی مرلہ ایڈوانس

100 روپے فی مرلہ قسط

کمرشل پلاٹ:

سائز 15 x 30

نقد ادائیگی پر رعایتی قیمت: 30,000 روپے وصول کیے جائیں گے

کارنر اور ڈبل روڈ فیسنگ پر دس فیصد زائد

کُل قیمت کا نصف یکمشت ادا کرنے پر پندرہ دن کے اندر رجسٹری

ہمیں ملک بھر، آزاد کشمیر اور بیرون ملک سے نمائندے درکار ہیں۔ خواہش مند حضرات جلد رابطہ کریں۔

بروشر اور فارم دفتر سے مفت منگوائے جا سکتے ہیں

مزید تفصیلات کے لئے:

الاتحاد کارپوریشن

B-7 ... فون: 0320-4921862, 051-4581451

... فون نمبر 05775-664-210236

محمد نصیر خان مروت

چیف ایگزیکٹو

محمد یونس مئیو
لیکچرار اسلامیات' ڈسکہ کالج

بیسویں اور اکیسویں صدی میں علمائے دیوبند کا کردار

دنیا اب اکیسویں صدی کے دہانے پر کھڑی ہے' ہر مذہب' ہر قوم اور ہر جاندار سیاسی و مذہبی تحریک اس صدی کے افق پر نظر جمائے ہوئے ہے اپنی محنت' دعوت اور قربانی کی بنیاد پر اگلے سو سالوں کو اقوام عالم اپنے اپنے حق میں نتیجہ خیز بنانے کی فکر میں مبتلا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس صدی کے بارے میں متعدد اور متضاد دعوے اور اندازے منظر عام پر آتے رہتے ہیں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ صدی کمپیوٹر' انٹرنیٹ اور جدید مواصلاتی ذرائع لبلاغ کی صدی ہے۔ کامرس اور معاشیات کی تعلیمات کی صدی ہے۔ تباہ کن سائنس اور بے رحم اسلحہ جات کی صدی ہے جو قومیں عالمی سیاست کا پلڑا اپنے حق میں جھکانے کی فکر میں ہیں وہ یہی کہتی ہیں کہ یہ صدی "نیو ورلڈ آرڈر" کی صدی ہے' امریکہ کی صدی ہے' اتحادی طاقتوں کی صدی ہے۔ عالم نصرانیت اور صلیب کے علمبرداروں کا کہنا ہے کہ "یہ صدی مسیح کی صدی ہے" ان لوگوں کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ یہ امن کی صدی ہے یعنی اقوام متحدہ اور صلیبی اقوام کی صدی ہے یا پھر عیسائی این جی اوز کی صدی ہے۔ افکار کی دنیا میں رہنے والے کہتے ہیں کہ یہ تحقیق اور علم و ادب کی صدی ہے' فکرِ اقبال سے منسوب حضرات کا کہنا ہے کہ یہ افکار اقبال کی صدی ہو گی۔ مادر پدر آزاد اور مذہب سے بیزار یہ کہتے ہیں کہ یہ "وحدت ادیان" کی صدی ہے۔ آنے والی صدی کے حوالہ سے یہ نعرہ بھی کوئی غیر معروف نہ ہے کہ "یہ صدی اسلام کی صدی ہے" اور یہ بڑا معنی خیز دعویٰ ہے آثار و قرائن سے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ ان شاء اللہ یہ صدی اسلام کی صدی ہو گی۔ لیکن اسکے باوجود یہ سوال اپنی جگہ بڑا اہم ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہو گا جب عالم اسلام غفلت کی نیند سو رہا ہے' یہود و نصاریٰ نے سرزمین حجاز کے گرد اپنا حلقہ اور تنگ کر دیا ہے وہ قوم جو دعوت و جہاد کی بنیاد پر اقوام عالم پر چھا گئی تھی اب فکر و عمل کی توانائیوں سے محروم ہو چکی ہے اسکے اعضاء شل اور دماغ ماؤف ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ شمشیر و سناں سے بے وفائی کر کے طاؤس و رباب سے دل لگا بیٹھے ہیں۔ عالم اسلام کے تمام مسائل یہود و نصاریٰ کے پنجہ استبداد میں چلے گئے۔ عالمی میڈیا' معاشی منڈیوں اور تمام مالیاتی اداروں پر ان کا قبضہ ہے۔ دور حاضر کا سب سے خطرناک ہتھیار معاشیات اور اقتصادیات کا ہتھیار ہے۔

وطن عزیز میں آج کل ایک ہی صدا گونج رہی ہے کہ ہمارے تمام مسائل کا حل معیشت کی بحالی ہے۔ کسی بھی قیمت پر ایسا کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے۔ ایسے میں اقبال کا یہ کہنا کس کام آئے گا کہ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ہے جس سے تیری پرواز اور خودی متاثر ہو۔ عربوں کی حالت آپ کے سامنے ہے۔ ترک تھے جو مدت ہوئی اسلام کو عملاً ترک کر چکے ہیں۔ بنگلہ دیش ہے کہ عیسائی این جی اووز کی زد میں ہے۔ غربت و افلاس کے مارے مسلمان عیسائیت کی دہلیز پر جا کھڑے ہوئے ہیں۔ خود حکمرانوں کا بھی یہی عالم ہے پارلیمنٹ کی عمارت تک بھی این جی اوز کی تعمیر کردہ ہے۔ تعلیم ساری غیر مسلم تنظیموں کے پاس گروی ہے۔ "براک" نامی تنظیم ۸۰ ہزار انگلش میڈیم اسکول کھولنے کا منصوبہ رکھتی ہے۔ پاکستان میں بھی تین ہزار این جی اوز رجسٹرڈ ہیں اب یہاں بھی تعلیم کو ان کے حوالہ کرنے کا منصوبہ زیر غور ہے۔ انڈونیشیا بڑا اسلامی ملک تھا وہاں عیسائی ریاستوں (مشرقی تیمور وغیرہ) کے قیام کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے عالمی عیسائی طاقتیں مقامی عیسائی آبادی کی حمایت کر رہی ہیں۔ اگرچہ عالم اسلام ۵۰ سے زائد ملکوں پر مشتمل ہے لیکن کہیں سے بھی ٹھنڈی ہوا نہیں آتی۔ ان حالات میں یہ کہنا کہ آئندہ صدی اسلام کی صدی ہوگی ایک دیوانے کا خواب تو نہیں ہے؟ نہیں یہ دیوانے کا خواب ہے نہ ملا کی بڑ ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو آج نہیں تو کل ساری دنیا کو تسلیم کرنا ہوگا۔ یہ وقت کا تقاضا ہے کہ اسلام دنیا کی ضرورت ہو اور اس ضمن میں خاص بات یہ ہے کہ اہل مغرب اب یہ بات شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے اور انسانی نفسیات کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے معاشرے کے ہر طبقے کے مسائل کا احسن حل تجویز کرتا ہے۔ ایک جرمن نو مسلمہ ڈاکٹر اریں ربنیا ایف نے اپنے تفصیلی انٹرویو میں کہا ہے کہ "تمام مذاہب کے مقابلہ میں اسلام ہی سب سے زیادہ مہذب مذہب ہے دنیا کو اس وقت اسلامی تعلیمات کی ضرورت ہے صرف اسلام ہی موجودہ دور کے مسائل حل کر سکتا ہے"۔

ایک تحقیق کے مطابق فرانس میں اسلام دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں اسلام دوسرے مذاہب کے مقابلے میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ یہاں ہر سال ایک لاکھ پچیس ہزار مسلمانوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ برنارڈ لیوس ایک مشہور مستشرق کا کہنا ہے کہ

"عیسائیت اور اسلام میں چودہ سو سال سے کشمکش جاری ہے۔ یہودیت اور عیسائیت کی اسلام سے پرانی دشمنی ہے۔ یہ دشمنی ابد تک جاری رہے گی۔"

دور حاضر میں اس کی صورت بدل دی گئی ہے وہ یوں کہ "ترقی پسند" اور "بنیاد پرست اسلام" کی اصطلاحات وضع کر لیں گئی ہیں چنانچہ ایک مستشرق کا کہنا ہے کہ "اسلام سے دشمنی نہیں ہے مگر بنیاد پرست اسلام سے دشمنی ہے۔"

آج سادہ لوح مسلمان کہہ دیتے ہیں کہ عیسائی این جی اوز اور مشنری ادارے کسی مسلمان کو عیسائی نہیں بناتی لہذا ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ واضح رہے کہ ان مشنریوں کا اولین مقصد عیسائیت کی تبلیغ ہے اگر یہ مقصد حاصل نہ بھی ہوا تو کیا یہ کم ہے کہ مسلمان مسلمان نہ رہیں۔ چنانچہ کراچی کے ایک مشنری سکول کے پرنسپل نے کہا تھا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اگر مسلمان عیسائی نہیں بھی ہوئے تو کم از کم مسلمان نہ رہیں۔ افغانستان میں اسلامی انقلاب اور اس کے اثرات دنیائے کفر سے دیکھے نہیں جاتے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے دنیا بھر میں عیسائی تنظیموں کا جال پھیلا دیا ہے۔ ان تنظیموں کا ایک مشترکہ مشن "ورلڈ آپریشن" کے نام سے سرگرم عمل ہے۔ اس مشن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام ہے۔ اس لئے اس مشن نے یہ نعرہ بلند کیا ہے۔ "عیسائیو! اٹھو اور دنیا پر غلبہ حاصل کرو۔ مسیح کیلئے اسلام کو فتح کرو، مسلمانوں کو مکمل سیکولر بنا کر عیسائیت میں داخل کرو اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لئے کوئی لارنس آف عربیہ پیدا کرو" یہ وہی نعرہ ہے جس کے نتیجے اور رد عمل میں صلیبی جنگیں برپا ہوئیں۔

آج پھر وہی حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر کوئی تاریخ دہرائی جائیگی پھر کوئی معرکہ ہوگا۔ جان فروشی اور جانبازی کے لئے قدرت نے پھر وہی سرزمین منتخب کی ہے۔ جس کے چپے چپے پر اکابرین علماء دیوبند کی داستانیں رقم ہیں۔ یہی لوگ تھے جن کی بدولت برصغیر پاک و ہند میں اسلام کا جھنڈا بلند ہوا۔ ظفر علی خان نے کیا خوب کہا تھا کہ "شاد باد شاد زی اے سرزمین دیوبند" دنیا کے ہر خطہ میں ایک ہی دیو بند کی یلغار ہے۔ شورش مرحوم نے کہا تھا۔ "گونجے گا چار گھونٹ میں نانوتوی کا نام" مشرق و مغرب میں علماء حق نے اپنے ادارے قائم کردیئے ہیں، فرانس، لندن، جرمنی اور امریکہ میں علما نے اپنے قدم جما لئے ہیں اور اب بات یہاں تک پہنچی ہے کہ یورپی طاقتوں نے اپنے تمام مسائل (مذہبی و سیاسی) کیلئے "علماء دیوبند" کو قصور وار ٹھہرایا ہے۔ مولانا حافظ محمد اقبال رنگونی نے مانچسٹر سے اپنے ایک مضمون میں برطانیہ کے مشہور روزنامہ "ٹائمز" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "برطانیہ کی بہت سی مساجد میں "دیوبند" کا تیار کردہ نصاب پڑھایا جارہا ہے اور یہاں کے نوجوانوں کو اس دین پر لانے کی جدوجہد ہو رہی ہے جو افغانستان کے طالبان کا اعتقادی موقف ہے۔ یہاں کے نوجوانوں کو دارالعلوم دیوبند بھیجا جاتا ہے۔ جہاں وہ آٹھ سال کی ٹریننگ لے کر برطانیہ واپس آتے ہیں اور یہاں کی مساجد و مدارس میں اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ برطانیہ کی ۱۰۵ ملین مسلم آبادی (ترک، عرب، افریقہ، ملائیشیا اور انڈونیشیا) کم و بیش بیس (۲۰) فیصد حصہ دیوبندیوں پر مشتمل ہے اور جوں جوں یہ تعلیم و تبلیغ میں آگے بڑھتے جارہے ہیں ان میں اضافہ ہوتا جارہا ہے جو برطانیہ کے دانشوروں کی نظر میں قابل ستائش ہے۔ ولور ہمپٹن یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈی کے پروفیسر "Ron Geaves" اس پر اپنی تشویش کچھ اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

" The increase in Deoband teaching in Britain was a cause for Concern. The Deobandies are obsessed with fatwa. It is how they control their members and how would like to control the rest of the atomic world. Deobandies see their way as the only correct rout and are political in their teaching.

ٹائمز کی اس رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "طالبان کی اس مہم اور انقلاب میں سب سے زیاد ہ ہاتھ دیوبندی علماء اور دیوبندی مکتب فکر کا ہے۔ جو مذہب پسندی اور بنیاد پرستی میں بطور خاص معروف ہیں" حضرت رنگونی نے اس رپورٹ پر تبصرہ سے اعراض کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "یہ بات اب کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ سابق سوویت یونین کی شکست و ریخت اور مختلف ریاستوں میں بٹ جانے کا کام زیادہ تر ان ہی لوگوں کی جدوجہد سے عمل میں آیا ہے جو آج دیوبندی سمجھے جا رہے ہیں"

علماء دیوبند اپنے مقصد اور عشق میں سچے سمجھے جاتے ہیں ان کا مطلوب مالِ غنیمت اور کشور کشائی نہیں رہا یہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اٹھتے ہیں اور ان کا مقصود شہادت ہوتی ہے۔ اللہ کے خالص بندوں کا یہ گروہ اپنی اس حیثیت میں بہت ممتاز رہا ہے۔ افرادی طاقت اور وسائل کی بہتات سے یہ لوگ کبھی خائف نہیں ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں جہاد کے بارے میں مشاورت ہوئی تو وسائل اور اسباب کی قلت کو نظر انداز کرتے ہوئے اکابر علماء دیوبند شیخ امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند، مولانا رشید احمد گنگوہی اور حافظ محمد ضامن شہید آمادہ جہاد ہوئے۔ اسکے بعد ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون کے مشائخ اور علماء دیوبند نے جو کردار ادا کیا وہ تاریخ جہاد و قتال کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے ان حضرات نے ایک انگریزی کمپنی پر حملہ کر کے اس کے اسلحہ جات وغیرہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا اس کے بعد شاملی کی تحصیل پر حملہ آور ہوئے اور انگریزی فوج کو قلعہ بند ہونے پر مجبور کر دیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی جنگی بصیرت کی بدولت تحصیل فتح ہوئی۔ علماء کا مقصد صرف شاملی کو فتح کرنا نہ تھا بلکہ قاری محمد طیب کی روایت کے مطابق مولانا نانوتوی نے نواب شبیر علی خان کی معرفت بادشاہ دہلی کو جہاد پر آمادہ کیا اور پیغام بھیجا کہ ہم تھانہ بھون اور شاملی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اکابرین دیوبند نے سینکڑوں علما کی شہادت کے بعد آخر کار شاملی کو فتح کر لیا۔ جناب رفعت تھانوی نے اپنے مضمون "۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون" میں لکھا ہے کہ مجاہدین کا جانی نقصان بہت زیاد ہوا ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو تحصیل شاملی فتح ہوئی۔ اور اسی روز حافظ محمد ضامن کی شہادت بھی ہوئی۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ کو دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اسکے بعد انگریز فوج نے تھانہ بھون کو برباد کرنے کا ارادہ کیا اور قصبہ کا محاصرہ کر لیا۔ مجاہدین نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی قیادت میں مقابلہ کیا آخر کار انگریزوں نے تھانہ بھون چھوڑ دیا اس معرکہ میں طرفین کے پانچ سو آدمی کام آئے اس کے بعد بھاری توپ خانے سے خالی قصبہ پر حملہ ہوا

"حکیم الامت" کے تھانہ بھون کو مٹی کا ڈھیر بنادیا گیا اسی روز ۱۳۲ آدمی گرفتار ہوئے جن کو مہاجنوں کی باغچی میں پھانسی دے دی گئی۔ تھانہ بھون کی اس جنگ میں ایک ہزار افراد نے جامِ شہادت نوش کیا۔ تھانہ بھون کو جرمِ حریت میں بلیک لسٹ (Black list) کر دیا گیا انگریزوں کو مدتوں یہاں سے بغاوت کی بو آتی رہی۔ تھانہ کی ۳۵ ہزار آبادی میں سے چھ سات ہزار زندہ بچے۔ مولانا غلام رسول مہر نے "۱۸۵۷" میں لکھا ہے ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی سات دن کا جو قتل عام ہوا اس کا کوئی حساب نہیں۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے ملک کے کونے کونے میں عیسائی پادریوں اور مشنریوں کا جال بچھادیا۔ سرکاری ملازمین کو زبردستی عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ سکولوں میں سرِ عام بچوں کو عیسائیت کی تبلیغ کی جانے لگی۔ عیسائی پادریوں نے بازاروں، چوکوں اور راستوں پر کھڑے ہو کر اسلام کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا اس فکری محاذ پر بھی علمائے دیوبند ہی سینہ سپر ہوئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے عیسائی پادریوں اور ہندو پنڈتوں کا ہر شہر اور قصبے میں مقابلہ کیا۔ ان تمام مناظروں اور میلوں کی روئیداد چھپ چکی ہے۔ عیسائیت اور ہندومت کے تعاقب میں دیگر اکابرین دیوبند، مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، حافظ عبدالعدل، مولانا منیر نانوتوی، ناصر الدین ابوالمنصور اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی (رحمہم اللہ) خاص طور پر مشہور ہیں۔

ہندوستان میں جب تحریکوں کا زمانہ آیا تو علماء دیوبند نے عالمی تحریکوں کی سرپرستی کی۔ مولانا محمود الحسن دیوبندی نے "تحریک ریشمی رومال" کا پلیٹ فارم مرتب کیا جہاں سے علمائے برصغیر نے آزادی اور عالمی سیاسیات میں اہم کردار ادا کیا۔ حضرتِ دیوبندی کی تحریک کس قدر جاندار تھی اور عالمی سیاسیات میں اس کا کیا مقام ہے انگریز مورخوں کی کتابوں کے علاوہ مولانا سید محمد میاں کی مرتبہ کتاب "تحریک شیخ الہند" سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی، شیخ الہند کی فکر کے ترجمان تھے سر پر ٹوپی نہیں رکھتے تھے دہلی کی جامع مسجد میں تقریر کر رہے تھے کسی نے پوچھا حضرت وہ آپ کی ٹوپی کیا ہوئی فرمایا وہ تو اسی دن اتر گئی تھی جس دن ہندوستان غلام ہوا تھا۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے "سوانح قاسمی" میں قاری محمد طیب کی سیاسی یادداشت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "جب دہلی میں ملکہ وکٹوریہ کی رسم تاجپوشی کا زمانہ آیا تو امام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی دلی چھوڑ کر دیوبند چلے آئے کہا مجھ سے انگریز کی شرکت نہیں دیکھی جاتی۔ شیخ الہند کے بارے میں بھی قاری محمد طیب صاحب کی ہی روایت ہے کہ انگریز دشمنی ان کی رگ رگ میں اتر گئی تھی۔ تحریک آزادی ہند میں مولانا حسین احمد مدنی نے انگریزوں کے بارے میں کراچی کی عدالتوں میں کھڑے ہو کر فتویٰ دیا تو مولانا محمد علی جوہر نے آپ کے قدم چوم لئے۔ اس فتویٰ کی پاداش میں حضرت مدنی اور ان کے شیخ کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔

تحریک آزادی ہند کے علاوہ قیام پاکستان میں بھی علمائے دیوبند نے کلیدی اور بنیادی نوعیت کا کردار ادا کیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا بشیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا شبیر علی تھانوی، مفتی محمد شفیع اور مولانا خیر محمد جالندھری وہ عظیم ہستیاں ہیں جنہوں نے مسلم لیگ، قائداعظم، لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر کا بھرپور ساتھ دیا۔ مولانا تھانوی نے تھانہ بھون میں مسلم لیگ کے جلسے کرائے۔ اس کی حمایت میں فتاویٰ جاری کئے، مضامین تحریر کئے یہ تمام فتاویٰ و مضامین امداد الفتاوی کی جلد چہارم میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا نے گاؤں دیہات کی سطح پر مسلم لیگ کی تشکیل نو میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور اپنے تمام مریدین و متعلقین کو ہدایت کی وہ اپنے جھگڑے انگریزی عدالتوں کی بجائے مسلم لیگ کے ذمہ داروں کے پاس لے کر جائیں۔ جو حضرات قائداعظم، علامہ اقبال اور دیگر اکابرین تحریک پاکستان اور علماء دیوبند کی سیاسی، فکری اور تعلقات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں وہ اول پروفیسر محمد سعید خان کی کتاب "مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی" کا مطالعہ کریں اور اگر مناسب خیال کریں تو راقم کا مقالہ "علامہ اقبال اور مولانا اشرف علی تھانوی، افکار کا تقابلی مطالعہ" بھی ملاحظہ فرمالیں۔ ان شاء اللہ اس موضوع پر تشفی ہو جائیگی۔ نیز ان دو کتب میں اور بہت سے حوالے مل جائیں گے۔ امید واثق ہے کہ اس کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ "علمائے دیوبند" کے تذکرہ کے بغیر تحریک آزادی ہند اور تحریک قیام پاکستان کی تاریخ یقیناً نامکمل رہے گی۔ قیام پاکستان کے علاوہ استحکام پاکستان میں بھی علمائے حق کا ایک خاص مقام ہے۔ اکابرین دیوبند اسلام اور پاکستان کو دو چیزیں تصور نہیں کر سکتے۔ پاکستان کا وجود اسلام سے قائم ہے یہی وجہ ہے کہ علمائے حق نے وطن عزیز میں نفاذ اسلام کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔

پاکستان کی قانون ساز اسمبلیوں میں علمائے دیوبند کی تعداد مجموعی طور پر زیادہ رہی ہے بلوچستان اور سرحد میں مولانا مفتی محمود صاحب کے زمانہ میں جمعیت العلمائے اسلام کی حکومتیں بھی رہ چکی ہیں۔ ملک کے سب سے بڑے قانون ساز ادارے میں علماء کی نمائندگی کرتے ہوئے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق نے نفاذ اسلام کے سلسلہ میں گرانقدر کارنامے سرانجام دیئے ہیں جو کتابی شکل میں بعنوان "قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ" شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ان کی روایت و تاریخ کو ان کے فرزند ارجمند قائد جمعیت حضرت مولانا سمیع الحق صاحب نے زندہ رکھا۔ آپ نے سینٹ میں معروف شریعت بل پیش کیا۔ جس پر ملکی و غیر ملکی جرائد و رسائل میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

آج کون نہیں جانتا کہ علماء دیوبند نے ہر دور میں خارجی اور داخلی طور پر اسلام کا تحفظ کیا ہے جسے یقینی طور پر پاکستان کا تحفظ قرار دیا جا سکتا ہے۔ دنیائے کفر کی سازشوں کے نتیجے میں جو باطل فرقے اٹھتے رہے ان کا علمی و فکری اور عملی محاسبہ اکابرین علماء دیوبند ہی کرتے رہے ہیں۔ ان فتنوں میں انکار ختم

نبوت کا فتنہ سر فہرست ہے۔ بر صغیر کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے آپ کو امیر شریعت سید عطاء اللہ بخاری سے لے کر شیخ المشائخ حضرت مولانا خان محمد صاحب تک اور پھر حضرت محمد یوسف لدھیانوی تک علماء دیوبند ہی نظر آئیں گے۔ صرف ایک عالم دین حضرت مولانا منظور چنیوٹی کی خدمات کا تذکرہ ہزاروں صفحات پر محیط ہے۔ پھر اصحاب رسول کی عظمت رفتہ کی بحالی کیلئے وہ کون ہیں جنہوں نے قطار اندر قطار اور پے در پے شہادتوں کی ایک لازوال داستان رقم کر دی ہے۔ مولانا حق نواز' علامہ ضیاء الرحمان فاروقی' ایثار الحق قاسمی اور علامہ شعیب ندیم دیوبند کے وہ روحانی فرزند ہیں جنہیں بھلایا نہ جا سکے گا۔

عصری جہادی تحریکوں پر نظر ڈالئے تو بیسویں صدی میں سب سے جاندار اور فعال تحریکوں کے پس منظر میں علمائے دیوبند کھڑے نظر آئیں گے۔ کون نہیں جانتا کشمیر میں "حرکت الانصار" ہی وہ واحد تنظیم ہے جس پر امریکہ کے مطالبہ پر سب سے پہلے پابندی عائد کی گئی' غیروں کی سازشوں کی بدولت یہ تنظیم اب "حرکت المجاہدین" اور "حرکۃ الاجہاد اسلامی" کے ناموں سے سرگرم عمل ہے۔ مولانا مسعود اظہر کی رہائی کے بعد "جیش محمد" کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم ہو چکی ہے۔ اور دکھائی یوں دے رہا ہے کہ علماء کرام کی اکثریت "جیش محمد" کی سرپرستی کر رہی ہے خصوصاً کراچی کے علما کی سرپرستی میں مولانا مسعود اظہر کی تنظیمی صلاحیتوں اور اللہ کے فضل سے یہ جماعت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ جمعیت المجاہدین سمیت یہ جملہ جماعتیں ایک جیش کی شکل اختیار کر لیں۔

طالبان کا انقلاب بیسویں صدی کا سب سے بڑا واقعہ ہے' افغانستان کی آزادی روس کی شکست وریخت اور طالبان کی حکومت کے قیام سے استحکام تک علمائے دیوبند مسلسل شریک جہاد رہے ہیں اس امر میں کم از کم دو آراء نہیں ہو سکتیں یہ بات اب ماننا ہی پڑے گی کہ یہ علماء دیوبند ہی ہیں جو امریکہ اور یورپ کے منہ کو آتے ہیں خواہ بوسنیا کا مسئلہ ہو' چیچنیا کی آزادی ہو یا "اسامہ بن لادن" کا قصہ ہو۔ یہ قائد جمعیت مولانا سمیع الحق ہی ہیں جنہوں نے انقلاب افغانستان و طالبان کو عالمی میڈیا میں متعارف کرا لیا۔ اپنے مجلّہ "الحق" میں مضامین شائع کئے' طالبان پر نمبر نکالے اور طالبان کے انسانی رویوں کے بارے میں مغربی دنیا میں مشہور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ اور یہ مولانا فضل الرحمان ہی تھے جنہوں نے اسامہ بن لادن اور افغانستان پر حملہ کی دھمکی کے مقابلے میں یہ واضح کر دیا کہ امریکہ ایسا کرنے کی غلطی نہ کرے۔ ملک کے طول و عرض میں امریکہ مخالف رائے عامہ بیدار کرنے کی ہمت صرف علماء دیوبند کو ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ صاف صاف کہتا ہے کہ وہ یورپ میں دیوبندیوں کی بڑھتی ہوئی تحریکوں کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے مذہبی فرقوں' سیاسی جماعتوں معاشرتی طبقوں اور مختلف قومیتوں سے بے نیاز ہو کر صرف مسلمان رہ جائیں اور پھر سوچیں کہ کیا افغانستان کا اسلامی انقلاب

بیسویں صدی کا سب سے بڑا واقعہ نہیں ہے؟ کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ اس انقلاب کے اثرات اسلامی دنیا پر مرتب ہو رہے ہیں اور کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ افغانستان کے حالات نے امریکہ سمیت دنیائے کفر کو ایک اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ امریکہ نے ہمیشہ اسلامی ملکوں کو پریشان کیا ہے۔ یہ پہلی بار ہوا ہے کہ دنیا کے نقشے میں ایک خالص اسلامی حکومت دیکھ کر وہ خود بھی پریشان ہو گیا ہے۔ اور اب حیلوں بہانوں سے اس انقلاب کے اثرات زائل کرنے کی فکر میں ہے۔

علمائے دیوبند کی فکری، علمی تصنیفی، تبلیغی، اصلاحی اور جہادی تحاریک کے تناظر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں علماء دیوبند نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے سلسلہ میں نمایاں خدمات سر انجام دی ہیں۔ خاص طور پر طالبان حکومت کے حوالہ سے یہ بات قابل ذکر ہے نیز یہ امر بھی خوش آئند ہے کہ علماء دیوبند اور ان کے مدارس کی حیات بخش تحریکوں کو دیکھ کر بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی علمائے دیوبند کی صدی ہوگی (ان شاء اللہ) لیکن ضرورت اس امر کی ہے۔

(۱) علماء اپنے افکار و نظریات پر پختہ یقین رکھتے ہوئے وقت اور حالات کے تقاضوں کو بھی محسوس کریں اور تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے منصوبوں کو آگے بڑھائیں۔

(۲) حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی کی شہادت کے بعد خاص طور پر یہ محسوس کیا جانا چاہیے کہ اب وقت آگیا ہے کہ علما حق کی تمام جماعتیں اپنے اختلافات کو پس پشت ڈالتے ہوئے دین و دنیا اور مسلک حقہ کے تحفظ کے وسیع تر مفاد میں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ الحمد للہ اس سلسلہ میں علماء کا ایک نہایت اہم اجلاس ۲ جولائی ۲۰۰۰ء کو جامعہ محمدیہ 'اسلام آباد میں منعقد ہو چکا ہے۔ جس میں ۲ سو سے زائد علماء نے شرکت فرمائی اس اجلاس میں ایک رابطہ کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جو علمائے دیوبند کے جملہ معاملات سے عہدہ برآہ ہو گی۔ اس اجلاس کی مفصل رپورٹ حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری نے ماہنامہ "بینات" کراچی شمارہ ستمبر ۲۰۰۰ میں شائع کر دی ہے۔ مسلک اعتدال سے منسلک عوام و خواص کی دل خواہش ہے کہ اس کمیٹی کو مستقل بنیادوں پر قائم کر دیا جائے اور اس کے رابطہ اجلاسوں کو با قاعدہ اور منظم بنایا جائے۔ علمائے حق کی اس اجلاس میں شرکت سے امید واثق ہے کہ یہ رابطہ کمیٹی اکیسویں صدی میں علماء کے ملکی اتحاد میں سنگ میل ثابت ہو گی۔ اس کمیٹی کی ایک ترجیح یہ بھی ہونی چاہیے کہ علمائے دیوبند کی منتشر اور غیر منظم جماعتوں کو باہم مربوط کیا جائے۔ خاص طور پر جہادی تنظیموں کو۔

(۳) انقلاب افغانستان اور تحریک طالبان کی بہر حال امداد جاری رکھی جائے۔ اس ضمن میں کسی قسم کے مصالح کو بھی آڑے نہ آنے دیا جائے۔ یہ انقلاب علمائے حق کی سیاسی و جہادی قربانیوں کا مرہون منت ہے اور خاص طور پر دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے علماء کی کاوشیں اس بارے میں قابل ذکر ہیں اس

لئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اب پاکستان میں "علمائے دیوبند" کا دینی اور تحریکی مستقبل افغانستان کے طالبان سے وابستہ ہے۔ وطن عزیز میں جمہوریت کی جملہ صورتیں ناکامی سے دوچار ہو چکی ہیں اب نظام خلافت راشدہ کی باری ہے۔ ان حالات میں افغانستان کے طالبان پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ اس نظام حکومت کو قائم و دائم رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو دوسرے اسلامی ممالک اس کے اثرات سے ضرور متاثر ہوں گے اور اگر خدانخواستہ عالم کفر اور دنیا کے منافقین اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو گئے تو یاد رکھئے برصغیر میں ہمیشہ کے لئے "خلافت راشدہ" کا دوازہ بند ہو جائے گا۔ یہ بہت ضروری ہے کہ خود طالبان بھی اپنے انقلاب کی اہمیت سے کماحقہ آگاہ ہوں۔ بہر حال ان کے کچھ اقدام نظر ثانی کے محتاج ہیں اس ضمن میں جناب راشد الحق سمیع مدیر "الحق" کی تجاویز کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے مجلّہ کے شمارہ ۱۰ جولائی ۲۰۰۰ کے "نقش آغاز" میں تحریک طالبان افغانستان سے چند گزارشات کے عنوان سے پیش کی ہیں۔

(۴) ادیان، تحاریک اور انقلابات کا قوام و دوام ان کے علمی و تحقیقی، معاشرتی و سماجی، دینی و اصلاحی کارناموں اور ان کے تذکروں سے وابستہ ہوتا ہے۔ جن کو تاریخ کی شکل میں مدون و مرتب کیا جاتا رہا ہے۔ "اکابرین دیوبند" کا ایک اپنا تاریخی و تحریکی مقام ہے دورِ حاضر کی اکثر تحریکیں اور بذات خود طالبان کی تحریک بھی دیوبندی تحریکوں کا تسلسل معلوم ہوتی ہے۔ افکار و نظریات پر مبنی تحریکوں میں اس نفسیاتی و جذباتی پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا ضروری ہے کہ دور حاضر کے علماء دیوبند اور ان کی تحریکوں کی تاریخ مرتب کی جائے۔ یہ کام ماہنامہ "الرشید" لاہور اور الحق کے خصوصی نمبروں تک محدود نہ رکھا جائے۔ یہ مستقل اداروں کا کام ہے اس عالی مقصد کے پیش نظر "مجلس تحقیقات علمائے دیوبند" (Reearch Council) کے نام سے ایک منظم و جدید ادارے کی ضرورت سے انکار ناممکن ہے بہت مناسب ہوگا کہ اس ادارے میں مفتی تقی عثمانی، زاہد الراشدی، ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر، مولانا عبدالرشید ارشد اور حافظ عمار خان ناصر اور جناب حافظ راشد الحق سمیع جیسے جواں سال ادیب اور مدیر شامل کئے جائیں۔ اس کے ساتھ کالج و یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان اور ریسرچ اسکالرز کو بھی مناسب اور قابل ذکر نمائندگی دی جائے۔ یوں ایک جدید تحقیقی انداز میں علماء دیوبند کی خدمات پر تحقیقی مقالات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

(۵) دورِ حاضر میں علوم اسلامیہ، عربی، فارسی اور مطالعہ پاکستان جیسے مضامین اور زبانوں کی اہمیت و افادیت کے بارے میں کئی قسم کے سوالات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ خدانخواستہ ہمارے نصاب تعلیم سے یہ مضامین حذف کر دیئے جاتے ہیں اور باقی ماندہ تعلیم (NGO's) این جی اوز کے حوالہ کر دی جاتی ہے

جیسا کہ بعض حلقوں میں یہ خبر گرم ہے' تو بلاشبہ پاکستان کی آئندہ نسلیں اسلام اور تاریخ اسلام سے بے بہرہ ہوں گی۔ اور غیر ملکی تنظیموں کو اپنے مقاصد کے حصول میں بظاہر کوئی دشواری نہ ہو گی۔ ان حالات میں مدارس دینیہ کا کردار بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے یہاں یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہو گا کہ پھر مدارس عربیہ اور این جی اوز کی نگرانی میں حکومتی تعلیمی اداروں کا براہ راست فکری تصادم ہو گا۔ اس سے پہلے کہ وہ وقت آن پہنچے علمائے دیوبند اپنے مدارس کا نظام نہ صرف مستحکم بلکہ جدید بنیادوں پر استوار کریں ان اداروں کی تعداد اور معیار کو اتنا اوپر اٹھادیا جائے کہ عوام حکومتی اداروں کی بجائے ان کی طرف رجوع کرنے لگیں۔

آئندہ صدی میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی باگ ڈور انہیں مدارس کے طلبا کے ہاتھ میں جاتی معلوم ہوتی ہے لہذا ضروری ہے کہ علوم قدیم کے ساتھ ساتھ عصری اور جدید علوم کی طرف بھی بھرپور توجہ دی جائے۔ اس بحث کو ایک لطیف اشارے کی مدد سے یوں سمجھئے کہ آپ دیوبند کو علی گڑھ نہیں بنانا چاہتے تو کم از کم علی گڑھ کو ہی دیوبند بنانے کی سعی فرمایئے۔

دینی مدارس میں عالمی زبانوں میں دینی علوم کی تدریس پر غور کیا جائے' انگریزی اور چینی زبانوں کی طرف خاصی توجہ دینے کی ضرورت ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ دارالعلوم حقانیہ میں چینی اور تاجکستانی وغیرہ زبانوں میں علوم اسلامیہ کی تدریس ہوتی ہے۔ دوسرے مدارس میں بھی ایسا ہونا چاہیے۔ افغانستان میں ان مدارس کی شاخوں کو جاری کیا جائے۔ اس سلسلہ میں "الرشید" ٹرسٹ کراچی کی خدمات لائق تحسین ہیں' افغان طلبا کے علاوہ وسطی ایشیا کی ریاستوں کے طلبا کو دیوبندی مدارس میں داخل کیا جائے اور ان طلبا کی خالص مشنری انداز میں تربیت کے بعد واپس بھیجا جائے۔

آخر میں یہ وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ آئندہ صدی کا اسلامی انقلاب ان معروضات سے مشروط ہے نہ علمائے دیوبند کی عالمی فکر ان مشوروں کی محتاج ہے۔ بلکہ راقم الحروف تو اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ علمائے دیوبند ان تمام امور کو نظر میں رکھے ہوئے ہیں اور آئندہ صدی کیلئے ایک مربوط' منظم اور قابل عمل لائحہ عمل رکھتے ہیں اور ان شاء اللہ اکیسویں صدی علماء دیوبند کی صدی ہو گی۔ یہ صدی عثمانیوں' افغانیوں' اور حقانیوں کی صدی ہو گی۔ ان گزارشات سے میری مراد فقط اس فکر میں شمولیت کا احساس ہے جس کا تعلق مسلک اعتدال کے تحفظ اور ترقی سے ہے نیز بندہ کو کبھی اپنی حیثیت اور اوقات کے بارے میں کبھی غلط فہمی نہیں ہوئی کہ اکابرین کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کرنے لگوں یہ تو جناب مدیر "الحق" کی ذرہ نوازی ہے کہ مجھ سے خام علم اور پراگندہ طبع لوگوں کی سرپرستی فرماتے ہیں ۔ حالی کا یہ شعر موصوف پر خوب صادق آتا ہے۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا   خاکساری اپنی کام آئی بہت

...... ماخذ و مصادر ......

﴿کتب﴾

۱۔ حالی الطاف حسین، مولانا "حیات جاوید" نیشنل بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۸۲
۲۔ سید احمد پالنپوری، مولانا "دنیائے اسلامی کی عظیم ترین شخصیت، دارالعلوم دیوبند، سند ندارد
۳۔ شیخ محمد اکرام، "موج کوثر" ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور
۴۔ طفیل منگلوری "مسلمانوں کا روشن مستقبل" حماد اکیڈمی، لاہور، سن ندارد
۵۔ عبدالرشید ارشد، مولانا "بیس بڑے مسلمان" مکتبہ رشیدیہ، لاہور اگست ۱۹۸۳۔
۶۔ عبدالرشید ارشد، مولانا "بیس مردان حق" (۲ جلدیں) مکتبہ رشیدیہ، لاہور باراول ۱۹۹۶۔
۷۔ فخرالحسن گنگوہی، مولانا "مقدمہ انتصارالاسلام" (تصنیف مولانا محمد قاسم نانوتوی) ادارہ اسلامیات، لاہور ۱۹۸۱۔
۸۔ محمد قاسم نانوتوی، مولانا "میلہ خداشناسی" مرتبہ محمد ہاشم / محمد حیات، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۷۴
۹۔ محمد میاں، سید مولانا "علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے" مکتبہ رشیدیہ، کراچی ۱۹۹۲۔
۱۰۔ محمد میاں، "سید مولانا" علمائے ہند کا شاندار ماضی" مکتبہ رشیدیہ، کراچی، جلد پنجم۔
۱۱۔ مناظر احسن گیلانی، مولانا سوانح قاسمی (تین جلدیں) مکتبہ رحمانیہ، لاہور، سن ندارد
۱۲۔ محبوب رضوی، سید "تاریخ دارالعلوم دیوبند" میر محمد کتب خانہ، کراچی
۱۳۔ قاری محمد طیب، "حکمت قاسمیہ" دارالعلوم دیوبند، انڈیا
۱۴۔ قاری محمد طیب "مسلک علمائے دیوبند" دارالاشاعت کراچی ۱۹۹۴ء
۱۵۔ یعقوب نانوتوی، مولانا "سوانح عمری" مشمولہ "نادر مجموعہ رسائل" مولانا محمد قاسم نانوتوی" میر محمد کتب خانہ کراچی۔

﴿مضامین و مقالات﴾

۱۶۔ اسرار عالم "بین الاقوامی ایجنسیاں اور ان کا طریقہ کار" سہ ماہی "الشریعہ" جلد ۹، شمارہ ۲ اپریل ۱۹۹۸ء۔
۱۷۔ احمد حامد (قاہرہ) "نومسلم جرمن خاتون ایرین رہنیا کا قبول اسلام اور اثرات" ماہنامہ "الفاروق" کراچی، جلد ۱۳، شمارہ ۱۱، ۹۸ء
۱۸۔ ارشاد محمود، "این جی اوز کا اصلی مقصد اور حکومت کی بے بسی" "الفاروق" جلد ۱۵، شمارہ ۵۔ ستمبر ۹۹ء
۱۹۔ امین اللہ د شیر، ڈاکٹر "مسلمان فرانس میں" "الفاروق" جلد ۱۳، شمارہ ۱۱، مارچ ۱۹۹۸ء
۲۰۔ انوار حسین ہاشمی، "پاکستان کو عیسائی ریاست بنانے کا منصوبہ" "الفاروق" جلد ۱۳، شمارہ ۱۱، مارچ ۱۹۹۸ء
۲۱۔ راجہ محمد ذاکر خان "پاکستان یہودیوں کا سب سے بڑا ہدف" ماہنامہ "الحق" جلد ۳۰، شمارہ ۱۱۔
۲۲۔ رپورٹ "الفاروق" "بنگلہ دیش عیسائیت کی دہلیز پر" الفاروق جلد ۱۴، شمارہ ۱۲، اپریل ۹۹ء
۲۳۔ سر سید احمد خان "مولانا محمد قاسم نانوتوی" "علی گڑھ گزٹ" ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء مشمولہ "مقالات سر سید" مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور جلد ہفتم، طبع اول اکتوبر ۱۹۶۲ء۔
۲۴۔ مولانا محمد طاسین، "اسلام ہر دور کیلئے" "بینات" کراچی، جلد ۶۲، شمارہ ۳، جولائی ۹۹ء۔

ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی، ملتان
معروف سکالر و مضمون نگار

بیسویں صدی اور مخزن علم و معرفت دارالعلوم دیوبند

بیسویں صدی عیسوی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے استقبال کی تقریبات پاکستان میں اپنے اپنے طور پر شروع کی جارہی ہیں۔ یہ مسئلہ غور طلب نہیں بلکہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو ختم ہونے والا دن بیسویں صدی کا آخری دن نہیں ہے۔ اور یکم جنوری ۲۰۰۰ء کا دن اکیسویں صدی کا پہلا دن نہیں ہوگا بلکہ یکم جنوری ۲۰۰۱ء کا دن اکیسویں صدی کا پہلا دن ہوگا۔ کثیر تعداد میں لوگوں کو اس بات کا صحیح طریقے سے احساس نہیں ہے۔ ذرا سوچئے تو بھلا کہ ۳۱ دسمبر ۱۸۹۹ء کا دن انیسویں صدی کا آخری اور ۱۹۰۰ء کا پہلا دن بیسویں صدی عیسوی کا پہلا دن نہیں تھا۔ بلکہ یکم جنوری ۱۹۰۱ء سے بیسویں صدی کا آغاز ہوا تھا۔ لیکن آج کل کی طرح ذرائع ابلاغ کے فقدان کی وجہ سے اس بات کا شور و غوغہ نہ مچا۔

راقم الحروف ۲۰ نومبر ۱۹۷۹ء کو لندن میں تھا۔ وہاں کے مسلمان علماء وزعماء دین متین نے امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ بیدار کرنے اور موثر طور پر تاریخی و عمرانیاتی پہلوں پر غور و فکر کیلئے پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کی منصوبہ بندی شروع کردی۔ کہ ۲۰ نومبر ۱۹۷۹ بروز منگل بمطابق سہ شنبہ یکم محرم الحرام کو نیا ہجری سال شروع ہو رہا ہے۔ جبکہ وہ دراصل چودھویں صدی کا آخری سال تھا اور پندرھویں ہجری کا پہلا سال نہیں تھا۔ جس کو غلطی سے لندن جیسے شہر میں بھی نئی صدی ہجری کا سال آغاز سمجھ لیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس بات پر وہاں کے جرائد واخبارات میں بہت لے دے ہوئی۔ ہفت روزہ "ایٹ ڈیز" نے تو بڑی وضاحت سے لکھا۔ جسکا لب لباب یہ تھا کہ حقیقت میں پندرھویں صدی کا آغاز ایک سال بعد ہوگا۔ جب ہجری سال ۱۴۰۱ء شروع ہوگا۔ ایک اور اخبار "دی ٹائمز" نے بھی بڑے معنی خیز کالم شائع کئے تھے۔

بہر حال یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اسلام کے عالمگیر اصولوں پر یقین واعتقاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماہ نامہ "الحق" کی اشاعت خاص کا اہتمام کیا جو ان شاء اللہ فرزندان اسلام کے جذبات واحساسات کا غماز ہوگا۔ اور دشمنان اسلام کے عزائم اور منصوبوں کو بے نقاب کرنے میں ممد و معاون ثابت

ہوگا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنے والا نیا سال ۲۰۰۰ء بیسویں صدی کا آخری سال اور آنے والی اکیسویں صدی کا درمیانی وقفہ ہوگا۔ جو ہمیں بتائے گا کہ امت مسلمہ نے من حیث المجموع کیا کھویا اور کیا پایا۔ اسکے علاوہ فکر مند اذہان کو سوچنے پر مجبور کرے گا کہ اغیار ہمارے دین وملت کو ملیامیٹ کرنے کی سعی ناکام میں مصروف ہیں جن سے نبرد آزما ہونے کیلئے ہمیں کسی اعلیٰ فنی صلاحیت، فوجی طاقت، اقتصادی، معاشرتی، سیاسی، اصول وضوابط کی توضیحات وتصریحات کی تیاری کرنے کی ضرورت ہے۔

انگریز حکمران ہندوستان میں تاجروں کے بھیس میں وارد ہوئے اور حکمران بن بیٹھے۔ یہ کام (Over night) ایک رات میں نہیں ہوگیا۔ اسوقت مسلمان حکمران اپنی حکومت کے آخری سانس لے رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ مغل شہنشاہ ناچ گانوں اور رنگ رلیوں میں شب وروز گزار رہے تھے۔ ادھر ایسٹ انڈیا کمپنی کا جزل منگلیسن اپنی مکارانہ کاروائیوں سے انگریزوں کے قدم جمارہا تھا۔ اقتدار حاصل کرکے میکالے جیسے عیار شخص نے تعلیمی منصوبہ بندی شروع کردی۔ دشمن اسلام لارڈ ارئس نے ایسی حرکات کیں جنھوں نے مسلمانوں کے جذبات مجروع کئے۔ ہزاروں مسلمانوں کو پھانسی کے پھندے نصیب ہوئے۔ جن سے مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت پھیلنا شروع ہوگئی۔ ایسے نامساعد حالات میں اعلاء کلمۃ اللہ، مذہبی جذبات کے پیش نظر علماء دین کی ایک جماعت نے صدائے حق اور علم حریت بلند کردیا۔ اس جماعت کے قائدین میں ایک ناقابل فراموش شخصیت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی تھی جن کی ذات والاصفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

جب برصغیر میں انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہو چکا تو کچھ عرصہ کے اندر ہی فراست ایمانی کے طالبان میں ان کے افکار اور مسلمانوں کے خلاف گھناؤنی سازشیں نمایاں ہونے لگیں۔ جب چند افراد نے مشورہ کیا کہ ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے جو مسلمانوں کو اپنے اسلامی تمدن۔ افکار ونظریات کی اشاعت وحفاظت میں مددگار ورہنما ثابت ہوسکے۔ ان الہامات غیب کے تحت دیوبند میں یہ مدرسہ (دارالعلوم دیوبند) قائم کیا گیا جسکے بارے میں علمائے دین متفق ہیں کہ قطعاً اشارات غیب وقوع پذیر ہوا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنی روشن ضمیری سے شہر میرٹھ سے ملا محمودؒ کو بلوالیا۔ اور دیوبند کی مسجد چھتہ میں بٹھادیا۔ ملا محمودؒ علوم حدیث وفقہ کے فاضل استاد تھے۔ میرٹھ شہر میں مطبع ہاشمی میں ملازمت کرتے تھے۔ حضرت نانوتویؒ نے انہیں اسی دن مسجد چھتہ میں لابٹھایا۔ مدرسہ کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ایک شاگرد اور معلم آمنے سامنے انار کے درخت کے نیچے بیٹھ کر کہتے رہے۔

ہر کس کہ باور سد جائے برسد محمود رسید در مقام محمود

لطف کی بات یہ تھی کہ استاد کشتگان تسلیم ورضا کا نام بھی محمود تھا اور شاگرد رشید بھی محمود تھا

جو بعد میں حضرت مولانا محمود حسنؒ شیخ الہند بن کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ مابعد شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چند برسوں کے بعد جب طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوا تو ضرورت ہوئی کہ مدرسہ کی اپنی کوئی عمارت ہونی چاہیے۔ لہٰذا جہاں آج دارالعلوم دیوبند کی وسیع عمارت واقع ہے وہ قطعہ اراضی حاصل کیا گیا۔ زمین مل گئی تو حضرت مولانا رفیع الدینؒ کے زیر اہتمام اس عظیم عمارت کی بنیاد ڈالی گئی۔ ابھی بنیاد کھودنے کی جستجو ہی کی تھی کہ حضرت صاحبؒ کو خواب میں حضور سرور کائنات ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی کہ آپ نے اپنے عصائے مبارک سے زمین پر نشان لگایا کہ مجوزہ مدرسہ یہاں تک کشادہ ہونا چاہیے۔ آپ نے علی الصبح دیکھا تو زمین پر حضور کے عصائے مبارک کا نشان ہنوز لگا ہوا تھا۔ پس اس الہامی نشان پر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد قائم کرنے میں دیر نہ لگی۔ اس بنیاد کی پہلی اینٹ حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ سے رکھوائی گئی۔

حضرت مولانا رفیع الدینؒ کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ آپ نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ احاطہ موسری (دارالعلوم دیوبند) میں کنواں دودھ سے بھر گیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ حضرت صاحب ان چند اہل اللہ میں سے تھے جو اتباع اور روحانیت میں ہمہ وقت مستغرق رہتے تھے۔ آپ خواب میں دیکھتے ہیں کہ دودھ سے بھرے کنویں کی منڈیر پر حضور ﷺ تشریف فرما ہیں اور آنے والے کو پیالے سے دودھ بھر بھر کر عنایت فرما رہے ہیں لینے والوں کی قطاریں ہیں کوئی گھڑا بھر کر لے جا رہا ہے کوئی ہانڈی میں کوئی پیالے میں الغرض جسکے پاس جو برتن ہے وہ اسمیں نہیں تو چلو میں ہی لے جا رہا ہے۔ آنکھ کھلی تو منکشف ہوا کہ دارالعلوم کی مثال اس کنویں کی سی ہے اور بقدر ہمت و ظرف ہر آنے والا یہاں سے اپنا حصہ لے جا رہا ہے۔

مولانا رفیع الدینؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ کو مدرسہ کے بارے میں (Guidence) ہدایات غیب سے ملتی تھیں اور آپکے جملہ امور انہیں الہامات سے انجام پاتے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آپ امی محض تھے لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ صرف اپنے ارشادات لکھواتے اور سن کر درست فرماتے۔ گویا احکام اہتمام عروض ماورائی تھے۔ یعنی انکے قلبی مضمرات کسی دنیاوی علم کے تابع نہ تھے--- حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ بھی ان اکابرین میں سے تھے جن کا طریق کار احکامات، طرز تعلیم برائے دارالعلوم الغرض سب کچھ عالم اسباب سے زیادہ عالم غیب سے متعلق تھے۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ گزشتہ ایک سو سال سے زائد عرصہ میں ہزاروں کی تعداد میں فضلاء و علماء جو اس مدرسے سے تربیت پا کر نکلے ان کا علم بھی محض رسمی و سطحی نہیں ہو سکتا جنہوں نے اس متبرک ماحول میں تربیت پا کر علوم و اعمال کا اکتساب کیا جسمیں ناگزیر طریق پر معرفت و بصیرت شامل رہی۔

حضرت علامہ رشید احمد گنگوہیؒ ان نایاب اور مشک بیز علماء و محققین میں سے تھے جن میں صدق وعفت تفقہ اور مشکلات کا سامنا کرنے میں دین کی مضبوطی۔ اتباع سنت میں شریعت پر استقامت، حق کی وضاحت، بدرجہ اتم موجود تھی۔ آپ روشن ضمیری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بارے میں ایک دفعہ تحریر فرمایا کہ "آپ وہ شخص ہیں کہ جو اہل دل عارفین کے علوم کیساتھ ساتھ محدثین اور اہل ظواہر کے علوم میں بھی جامع تھے۔ اور جو علوم روایت کیساتھ ساتھ حیران کن تبحر کیساتھ فنون درایت میں بھی حیرت زا مہارت رکھتے تھے۔"
حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے دو جلیل القدر وارث عالم، عالم فنا میں وجود میں آئے تھے۔ اور وہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت محدث وفقیہ رشید احمد گنگوہیؒ تھے۔ یہاں علوم نبوت کی جو تعلیم و تدریس اور دعوت واشاعت اور اس کے مطابق تربیت اور تزکیہ اس طبقہ کے حضرات مدظلہ سے ہوا اس کی مثال قرون متاخرہ میں شاذ ہی مل سکتی ہے۔ قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کا ذوق گھر گھر پہنچا دینا انہی صاحبان کا صدقہ جاریہ ہے۔ دین متین کی خدمت کیلئے امت مسلمہ کی راہنمائی۔ قرآن وحدیث سے مسائل واحکام منضبط کئے جانے کیلئے جہاں اور کام ہوئے وہاں دارالافتاء کے قیام کا بھی یہی مقصد تھا۔ تاکہ دین محمدیؐ کی حفاظت بطریق احسن ہو سکے اور مسلمانوں کو لادینی گمراہیوں کی مسموم ہواؤں سے بچایا جا سکے۔ اس کام کیلئے ایسے شخص کی ضرورت پڑی جو اس عظیم منصب پر فائز ہو سکے۔ پہلے مولانا مفتی عزیز الرحمان عثمانی پھر حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی افتا کی خدمت پر معمور رہے۔ لوگوں میں انکے حسن عمل علم و تفقہ کی وجہ سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی دارالعلوم میں دارالافتا جہاں ایک طرف فتاویٰ ارسال کرنے کی خدمت انجام دیتا ہے وہاں ایسے افراد کی تعلیم تدریس وتربیت بھی کرتا ہے جو دیگر جوانب واطراف پر افتاء کا کام بہ احسن انجام دے سکیں۔ دارالعلوم سے فارغ ممتاز ذی فہم طلبا کا انتخاب کر کے ان کو اس اہم ترین کام کی تربیت دی جاتی ہے۔ چند نامور مفتیان اعلیٰ مقام کے اسمائے گرامی پیش خدمت ہیں۔ حضرت مولانا عزیز الرحمان عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا مفتی اعزاز علیؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مفتی مہدی حسن شاہجہانپوریؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ جنہوں نے افتاء کا گراں بہا کارنامہ عرصہ تلک انجام دیا۔

قیام پاکستان کے بعد دیوبندی علما کا علمی اور روحانی مرکز ہندوستان میں رہ گیا۔ اس لئے دارالعلوم دیوبند سے قلبی وروحانی وابستگی کے باوجود پاکستان میں مختلف مقامات پر علمی مراکز قائم کئے گئے جہاں دارالعلوم دیوبند کے پرتو اب بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ مدنیہ لاہور، جامعہ خیر المدارس ملتان۔ دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار، دارالعلوم کھڈہ کراچی، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے علاوہ

ڈھاکہ اور راج شاہی میں درسگاہیں دیوبندی مکتب فکر کی علمی یادگاروں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ راقم الحروف گو بوجوہ دار العلوم کا طالب علم نہیں رہا۔ مگر "نسبت ہے دور کی" کے مصداق اس گھرانے اور مقام سے تعلق رکھتا ہے جہاں دیوبند سے مشک بیز تجلیات و برکات کے جھونکے جسم و جاں کو معطر کیے رکھتے تھے۔ یہ تعلق ایک خواب تھا جو شہر میرٹھ کہلاتا تھا۔ جو میرٹھ کمشنری کا صدر مقام تھا جس میں اضلاع میرٹھ۔ مظفر نگر اور سہارنپور شامل تھے۔ جہاں دیوبند تھانہ بھون، بلند شہر، کیرانہ، انبیٹھہ، گلاوٹھی خورجہ، ہاپوڑ جیسے مردم خیز قصبات موجود تھے۔ جو اب شہر بن چکے ہیں۔ ان مقامات میں تقریباً ہر جگہ میری دودھیالی اور ننھیالی عزیزداریاں تھیں۔ جناب مولوی محمد ہاشمؒ میرے دادا کے عم زاد تھے میرے والد انہیں تایا کہا کرتے تھے جنہوں نے میرٹھ میں مدرسہ العلوم شروع کیا۔ مابعد دار العلوم دیوبند الحاق ہو گیا۔ مولانا سید بدر عالمؒ کا میرٹھ کے جید علماء محدثین میں شمار ہوتا ہے۔ آپ کی ذات ستودہ صفات سے دار العلوم ہی نہیں برصغیر مستفیض ہوا' وہ راقم الحروف کے نانا کے تایازاد تھے۔ والد صاحب کے ہمراہ بچپن میں ایک مرتبہ ۱۹۳۹ء میں سہارنپور جاتے ہوئے دیوبند میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ مسجد چھتہ میں نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد والد صاحب کسی بزرگ کی تلاش میں ادھر ادھر پھرتے رہے معلوم ہوا کہ وہ بزرگ سہارنپور گئے ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی چونکہ سہارنپور جانا تھا۔ شام کو وہاں پہنچے تو عشاء کی نماز مدرسہ مظاہر علوم میں ادائیگی کے بعد وہ بزرگ مل گئے۔ والد صاحب نہایت ادب سے بہت دیر گفتگو کرتے رہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بزرگ نور دیدہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تھے۔ اسکے علاوہ ۴۶ء میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی سے مسلم لیگ کے جلسوں میں میرٹھ میں دو مرتبہ ملاقات ہوئی اور بہاولپور میں ۴۹ء میں آپکی نماز جنازہ پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میرٹھ سے ایسی ایسی نابغہ روزگار شخصیات کا تعلق رہا جنکی دین متین کی خدمات دار العلوم دیوبند فراموش نہ کر سکے گا۔ جن میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ، حضرت مولانا سید بدر عالمؒ مولانا قاضی زین العابدین سجاد، مولانا محمد منظور نعمانی مولانا عاشق الٰہیؒ مولانا عبد العلیؒ، مولانا محمد ہاشم کے علاوہ دار العلوم دیوبند کے اولین معلم حضرت ملا محمودؒ نے مدتوں میرٹھ میں قیام کیا تھا ان سب کا براہ راست اور بالواسطہ تعلق دیوبند کے دار العلوم سے تھا۔ انکے علاوہ سیکڑوں ایسے بھی ہونگے جنکے اسمائے گرامی تشہیر کے محتاج نہیں وہ حسب استطاعت و قابلیت تدریس و تصنیف، تربیت اور مسائل افتاء خاموش طریقوں پر انجام دے رہے ہونگے اور عالم غیب کے دفاتر میں منضبط ہیں چونکہ غیب کے ہی اشاروں پر انکی تعلیم و تربیت احسن طریقوں سے انجام پائی۔

ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر
انچارج سیرت چیئر، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

نیا ہزاریہ اور امت مسلمہ کو پیش آمدہ معاشرتی چیلنجز

دنیا دار المحن اور مسائل کا گھر ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الذی خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً (۱)

"وہ ذات جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔"

انسان کو پیدائش سے لے کر موت تک انفرادی اور اجتماعی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی مدد اور رہنمائی ہی ان مسائل کے حل کا واحد راستہ ہے۔ حضرت آدمؑ کو زمین پر بھیجتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

"فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (۲)

"پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا"

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اس میں زندگی کے ہر معاملے میں رہنمائی ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" (۳)

"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کر لیا ہے۔"

کائنات کی کامیابی صرف اسلام کو اپنانے میں ہے اور اسکو چھوڑنا باعث نقصان ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه وھو فی الاخرۃ من الخسرین (۴)

"اور اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہر گز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا"

اصل رہنمائی اسلامی تعلیمات ہی سے ملتی ہے۔ آیت مبارکہ ہے:

کیف یھدی اللہ قوما کفروا بعد ایمانھم وشھدوا ان الرسول حق و جاء ھم البینات "(۵)

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت بخشے جنہوں نے نعمت ایمان پا لینے کے بعد پھر کفر اختیار کر لیا حالانکہ وہ خود اس بات پر گواہی دے چکے ہیں کہ یہ رسول حق پر ہے اور انکے پاس روشن نشانیاں بھی آچکی ہیں۔"

اسی طرح فرمایا: اللہ کے ہاں اسلام ہی مقبول نظام زندگی ہے:

ان الدین عند اللہ الاسلام (۶)

"اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"

اللہ تعالیٰ نے اس ضابطہ کو عنایت فرمانے کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس ضابطہ کو سامنے رکھنے سے زندگی کے تمام مسائل کا حل ہوگا اور زندگی میں مسائل کا پیش آنا لازمی امر ہے۔

" ولنبلونکم بشئی من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین" (۷)

"اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں انہیں خوشخبری دے دو۔"

اور پھر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کے بارے میں کہ جو تمام چیلنجز کا مقابلہ کر سکتا ہے فرمایا:

لقد کان لکم فی رسو ل اللہ اسوۃ حسنہ (۸)

"در حقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول ﷺ میں ایک بہترین نمونہ ہے"

مسائل کا حل اسوہ حسنہ کی روشنی میں طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام آئے تب بھی مسائل تھے قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس (۹)

"یہ لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے کہ خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے۔"

مسائل خواہ کسی قسم کے ہوں۔ فساد خواہ کسی نوعیت کا ہو۔ وحی ربانی کے توسط سے ہی ان کا حل ممکن ہے۔ جن لوگوں نے اس کو سامنے نہ رکھا وہ معاشی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی ہر لحاظ سے پریشان رہے اور ہیں۔ اہل کتاب کے متعلق ارشاد ربانی ہے"

ولو انهم اقاموا التوراة والانجيل وما انزل اليهم من ربهم لاكلوا من فوقهم ومن تحت ارجلهم " (۱۰)

"کاش انہوں نے تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں اگر وہ ایسا کرتے تو ان کیلئے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا"
مسلمانوں سے فرمایا گیا:

ولو ان اهل القرى امنوا واتقوا لفتحنا عليهم بركات من السماء والارض ولكن كذبوا فاخذ نا هم بما كانوا يكذبون (۱۲)

"اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے تو جھٹلایا لہذا ہم نے اس برائی کے حساب سے انہیں پکڑ لیا۔"

پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے اسلام کے نفاذ سے خوشحالی کی خوشخبری سنائی: حضرت عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ میں حضور ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کسی آدمی نے آکر فاقہ کشی کی شکایت کی پھر کوئی آدمی آیا اس نے ڈاکے کی شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا: عدی! کیا آپ نے حیرہ دیکھا ہے؟ میں نے کہا نہیں دیکھا لیکن اس کے بارے میں جانتا ہوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اگر آپ کی لمبی عمر ہوئی تو آپ دیکھیں گے کہ ایک عورت حیرہ سے چلے گی اور خانہ کعبہ کا طواف کرے گی۔ اللہ کے علاوہ اس کو کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ قبیلہ طے کے ڈاکو کدھر جائیں گے جنہوں نے فتنہ برپا کر رکھا ہے؟ آپؐ نے یہ بھی اس وقت ارشاد فرمایا اگر آپ کی زندگی لمبی ہوئی تو آپ کسریٰ کے خزانوں کو فتح کریں گے۔ میں نے کہا۔ کسریٰ بن ہرمز آپؐ نے فرمایا کسریٰ بن ہرمز اور آپ کی زندگی اگر لمبی ہوئی تو آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص مٹھی بھر سونا لے کر صدقہ و خیرات کے لئے نکلے گا۔ مگر کوئی لینے والا نہ ہوگا۔ حضرت عدیؓ فرماتے ہیں پھر میں نے اس عورت کو دیکھا جس نے خانہ کعبہ کا طواف کیا اور اسے خدا کے علاوہ کسی کا ڈر نہ تھا اور میں ان لوگوں میں شامل ہوں جنہوں نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے تقسیم کیئے اور اگر آپ لوگ زندہ رہے تو آپ دیکھیں گے جو پیغمبر علیہ السلام نے مٹھی بھر سونا لیکر نکلنے والے کے بارے میں ارشاد فرمایا (۱۲-۱) حدیث قدسی ہے:

لو ان عبادى اطاعونى لاسقيتهم المطر بالليل واطلعت عليهم الشمس بالنهار ولم اسمعهم صوت الرعد (۱۲-۲)

"اگر میرے بندے میری اطاعت کریں تو میں ان کو رات کے وقت بارش پلاؤں اور دن کو ان

پر سورج طلوع کردوں اور ان کو کڑک کی آواز نہ سناؤں"

مسلم امت کے سامنے اس وقت بے شمار چیلنجز ہیں۔ان میں معاشرتی' معاشی' سیاسی' اخلاقی اور تعلیمی چیلنجز شامل ہیں۔میں نے اس مقالے میں معاشرتی چیلنجز کے حوالے سے تین چیلنجز کے متعلق اپنی معروضات پیش کی ہیں :

۱۔ غربت وبے روزگاری ۲۔ جہالت وناخواندگی ۳۔ اخلاقی انحطاط

غربت امت مسلمہ کے سامنے اہم چیلنج ہے۔دنیا کے وسائل کا ۸۰ فیصد حصہ ترقی یافتہ ممالک استعمال کررہے ہیں جبکہ صرف ۲۰ فیصد پسماندہ ممالک استعمال کررہے ہیں۔ان ممالک میں آبادی بھی زیادہ ہے۔پاکستان میں ایک ہزار میں سے ۹۵ بچے اپنی عمر کے پہلے سال مر جاتے ہیں ہر سال ۳۵ لاکھ بچے سکول جانے کی عمر کو پہنچتے ہیں ان میں سے ۵۴ فیصد لڑکوں اور ۳۰ فیصد لڑکیوں کو پہلی جماعت میں داخلہ ملتا ہے اور ان میں سے بھی صرف ۴۵ فیصد بچے پانچویں جماعت تک پہنچتے ہیں۔ہماری خواندگی کی مجموعی شرح ۳۵ فیصد ہے (۱۳)

ترقی یافتہ ممالک کی تجارتی اور اقتصادی میدان میں اجارہ داری ہے جبکہ ہمارے ملک میں غربت کا دور دورہ ہے۔۱۹۹۰ میں تیسری دنیا کی آبادی کا ۲۹ اعشاریہ ۷ فیصد حصہ غربت کی سطح پر زندگی بسر کررہا تھا۔۱۹۸۷ء تا ۱۹۹۱ء کے سروے کے مطابق مندرجہ ذیل اعداد وشمار ہیں :

ملک	فی کس آمدنی (امریکی ڈالرز میں)
سوئٹزرلینڈ	۳۰۲۷۰
امریکہ	۲۱۱۰۰
جاپان	۱۸۲۳۴
پاکستان	۳۷۰
انڈیا	۳۵۰
سوڈان	۳۴۰
ایتھوپیا	۱۲۰ (۱۴)

مندرجہ بالا اعداد وشمار سے ایتھوپیا' پاکستان اور سوڈان میں غربت وافلاس دیگر ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں صاف ظاہر ہے۔ترقی یافتہ ملک امیر سے امیر تر اور غریب ممالک سے غریب تر ہوتے جارہے ہیں۔کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر کے ان پر اقتصادی پابندیاں لگادی جاتی ہیں۔ان کی اشیاء کو خریدا نہیں جاتا اور اگر خریدا جاتا ہے تو نہایت ہی سستے داموں تاکہ یہ لوگ ترقی نہ کرسکیں۔اگر کسی قسم

کی کوئی مالی امداد دی جاتی ہے تو قرض کی صورت میں اور اس پر سود کے بوجھ سے مزید ان کی حالت ابتر ہو جاتی ہے۔

پاکستان آئی ایم ایف کا مقروض ہے اور اس پر مستزاد بے جا پابندیاں کہ آئے دن بجلی اور اشیائے صرف کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ کا حکم تاکہ یہ ملک مزید مسائل و مصائب میں گھر ا رہے۔

رسول اللہ ﷺ نے قرض مانگنے کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا:

الید العلیا خیر من ید السفلی "(۱۵)

"اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے"

ہمیں چاہیے کہ خود انحصاری سے غربت کو ختم کریں چین نے خود انحصاری سے اپنے مسائل کو حل کیا۔ جاپان بھی محنت کر کے ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہو گیا ہے۔ غربت پریشانی کا باعث ہے آپؐ نے فرمایا:

کاذالفقر ان یکون کفراً (۱۶_۱) (۱۶)

"قریب ہے فقر کفر کی طرف لے جائے"

عصر حاضر ملک الموت ہے ترا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش

امت مسلمہ کے سامنے بے روزگاری سنگین چیلنج ہے کتنے ہی لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بے روزگار پھر رہے ہیں۔ ان کو جب کوئی روزگار نہیں ملتا تو پھر تخریب کاری پر اتر آتے ہیں۔ ہر سال ایک یونیورسٹی سے دو تین ہزار نوجوان فارغ ہوتے ہیں۔ اس طرح پورے ملک (۲۷ یونیورسٹیوں) سے تقریباً ۴۰ ہزار سے ۴۵ ہزار تک نوجوان فارغ ہوتے ہیں۔ ان نوجوانوں کے لئے ملک میں کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جو انہیں روزگار مہیا کرے۔ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ ساتھ ان پڑھ اور دیہاتوں کے لوگ بھی بے کار اور بیروزگار ہیں۔ اور جب آدمی فارغ ہو اور اس کی اخلاقی تربیت بھی نہ ہو تو لازمی امر ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی مخرب الاخلاق کام کرے گا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے لئے کچھ تدابیر کیے جائیں۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ اسلامی فلاحی ریاست قائم ہو جہاں لوگوں کو روزگار میسر ہوں اور ان کے مسائل حل ہوں۔

غربت و بے روزگاری جیسے اہم مسائل کا حل آنحضرت کے اسوہ حسنہ کی پیروی میں ہے۔ آپؐ نے ایک فلاحی مملکت کی بنیاد رکھی جس کا مقصد غربت کا خاتمہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے فرائض کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

هوالذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلوا علیهم آیته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة (۱۷)

" وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے بھیجا جو انہیں اس کی آیت سناتا ہے ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

آپؐ نے لوگوں کا تزکیہ کیا ان کے دلوں میں ہمدردی پیدا کی۔ مسلمان کے دل میں اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرنے کا اسلامی تصور دیا۔ مواخات کا نظام رائج کیا۔ اگر کوئی چیز کسی کو اس کی غرض کی وجہ سے دینی پڑ جائے تو اس کو باعزت طریقے سے دینے کے متعلق کہا۔ چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا:

من کان له فضل ظهر فلیعد علی من له ظهرله (۱۸)

"جسکے پاس زائد سواری ہو اسے چاہیے کہ اس شخص کو لوٹا دے جس کے پاس سواری نہیں ہے"

گویا یہ تصور دیا کہ زائد سواری دے کر وہ احسان نہیں کر رہا بلکہ اسکی ہی چیز اس کو واپس کر رہا ہے اسلام نے زکوۃ کو فرض قرار دیا اور اسے ان کے مالوں کا پاک کرنے کا ذریعہ قرار دیا۔ اسی طرح آپؐ نے صدقات کے متعلق فرمایا:

توخذ من اغنیاء هم فترد علی فقراء هم (۱۹)

"صدقات مالداروں سے لئے جاتے ہیں اور ناداروں کو لوٹائے جاتے ہیں"

گویا غنی لوگوں کا مال زکوۃ ادا کر کے پاک ہو جاتا ہے۔

اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ جو شخص اللہ کی رضا کیلئے صدقہ دے اللہ تعالیٰ اس میں کئی گنا اضافہ کر دیتے ہیں فرمایا: "اللہ کے راستے میں خرچ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک دانہ بویا اس میں سے سات خوشے نکلے اور اللہ نے ہر خوشے میں سو دانے پیدا کر دیئے" (۲۰) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "جو لوگ شب و روز خفیہ اور اعلانیہ طور پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کے لئے ان کے رب کے ہاں اجر ہے (۲۱) اور اللہ تعالیٰ نے انہی لوگوں کو متقی قرار دیا ہے جو اللہ کی محبت سے اپنے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں پر خرچ کرتے ہیں اور مشکلات میں پھنسے

ہوئے لوگوں کی گردنیں مشکلات سے آزاد کرانے میں دولت صرف کرتے ہیں (۲۲)

اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلم معاشرہ کے لوگ اپنی افرادی قوت کو کام میں لاکر لوگوں کو روزگار کے نئے مواقع فراہم کریں اور پیداوار کے وسائل بڑھانے کیلئے بھرپور جدوجہد کریں۔ قرآن حکیم کی بہت سی آیات میں اس کی ترغیب موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وجعلنا لکم فیھا معایش (۲۳)

"ہم نے تمہارے لئے اس زمین میں سامان زندگی پیدا کر دیا ہے"

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (۲۴)

"جب جمعہ کی نماز ادا کرلو تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔"

اسلام انفرادی ملکیت کی اجازت کے ساتھ ساتھ دولت مندوں کو اپنی ملکیت پر اترانے سے بھی روکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الاخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ علیک ولا تبغ الفساد فی الارض (۲۵)

"اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو دے رکھا ہے اس میں آخرت کے گھر کی چاہت کر اور دنیا میں جو تیرا حصہ ہے اس کو مت بھول اور جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی احسان کر اور زمین میں فساد کی چاہت نہ کر"

اسلام نے انسان کو امین قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

ان عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملھنا واشفقن منھا وحملھا الانسان (۲۶)

"ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن سب نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھا لیا۔ انسان کو ہر معاملے میں دیانتداری کو سامنے رکھنے کا سبق دیا۔"

سود کسی بھی معاشرے کے لئے ایک ناسور ہے۔ اسلام اس کو قطعی حرام قرار دیتا ہے۔ فرمایا گیا:

فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ (۲۷)

جو سود کی حرمت سے انحراف کرے تو اسے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"سود کے گناہ کے ستر حصے ہیں اور ان کا ہلکا ترین حصہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے" (۲۸)

یہ احکامات اس لئے ہیں کہ یہ لوگ لالچ اور حرص کی وجہ سے لوگوں کو قرض نہ دیں بلکہ خوش دلی سے اللہ کی رضا کے لئے دیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے ہاتھ سے کمائی کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

مااكل احد طعاما قط خيرا من ان ياكل من عمل يده وان نبى الله داؤد كان ياكل من عمل يده" (۲۹)

"کسی شخص نے اس سے اچھا کھانا نہیں کھایا کہ وہ اپنے ہاتھ سے عمل کر کے کھائے اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کے عمل سے کھاتے تھے"۔

آنحضرت ﷺ بے روزگاری اور گداگری کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک انصاری مسلمان کو رسول ﷺ نے سوال کرتے دیکھا تو پوچھا کیا تمہارے گھر میں کوئی چیز ہے اس نے کہا ایک معمولی چادر ہے جسے میں اوڑھتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس سے میں پانی پیتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: دونوں چیزوں کو لے آؤ جب وہ لیکر آیا تو آپؐ نے دو درہم کے بدلے انہیں بیچ دیا اور درہم انصاری کو دیکر فرمایا کہ ایک درہم کا کلہاڑا اور ایک درہم کا کھانا خرید لاؤ۔ جب وہ خرید کر لایا۔ آپؐ نے اسے کہا اس کلہاڑے سے لکڑیاں کاٹو اور انہیں بیچو (۳۰) چنانچہ وہ محنت مزدوری کرنے لگا اور چند دنوں میں خوشحال ہو گیا

اسلام میں محنت اور کوشش کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

ليس للانسان الا ما سعى " (۳۱)

"انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے"

ایک حدیث نبوی ہے :الكاسب حبيب الله (۳۲)

"ہاتھ سے روزی کمانے والے اللہ کا دوست ہے"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:" طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة" (۳۳)

"حلال روزی کمانا عبادات کے بعد ایک اہم فریضہ ہے"

مزید فرمایا:" اطلبوا الرزق فى خبائل الارض" (۳۴)

"زمین کی پہنائیوں میں رزق تلاش کرو"۔

حکومت کا فرض ہے کہ غربت اور بے روزگاری کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گداگری

کا خاتمہ کرے لوگوں کو روزگار مہیا کرے۔ ان کی تربیت اور اسلامی آداب کی تعلیم کا بندوبست کرے۔
امرأ سے صدقات اور ٹیکس لے کر ان لوگوں کو دیا جائے جو غریب اور بے روزگار ہیں۔

ہماری بے کار زرعی اراضی کو کار آمد بنانے کیلئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے سیلاب کے پانی کو ذخیرہ کرے اور اس سے بجلی بنائے۔ جس سے ضائع ہونے والا پانی کار آمد ہو گا۔ بیروزگاری کا خاتمہ ہو گا۔ نیز ملک تباہی سے بچے گا

تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر مندی بھی سکھائی جائے۔ گورنمنٹ صنعتوں کا اضافہ کرے بچوں، بوڑھوں اور بیوہ عورتوں کو سوشل سیکیورٹی دی جائے یہ سب کچھ ایک باقاعدہ پلاننگ کے تحت کیا جائے۔

گورنمنٹ بلاسود قرض ایسے لوگوں کو دے جو دیانت دار ہوں اور کام کرنے کے قابل ہوں۔ اسی طرح اہل غناء حضرات کو ترغیب دی جائے کہ وہ بھی لوگوں کو بلاسود قرض دیں۔ خاص طور پر اپنے غریب عزیز و اقارب کی مدد کریں تاکہ وہ خود اپنا روزگار کما سکیں۔ حکومت کو چاہیے کہ ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہوئے اسلامی لحاظ سے بلاسود قرض کے فوائد لوگوں کو بتائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"من ذا الذي يقرض الله قرضاً حسناً فيضعفه له اضعافاً كثيرةً (۳۵)

"کون ہے جو اللہ کو قرضہ دے بہترین قرض اللہ اس کو بڑھاتا ہے کئی گنا"

بلاسود بنکاری کا سسٹم رائج کیا جائے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

يمحق الله الربا ويربى الصدقات" (۳۶)

"اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے"

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الذين ياكلون الربوا لا يقومون ا لاكما يقوم الذى يتخبطه الشيطان من المس" (۳۷)

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کو ایسے کھڑے ہوں گے جیسے وہ شخص جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس کر دیا ہو"

رسول اکرم ﷺ نے سود خوروں کو معراج کی رات دیکھا۔ ان کے پیٹ اتنے بڑے بڑے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتے تھے" (۳۸)۔

حکومت کے ساتھ افراد بھی کوشش کریں۔ بے روزگار لوگ کام کرنے کی ترغیب کیلئے ہر قسم کی کوشش کریں۔ اس سلسلہ میں چند تجاویز درج ذیل ہیں:

زکوۃ و عشر کے نظام کا نفاذ :

اس وقت پاکستان میں زکوۃ و عشر کا باقاعدہ نظام نافذ ہے۔ تاہم وصولی و تقسیم زکوۃ میں بعض خامیوں بد انتظامیوں اور لوگوں کے ذہنی طور پر اس کو قبول نہ کرنے کے باعث اسکے خاطر خواہ نتائج نہیں نکل سکے۔ لہذا اس بابرکت نظام کو مزید بہتر بنانے کی طرف توجہ دی جائے۔

قرض حسنہ کی سہولت :

قرضوں کو جب تک بلا سود نہیں دیا جائے گا اس کے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلیں گے کیونکہ ملک میں کاروباری صورت حال تسلی بخش نہ ہونے اور عام مندے کے باعث کوئی بھی نیا کاروبار اتنا جلدی سیٹ نہیں ہوتا کہ قرض لینے والا آدمی قسطوں کے ساتھ ساتھ پندرہ سولہ فیصد سود بھی ادا کرے۔ اس لئے بہت سارے بیروزگار اور محنت کر کے کمانے کے خواہش مند نوجوان بھی ان قرضوں کو لینے میں ہچکچاتے ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ ان قرضوں کی مقدار چاہے تھوڑی کر دی جائے مگر سود کے بغیر دیئے جائیں۔

ایثار و قربانی اور انفاق کی ترغیب :

بنی نوع انسان خصوصاً دوسرے مسلمان بھائیوں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھنا' خود بھوکا رہنا اور دوسروں کو کھلانا۔ خود تکلیف اٹھانا اور دوسروں کو راحت پہنچانا۔ اسی طرح اللہ کریم کے عطا کردہ مال و دولت کو ذاتی تعیشات اور فضولیات پر اڑانے یا جوڑ جوڑ کر رکھنے کی بجائے اپنے بھائی بندوں اور معاشرے کے محروم المعیشت اور ضرورتمندوں پر خرچ کرنا کتنی بڑی نیکی اور اخلاقی کمال ہے۔

لہذا مخدوش ملکی معاشی صورت حال کے پیش نظر اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ اہل ثروت اور مخیر حضرات کو بڑے موثر' دل نشین میٹھے اور مخلصانہ انداز میں ایثار و انفاق کی ترغیب دی جائے۔ اس ترغیب کو ریڈیو' ٹی وی' اخبارات ور سائل اور منبر و محراب کے ذریعے ایک منظم تحریک کی شکل دی جائے تو ان شاء اللہ اس کے خاطر خواہ نتائج نکلیں گے۔

حکمرانوں کا سادہ زندگی کو اپنانا :

اسلام عیش کوشی اور تعیش پسندی کی بجائے تمام معاملات زندگی میں سادگی کو پسند کرتا ہے جس کے دنیا میں نقد بے شمار مالی و معاشی فوائد ہیں۔ پھر نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے اسوہ میں سے سادگی کی مثالیں موجود ہیں جبکہ تعیش پسندی اور عیش کوشی میں بے شمار معاشی و اخلاقی نقصانات کے باعث اس کو سخت ناپسند قرار دیا گیا ہے۔

وطن عزیز میں ہر سال حکومتی بجٹ کا ایک کثیر حصہ حکمرانوں وزرأ اور مشیران کی فوج ظفر

موج، ممبران پارلیمنٹ اور افسران بالا کی تعیشات اور غیر ضروری اخراجات کی نذر ہو جاتا ہے : جس کے لئے بجٹ خسارہ کو پورا کرنے کے لئے ہر سال قرضہ اٹھانا پڑتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق صرف ایک صوبائی وزیر یا مشیر کی تنخواہ الاؤنسز، پیٹرول، ٹیلیفون بل وغیرہ پر اٹھنے والے ماہانہ اخراجات ایک لاکھ روپے سے زیادہ پڑتے ہیں۔ اس لئے حکمران سادہ زندگی بسر کریں۔

غیر قانونی جاگیروں کی ضبطی :

اہل پاکستان سے یہ امر مخفی نہیں کہ یہاں کے موجودہ بڑے بڑے جاگیر داروں میں سے اکثر کو مسلم قوم کے ساتھ غداری اور انگریز سرکار کے ساتھ وفاداری کے صلے میں یہ جاگیریں اور لاکھوں ایکڑ زمین الاٹ ہوئی۔ اس کے علاوہ قیام پاکستان کے بعد بھی چونکہ یہی جاگیر دار زیادہ تر حکومت میں رہے اس لئے انہوں نے بندر بانٹ کے ذریعے ہزاروں ایکڑ اراضی ہتھیالی۔ پھر مختلف حکمرانوں نے اپنی بقا اپنے اقتدار کو بچانے، ممبران اسمبلی کو اپنے ساتھ ملائے رکھنے کے لئے سیاسی رشوت کے طور پر جو انہیں بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے قیمتی پلاٹ دیئے یہ ایک علیحدہ رُلا دینے والی افسوسناک داستان ہے۔ ریاست کی ان زمینوں اور پلاٹ ہتھیانے میں کئی پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں اور اس حمام میں حکومت اور اپوزیشن والے سب برہنہ ہیں جس کا ہاتھ بھی پڑا ہے اس نے لوٹنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان غیر قانونی جاگیروں کو بحق سرکار ضبط کیا جائے۔ (۳۹)

جہالت اور ناخواندگی مسلم امت کے سامنے بہت بڑا چیلنج ہے۔ اسلامی ممالک میں جہالت کا Ratio بہت زیادہ ہے۔ مذہب اسلام کی ابتدأ ہی پڑھنے کے حکم سے ہوئی۔ پہلی وحی میں ارشاد فرمایا گیا:

اقرأ باسم ربك الذی خلق (۴۰) "اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا"

اور مزید فرمایا: علم بالقلم (۴۱) "اس نے قلم سے علم سکھا"

اسی طرح یہ ارشاد ہے :

انما یخشی الله من عباده العلمأ (۴۲) "اللہ سے اس کے بندے علمأ ڈرتے ہیں"

اور رسول اللہؐ نے فرمایا:

طلب العلم فریضة علی کل مسلم (۴۳) "علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے"

یہ بھی ارشاد نبوی ہے :

من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل الله حتی یرجع (۴۴)

"جو کوئی علم کی طلب میں نکلا پس وہ اللہ کی راہ میں ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے۔"

اللہ نے اپنے نبی علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

یعلمهم الکتاب والحکمة" (۴۵) "وہ کتاب وحکمت سکھاتے ہیں"

خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انما بعث معلما (۴۶)

رسول اللہ ﷺ نے ابتدأ میں مکہ مکرمہ میں حضرت ارقمؓ کے گھر کو ہی مرکز علم بنایا۔ پھر مسجد نبوی کو ایک یونیورسٹی کا درجہ حاصل تھا جس کے ساتھ ایک ہوسٹل تھا جس کے طالب علم اصحابؓ صفہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آپؐ نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی انتظام کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

جو شخص علم حاصل کرنے کیلئے نکلے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیتے ہیں اور فرشتے اپنے پروں کو طالب علم کی رضامندی کے لئے پھیلا دیتے ہیں۔ اور زمین وآسمان کی تمام چیزیں اس کے لئے دعا کرتی ہیں یہاں تک کہ مچھلیاں بھی سمندر کے پیٹ میں اس کے لئے دعا کرتی ہیں (۴۷)

ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلمان ممالک میں قرآن وحدیث کی رُو سے علم کی اہمیت کو واضح کیا جائے اور بتایا جائے کہ مسلمانوں نے اپنی قدیم تاریخ میں علم کی بنا پر دنیا کی قیادت کی نیز ان میں احساس زیاں پیدا کیا جائے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

حکومت کا کیا کہنا کہ یہ ایک عارضی شے ہے
کہ نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اور بقول ناصرؔ

تجھے کیا بتاؤں ناصر گزری ہوئی کہانی
لوٹا فرنگیوں نے تیرے علم کا خزانہ

☆ صبح سویرے اسمبلی میں طلباء وطالبات کو علم کی اہمیت پر قرآن کی آیات یا احادیث بتائی جائیں۔ مساجد میں روزانہ علم سے متعلق درس ہو۔ مساجد کو روزانہ پڑھانے کیلئے استعمال کیا جائے۔ کسی مسجد کو خالی نہ چھوڑا جائے۔ مسجد کے عالم اور خادم مسجد کی ڈیوٹی لگائی جائے کہ اس کے پاس محلے کے ہر بچے کی پیدائش اور دس سال تک اس کا پورا ریکارڈ موجود ہو اور بعد ازاں بھی اس کا پتہ لگائے کہ بچہ کیا کرتا ہے۔

☆ سکولوں میں دینی تعلیم کو لازمی قرار دینے کے ساتھ ساتھ اسلامی خطوط پر طلباء کو تربیت کا انتظام کیا جائے۔

☆ طلباء کو اس وقت تک ایم۔ اے کی ڈگری نہ دی جائے جب تک وہ ایک مخصوص تعداد میں چوں

کو پڑھنا لکھنا نہ سکھادیں۔

☆ بچیوں کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس سے ایک نسل کی اصلاح ہوتی ہے۔

☆ مخلوط تعلیم سے گریز کیا جائے۔

☆ علم کا مقام قوم کے دل میں بٹھایا جائے اور ساتھ ہی معاشرے میں استاد کو بلند مقام دیا جائے۔ اس کو معاشی فکر سے آزاد کیا جائے۔ ایسے لوگوں کو اس شعبے میں نہ آنے دیا جائے جو صرف روزگار کیلئے اس شعبے کو اپناتے ہیں۔

☆ اساتذہ خلوص، محبت اور محنت سے طلبأ کو پڑھائیں اس کو محض ذریعہ روزگار سمجھ کر نہ پڑھائیں۔ بلکہ ان کا تدریس کا رجحان بنائیں۔

☆ پہلی جماعت کے بچوں کے بستے چھوٹے کرائے جائیں۔ لیکن علم کا شوق پیدا کیا جائے۔

☆ تعلیم بالغاں پر توجہ دی جائے۔

دوہرا نظام تعلیم:

☆ امرأ حضرات کو ترغیب دی جائے کہ وہ سکول مفت چلائیں۔

کتب کی قیمت کم کی جائے۔

☆ غریب لوگوں کو تعلیم مفت دی جائے۔

☆ ذہین طلبأ کو ہر قسم کی سہولت مہیا کی جائے۔

☆ ریڈیو اور ٹیلیویژن پر علم کی فضیلت بیان کی جائے اور استاد کے مقام کو اجاگر کیا جائے۔ اس طرح ہماری علمی ترقی کی تاریخ کو لوگوں کے سامنے ڈراموں اور کہانیوں کی صورت میں پیش کیا جائے اور اس کو پیش کرنے والے خود صحیح مسلمان ہوں۔

اخلاقی بے راہ روی امت مسلمہ کے سامنے بہت بڑا چیلنج ہے نئی نسل دن بدن بہت زیادہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو رہی ہے مغرب کے ذرائع ابلاغ نے ہماری زندگی کے اسلوب کو بری طرح سے متاثر کیا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق الرحمان صدیقی فرماتے ہیں:

مغرب کے مواصلاتی سیاروں کے ذریعے ٹی وی نشریات، ہمارے کھانے پینے کے انداز، زبان، تفریحات، تعمیرات اور فنون لطیفہ غرض ہمارے کلچر کی ہر چیز پر اپنے نقوش مرتب کر رہی ہیں۔ مغرب اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک خاص کلچر کو جینز، ٹی شرٹس، ڈریس سٹائل، ہیئر سٹائل، کاسمیٹکس، پیپسی کولا، کوکا کولا، سیون اپ، فاسٹ فوڈ، کنفیکشنری، ہوٹلنگ، میوزک، ڈسکو، وائلنس اور لاقانونیت کو

فروغ دینے والی موشن پکچرز کے ذریعے اپنے کلچر کو فروغ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہمارے اپنے ملک کے سٹیج ڈراموں، ٹی وی، کمرشل اشتہارات، وڈیو گیمز، فلم، ٹی وی ایوارڈ کی تقریبات، پامسٹری، مخلوط مجالس، مخلوط تعلیم، غرض بیشمار صورتوں میں اسی کلچر کی پیروی کی جارہی ہے۔ بعض مغرب زدہ مسلم لوگ یورپی کارخانوں سے پیک شدہ پانی پیتے ہیں۔ مغرب نے ان کے ذہن میں یہ بات بڑھادی ہے کہ انکے ہاں کا مقامی اور دیسی پانی بھی ان کی صحت کیلئے مضر ہے۔ اسی طرح دیگر عام استعمال کی چیزیں بھی باہر ہی کی پسند کرتے ہیں (۴۸)

جمیلہ نے اپنی کتاب "Islam and Modernism" میں لکھا ہے:

The adoption of western clothing is officially encouranged by every government in Muslim World. Western clothing has become symbolic of "Adcancement " and "Progress" while the indegenous clothing, increasing by confined to the very poor in the rural districts, is cited as synonymous with "backwness" (49)

وہ معاشرے جہاں حیوانی قدریں کارفرما ہوں کبھی بھی مہذب معاشرے نہیں بن سکتے۔ خواہ وہ صنعتی اور دیگر لحاظ سے ترقی یافتہ ہوں۔ سید قطب جدید جاہلی معاشرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے منفی پہلوؤں کو یوں اجاگر کرتے ہیں:

"جدید جاہلی معاشروں میں تو اخلاقی تصور بالکل ہی برباد ہو کر رہا گیا ہے وہ ان تمام قدروں سے خالی ہو چکا ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرنے والی ہیں۔ ان معاشروں میں غیر قانونی جنسی روابط حتی کہ خلاف فطرت جنسی تعلقات قائم کرنا بھی کوئی اخلاقی برائی نہیں ان کے یہاں اخلاقی تصور بس اقتصادی اور سیاسی معاملات کے تنگ دائرے میں محدود ہو کر رہا گیا ہے۔ اور سیاسی معاملات میں بھی اس کی جھلک اسی حد تک ہے جس حد تک مصالح حکومت کا تقاضا ہو (۵۰)

موجودہ دور میں ذرائع لبلاغ نے دنیا کے ممالک کو سکڑ کر بالکل قریب کر دیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا پر مغرب کی اجارہ داری کے باعث اس کے تہذیبی اثرات ملک کے ایوان اقتدار اور کوچہ وبازار سے لے کر افراد کے رویوں تک ہر جگہ مرتب ہو رہے ہیں۔ بلاشبہ مصنوعی قلعہ بندی سہی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس امت کا ایک نظریاتی پس منظر ہے وہ اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے اعصاب کی قوت مزاحمت سے دست کش ہو کر اپنے آپ کو پکے پھل کی طرح ان کی گود میں پھینک دے۔ زندہ معاشرے اپنے تشخص کو معدوم نہیں ہونے دیتے۔

یورپ نے سیکولرائزیشن کے جدید طریقے اپنا کر مسلمان ممالک پر ایک نیا حملہ کیا ہے اور امت مسلمہ اس قدر احساس زیاں سے محروم ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اسی سیلاب میں بہائے چلی جارہی ہے۔ گلی گلی، محلے محلے میں بیوٹی پارلر موسم برسات میں اگنے والی خودرو کھمبیوں کی طرح اگ رہے ہیں ۔ سیکس ایجوکیشن کلچر پر آئے دن مباحثے کرائے جارہے ہیں کہ اسے ملک میں عام کیا جائے۔ عریانی و فحاشی کا کلچر نوجوانوں کو بے راہ اور دین سے دور کرنے کا موثر طریقہ ہے اسی طرح مانع حمل کلچر (خاندانی منصوبہ بندی) کے ذریعے شادی شدہ مسلمانوں کو بے راہ روی پر اکسایا جارہا ہے۔ اسی طرح ایڈز کلچر، کلچرل شو کلچر، نیشنل فیسٹول کلچر، NGO کلچر، ملبوسات کلچر وغیرہ یہ تمام چیزیں اسلامی ثقافت کو گدلا کرنے کے لئے یورپی میڈیا استعمال کررہا ہے اور امت مسلمہ اپنے نفع اور نقصان سمجھنے سے عاری ہو کر نئی صدی کے فحش اور تہذیب کش کلچر کو اپنے اندر فروغ دے رہی ہے۔

عصر جدید میں امت مسلمہ کو جو چیلنجز درپیش ہیں۔ ان میں سے ایک مادیت بھی ہے۔ مادیت پرستی اس دور کا سب سے منظم اور طاقتور فلسفہ ہے اور جو لوگ مادیت پرستی کا شکار ہیں ان میں احساس کمتری بھی پایا جاتا ہے اس بات پر انہیں کچھ فخر بھی نہیں ہے بلکہ ان کو شرمندگی سی محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ دولت، ہوس، حرص اور نفس پرستی کے اسیر ہیں۔

ہم جب بنظرِ عمیق غور و فکر کریں تو ہمیں تعلیمی استیلاء اور فن و ثقافت کے نام پر ناچ، رنگ اور لعو و لعب کا امڈتا ہوا سیلاب نظر آتا ہے۔ کسی بھی اسلامی ملک کا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا اس سے خالی نہیں ہے۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میڈیا صرف اور صرف اس جدید تہذیب اور ناچ گانے کا نام ہی رہ گیا ہے اور سوائے اس کے اس کا کوئی مصرف نہیں کسی نہ کسی طرح حیاباختہ اور حیاسوز مناظر معاشرہ میں عام ہوں اور ہر طرح کا شعور رکھنے والی آنکھ جس طرف بھی دیکھے اسے یہی راگ والاپ کی محفلیں سجی ملیں اور اسے کبھی اپنے ماضی کی طرف جھانکنے کی فرصت نہ ملے اور اپنی تباہی کا سامان اپنے ہاتھوں تیار کرے۔ اپنے تشخص کو کھو دے۔

علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

اے ہستی از ذوق و شوق و سوز و درد
می شناسی عصر ما باما چہ کردن
عصر ما مارا زما بیگانہ کرد
از جمال مصطفیٰ بیگانہ کرد

اخلاقی بے راہ روی صرف ہماری ثقافت اور تعلیمی میدان میں نہیں پائی جاتی بلکہ بقائے باہمی کے

اصول کی دھجیاں یورپ جس قدر مسلمان کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے بکھیر رہا ہے اس کی جھلک ہر طرف نظر آتی ہے۔ نفس پرستی، ظلم، اقرباپروری، رشوت، بدعنوانی اپنے فرائض سے غفلت، خوشامد جیسے ناسور ہمارے جسم میں پیدا ہو گئے ہیں کہ جن کا تریاق ایٹمی توانائی نہیں بلکہ قرآن حکیم اور سنت رسولؐ سے رہنمائی سے ہی ممکن ہے مگر ہمیں اس طرف نظر بھر کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کیونکہ لچر ڈرامے، زرد صحافت اور زرق و برق لباس کی چکاچوند، چمک دمک سے خیرہ آنکھیں بصارت و بصیرت سے محروم ہیں۔ معاشی طور پر ایک دوسرے کا مال کھانا، ڈاکے ڈالنا، مسلمان کی عزت و آبرو کو تاراج کرنا ہماری فطرت ثانیہ بن چکا ہے۔ یہ سبق ہم نے اس جدید میڈیا سے سیکھا ہے جس کے ہم دلدادہ ہیں اور اس پر جدید تعلیم نے تصدیق کی مہر ثبت کردی کہ یہ کارہائے نمایاں دنیا کی معزز اور ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا کرنے کے لئے لابدی ہیں۔

ان تمام چیزوں کا مقابلہ ہم صرف اسلامی تہذیب و تمدن کو اس کی اپنی اصل شکل میں اپنا کر کرسکتے ہیں، ورنہ مغربی تہذیب ہمیں اپنے جال میں پھانس لے گی۔ ہمیں اس دائمی اصول کو پیش نظر رکھنا ہوگا جس قوت نے دور اول میں مسلمانوں کو غالب تہذیبوں کے مقابلے میں سربلند کیا۔ وہی اس امت کو نہ صرف مغربی غلبے سے محفوظ رکھے گی بلکہ دنیا بھر کو متاثر کرے گی۔ یہ قوت قرآن حکیم اور سنت رسول پر عمل ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وانتم الاعلون ان کنتم مومنین (۵۱) "تم ہی غالب ہو اگر تم مومن ہو"

حوالہ جات

۱۔ قرآن مجید، الملک، ۲ ۲۔ البقرۃ، ۳۸ ۳۔ المائدہ، ۳
۴۔ آل عمران، ۸۵ ۵۔ آل عمران، ۸۲ ۶۔ آل عمران، ۱۹
۷۔ البقرۃ، ۱۵۵ ۸۔ الاحزاب، ۲۱ ۹۔ الروم، ۴۱
۱۰۔ المائدہ، ۶۶ ۱۱۔ الاعراف، ۹۴
۱۲۔۱ مسلم، کتاب الایمان، مسند احمد ۵، ۶۶۰، بخاری، الجامع الصحیح ۱، ۵۰۴، ۵۰۸
۱۲۔۲ ابن الجوزی، العلل المتناہیہ، ۲، ۳۰۶
۱۳۔ مقالات سیرت، وزارت مذہبی امور، اسلام آباد، ۱۹۹۵ اور ۵۶
۱۴۔ The States man year book (1992-93), edited by Brian Hunnter, the Macmillan Press London, 1992

۱۵۔ بخاری ، الجامع الصحیح ، کتاب الزکوۃ ، باب لا صدقة الا عن ظهر غنی (اصح المطابع ، کراچی ، طبع ثانی ، ۱۹۶۱) ۱۹۲۔
۱۶۔ علاؤ الدین المتقی الہندی ، کنزل العمال ، ۶ ، ۴۹۲ حدیث نمبر ۱۶۶۸۲
۱۷۔ الجمعہ ، ۲ ۱۸۔ المحلی ابن حزم ، متعلقہ ابواب
۱۹۔ صحیح بخاری ، ۱ ۲۰۲ ۲۰۔ البقرہ ، ۲۶۱
۲۱۔ البقرہ ، ۲۷۴ ۲۲۔ البقرہ ، ۱۷۷
۲۳۔ الاعراف ، ۱۰ ۲۴۔ جمعہ ، ۱۰
۲۵۔ القصص ، ۷۷ ۲۶۔ الاحزاب ، ۷۲ ۲۷۔ البقرہ ، ۲۷۹
۲۸۔ محمد بن عبداللہ الخطیب التمریزی ، مشکوۃ المصابیح (دار الفکر بیروت طبع اولی ۱۹۹۱ ، ۱۴۲ ، حدیث نمبر ۲۸۲۶
۲۹۔ المتقی الہندی ، کنز العمال ، ۴ ، ۸ ، حدیث نمبر ۹۲۲۲ (موسۃ الرسالۃ ، بیروت ، ۱۹۸۰)
۳۰۔ مشکوۃ ۱۶۲ ، کتاب الزکوۃ ، باب من لا تحل لہ المسئلۃ۔
۳۱۔ النجم ، ۳۹ ۳۲۔ کتب حدیث۔
۳۳۔ المتقی الہندی ، کنز العمال ، ۴ ، ۹ ، حدیث نمبر ۹۲۳۱
۳۴۔ المتقی الہندی ، کنز العمال ۴ ، ۲۱ ، حدیث نمبر ۹۳۰۲
۳۵۔ البقرہ ۲۴۵ ۳۶۔ البقرہ ۲۷۶
۳۷۔ البقرہ ۲۷۵
۳۸۔ صفی الرحمان مبارکپوری (مکتبہ السلفیہ لاہور ، ۱۹۹۴ء) الرحیق المختوم ، ۲۴۱۔
۳۹۔ حافظ محمد سعد اللہ ، بنیادی ضروریات زندگی اور اسلام (اقبال پبلشنگ کمپنی لاہور ، ۱۹۹۹) ۳۷۴۔۳۸۵ (خلاصہ)
۴۰۔ العلق ، ۱۔ ۴۱۔ العلق ، ۴ ۴۲۔ الفاطر ، ۲۸
۴۳۔ السیوطی ، الجامع الصغیر (المکتبہ الاسلامیہ سمندری ، ۱۳۹۴ھ) ۴۳
۴۴۔ مشکوۃ المصابیح (عربی) مکتبہ اصح المطابع ، کراچی ، کتاب العلم) ۰۳۴
۴۵۔ البقرہ ، ۱۲۹ ۴۶۔ ابن عبدالبر ، التمہید ، (المکتبہ التجاریہ مکہ مکرمہ) ۵ ، ۱۱۸
۴۷۔ مشکوۃ المصابیح۔
۴۸۔ ڈاکٹر مشتاق احمد صدیقی ، تعلیم و تدریس (پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن ، اسلام آباد ، ۱۹۹۸) ، ۹۴۔۹۵
۴۹۔ Marriyam Jamila, Islam and Moderism, p24, Sant Nagar, Lahore 1986
۵۰۔ سید قطب ، نقوش راہ (مترجم ، عنایت اللہ سبحانی) البدر پبلیکیشنز ، لاہور ، ۱۹۸۱۔
۵۱۔ آل عمران ، ۱۳۹۔

پروفیسر صفدر احمد خان
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

اکیسویں صدی میں عالم اسلام کیلئے کمپیوٹر' انٹرنیٹ اور جدید مواصلاتی ذرائع ابلاغ کا استعمال ناگریز ہے

اسلام دین فطرت ہے۔ فطرت کے تقاضوں میں جستجو کا اہم عنصر شامل ہے۔ جستجو کے اس سفر کی منازل میں وہ منزل بھی شامل ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ کے اس ابتدائی تفکر کی کیفیت قرآن حکیم میں بیان کی گئی جو منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے قبل کی تھی اور ان کے لئے حقیقت تک پہنچنے کا سبب بنی۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

"پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ میرا رب ہے سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ پھر جب چاند کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے سو جب وہ بھی غروب ہو گیا' تو آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو میرا رب ہدایت نہ کرتا رہے تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔ پھر جب آفتاب کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے یہ تو سب سے بڑا ہے' سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا اے قوم بیشک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں' میں اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں" (الانعام ۶: ۷۶-۷۹)

نیوٹن سے متعلق واقعہ درج ہے کہ اس نے سیب کو درخت سے زمین پر گرتا ہوا دیکھا اور ذہنی ارتقا کی منازل طے کرتا ہوا قانون جذب و کشش کے استنباط تک پہنچ گیا۔ جب ذہن کسی تحقیق میں الجھ رہا ہوتا ہے تو اسکے حل کی راہ میں حائل گتھیاں سلجھتی رہتی ہیں اور روشنی کی ایک کرن اس کو اس کے انجام تک پہنچانے میں ممد و معاون ہو جاتی ہے اور اس تحریر کا دائرہ احسن انجام تک ہی محدود ہے کیونکہ ارتقائی منازل میں ٹھہراؤ ایک لایعنی عمل ہے اور اسکا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ منزل تک رسائی ہو گئی بلکہ یہ خامیاں آئندہ منازل کے لئے نشان راہ بن جاتی ہیں۔

کارٹر وی گڈ Carter V.Good اپنی کتاب Essentials of Education Research میں

سائنٹیفک ریسرچ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب انسان کسی شئے کی جستجو میں اپنے سوالات کا جواب تلاش کرنے لگتا ہے۔ تو ریسرچ کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے جب وہ آگے بڑھ کر ان اصولوں کو چیلنج کرتا ہے جن کے ذریعے وہ کسی نتیجے پر پہنچا تھا تو اگر وہ تنقیدی پہلو سے ایک طریقہ کے تحت اپنی Ob-servations کو دھراتا ہے ان کیلئے خاص اوزار Tools تجویز کرتا ہے جس کے ذریعے اسکے مشاہدات کی درجہ بندی اور تشخیص ہوئی ہے اور اپنی اس تحقیق کے نتائج کے سلسلے میں دوسروں کے جواب دینے کیلئے ماخذ دریافت کرلیتا ہے جو اسکی رائے سے اختلاف کرتے ہوں تو وہ مزید محتاط ہو جاتا ہے جب یہ کڑیاں ملتی ہیں تو تحقیق کا عمل مکمل ہوتا ہے۔

اسلام میں علم اور اہل علم کو بڑی فضیلت حاصل ہے علم وہی ہے جو قلم و کتابت سے مدون ہو اور ہر شخص اس سے مستفیض ہونے کا شرف حاصل کر سکے۔ اس پر کسی فرد جماعت یا فرقے کی اجارہ داری نہ ہو اسلامی معاشرے میں مسلمانوں اور حکمرانوں نے علماء اور فضلاء کی جو تعظیم و تکریم کی ہے وہ تاریخ کا زریں باب ہے۔ حضرت ابو امامہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

"اللہ اور اسکے فرشتے اور آسمان و زمین کی مخلوق نیکی سکھانے والے یعنی عالم کیلئے دعا کرتے ہیں"

آپؐ نے فرمایا: "عالم زمین پر اللہ کا نور ہے۔"

ہمارے علماء نے اسلامی معاشرے کو صحیح خطوط پر ڈھالنے اور اسکی ترقی و ترویج کیلئے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

دارالعلوم حقانیہ کی خدمات اور اس کے چانسلر مولانا سمیع الحق صاحب کی زیر نگرانی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مولانا نے اکیسویں صدی کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی تجاویز کی اشاعت کا اہتمام کر کے نہ صرف پوری صدی پر محیط اپنی خدمات کا دائرہ پھیلا دیا ہے بلکہ اس صدی کیلئے نشان منزل رکھے ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد اکرم نے اپنے مضمون "اکیسویں صدی اور عالم اسلام" میں اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر ہم قومی سطح پر اسوۂ حسنہ کی پیروی میں کامیاب ہو گئے تو اکیسویں صدی تو کیا سب صدیاں ان شاء اللہ ہماری ہوں گی۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ دائرہ کار تمام عالم کے گرد پھیلا دیا جائے تا کہ نوخیز مسلم ریاستیں تاجکستان' ازبکستان' قزاقستان' آذربائیجان وغیرہ نہ صرف وسطی ایشا کی مسلم ریاستیں بلکہ دور دراز ریاستوں میں مقیم مسلمانوں کی قلیل تعداد بھی مسلمان علماء کے علمی کارناموں اور خدمات سے مستفیض ہو کر اور صراط مستقیم پر چل کر اپنی دنیا اور آخرت سنوار سکیں۔

دنیا اب ایک عالمی گاؤں Global Village کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ ہر طرف سائنسی ترقی کا ایک ہنگامہ بپا ہے زمینوں اور فضاؤں کو سائنسی دریافت کی بدولت نئے زاویوں سے پرکھا جا رہا ہے دعویٰ

اب یہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ جنین کو مادر شکم میں حسب خواہش متاثر کیا جا سکے گا۔ عالمی رجحانات کی جانچ پڑتال اور قبول یا رد کے پیمانے کا تعین کیا جائے اسکا پھیلاؤ عمل میں لایا جائے اور جو اذھان ان اثرات کو قبول کر رہے ہیں یا انکا ایسا کرنا مستقبل قریب میں متوقع ہے ان کو قبل از وقت ان کے نتائج سے متنبہ کیا جائے اور ان کو وہ ہتھیار مہیا کئے جائیں جنکے ذریعے وہ منفی میلان کا موثر تدارک کرنے کے قابل ہو جائیں۔ موجودہ مواصلاتی رابطوں میں کمپیوٹر' انٹرنیٹ اور دیگر رابطے تیز ترین ترسیل میں طاقتور کردار ادا کر رہے ہیں مختلف ویب سائٹ پر جو سوفٹ وئیر ڈیویلپ کیا جارہا ہے اس پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسی تنظیمیں بھی اپنا کردار ادا کر رہی ہیں جن کے بارے میں گمان ہے کہ ان کی سرپرستی یہودی ذہن کر رہا ہے ان کی تحریریں بظاہر معلومات کا خزینہ معلوم ہوتی ہیں مگر اپنے اندر ان کے عزائم کے میلان کا زہر پھیلا ہوا ہوتا ہے اور صرف علماء ہی انکا جواب موثر انداز میں دے کر اسلامی معاشرے پر ہونے والے ان حملوں کا تدارک کرنے میں عام مسلمانوں کی مدد کر سکتے ہیں۔

اکیسویں صدی اپنے علماء سے اس بات کی بھی متقاضی ہے کہ مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی بستا ہو اس کو علماء کی خدمات سے استفادہ حاصل کرنے میں پوری مدد حاصل ہو۔ امریکن ایسو سی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف سائنس American Association for the Advancement of Science نے 1985ء میں ایک منصوبہ بنایا تھا جسے پروجیکٹ 2061 کا نام دیا گیا۔ یہ 75 سالہ منصوبہ دمدار ستارے Halley Comet کے نمودار ہونے پر بنایا گیا اور اس کی متوقع نموداری (جو 2061ء میں ہے) تک کی سائنسی ترقی اور اسوقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے مناسب تیاری پر مشتمل ہے۔

ہمیں بھی ایک پچیس سالہ (۲۵) منصوبہ بنانا ہوگا جو اسلامی تعلیمات کی جدید خطوط پر نشر واشاعت فقہی مسائل جیسے اہم موضوعات قرآنی تعلیمات' اسوۂ حسنہ سے روشناسی ان پر علم' اصول دین' ٹیکنالوجی سے تعلق روزمرہ کے مضامین' تمام عالم اسلام سے تعلق و رابطہ جیسے اہم عنوانات شامل ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اگر اس منصوبے کا دائرہ کار انسانی مسائل اور فکری موضوعات پر غور تک پھیلا دیا جائے جن میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے تو ایک طرف اسلام کے اصولوں کی ترویج کا موقعہ ملے گا اور دوسری جانب انسانیت کو مادی' فکری' روحانی اور مابعد الطبیعاتی مسائل کا حل ملے گا اس طرح اسلامی تحقیق سے اسلامی قدروں کے پھیلاؤ کا موقعہ ملے گا اور تبلیغ اسلام کے علم کی آب یاری ہو سکے گی۔ انشاء اللہ العزیز

مولانا محمد ابراہیم فانی
مدرس جامعہ دارالعلوم حقانیہ

اکیسویں صدی کا آغاز اور عالم اسلام کی زبوں حالی

اکیسویں صدی کی آمد کے ساتھ ہی مختلف اقوام وملل نے استقبال کی تیاریاں شروع کیں اور اپنے اپنے انداز سے اس نئی صدی میں داخل ہونے کی تدبیریں سوجھی گئیں۔ وہ قومیں جنہوں نے کسی بھی میدان میں ترقی کی اور زندگی کے کسی بھی شعبہ میں اپنی برتری کا لوہا منوایا وہ بجا طور پر فخریہ انداز سے اس نئی ہزاری میں پر عزم طریقے سے داخل ہونے کے اہل ہیں۔ مثال کے طور پر یورپی ممالک یا بعض دیگر ایشیائی ممالک جنہوں نے سائنس وٹیکنالوجی کے شعبہ میں محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے یا اقتصادی ومعاشی لحاظ سے مستحکم ہیں اور کسی بھی بین الاقوامی مالیاتی ادارے کے دست نگر نہیں۔ یا دفاعی اعتبار سے بظاہر ناقابل تسخیر ہیں۔ یا علمی میدان میں ان کی شرح خواندگی سو فیصد ہے تو ایسی قومیں اگر سینہ تان کر اکیسویں صدی کا استقبال کریں تو یہ ان کا حق بنتا ہے، چاہے وہ جس مذہب سے وابستہ ہوں یا جس رنگ ونسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ مگر اسکے برعکس جب ہم عالم اسلام اور ہر قسم کے وسائل سے مالا مال اسلامی ممالک پر نظر دوڑائیں اور انکے حالات کا ایک سرسری سا جائزہ لیں تو ہمیں سوائے مایوسی کے اور کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا اور نہ مستقبل قریب میں امید کی کوئی ایسی کرن نظر آتی ہے جسکے سہارے ہم زندگی کے چند لمحات اس موہوم سرور پر گزار سکیں۔ اور جس اندرونی کرب والم کی کیفیت سے ہم دوچار ہیں کچھ دیر کیلئے اس مزعومہ خوشی کے ذریعے دل کو سکون حاصل ہو جائے مگر اے کاش! ؎

کس طرف جاؤں کدھر دیکھوں کسے آواز دوں　　اے ہجوم نامرادی جی بہت گھبرائے ہے

اور اب تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اکیسویں صدی میں عالم اسلام کی حالت من حیث المجموع بیسویں صدی سے بھی بدتر ہو گی اور ہزارہا تازیانہ ہائے عبرت کھانے کے باوجود بھی ہم پر وہی مدہوشی اور بے حسی کی کیفیت طاری ہے اور ہم نے حالات اور گردوپیش کے واقعات سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ گویا عالم اسلام اب اس مردِ بیمار جیسا ہے جو اپنی زندگی سے مایوس ہو کر طبیب اور دوا سے بے نیاز ہو جائے۔ اور ملک الموت کے انتظار میں اپنی حیات مستعار کی گھڑیاں گن رہا ہو۔ چاہیے تو یہ تھا کہ عالم اسلام کے حکمران اصحاب دانش ارباب اقتدار واختیار اور دوسرے سنجیدہ حضرات اس صورت حال پر غور وخوض

کرتے اور اس بدترین حالت سے نکلنے کی کوئی تدبیر سوچتے۔ موثر مضبوط اور ٹھوس حکمت عملی اختیار کرتے اور اپنی اس پریشان نظری اور زبوں حالی کا ہر طرف اور ہر طرح سے جائزہ لیتے اس کے عوامل اور اسباب تلاش کرتے کہ ہماری پستی کے بنیادی عوامل کیا ہیں یہ عوامل کیونکر پیدا ہوئے۔ اور ان کے تدارک وانسداد کا کیا طریقہ ہوگا اسی طرح دوسرے ترقی یافتہ ممالک سے بھی اپنا موازنہ کرتے کہ یہ ملک مثلاً ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوا ہے اس نے زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کی ہے اور آج یہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے صف اول میں کھڑا ہے۔ انہوں نے آخر کون سا فارمولا استعمال کیا تاکہ ہم بھی اس قسم کی تدابیر اختیار کر کے اپنے ملک اور قوم کو شاہراہ ترقی پر گامزن کر سکیں۔

آج تمام عالم اسلام پر جو سکوت مرگ طاری ہے اور ہر طرف سے مصائب و آلام اور باوجود وافر وسائل حیات کے گوناگوں مسائل کا شکار ہے اس کی وجہ مذہب سے بیزاری دین سے دوری اور اپنے ماضی سے غفلت کے ساتھ ساتھ غلامانہ ذہنیت کی عکاسی ہے آج تمام دنیا میں مسلمان مظلوم ہے خواہ وہ فلسطین میں ہوں کشمیر یا بوسینا اور مقدونیہ یا چیچنیا میں ہوں قبلہ اول پنجہ یہود میں ہے اور سرزمین انبیاء فلسطین پر اسرائیلیوں کے ہاتھوں ظلم کے نئے نئے دلخراش اور جگر پاش تجربات ہو رہے ہیں لیکن کسی بھی طرف سے اس بربریت کے خلاف کوئی حوصلہ افزاء اور کوئی خوش کن خبر سننے میں نہیں آرہی۔ امریکہ اتحادی ملکوں اور اقوام متحدہ کے ہاتھوں عراق کا حشر تمام دنیا نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اب تک ۲۵ لاکھ سے زائد بچے' مرد' بوڑھے اور جوان ہلاک ہو چکے ہیں اور جو مالی نقصان ہوا ہے وہ تو حساب سے باہر ہے۔ کشمیر کا مسئلہ ۵۴ سال سے معرض التواء میں پڑا ہے بوسنیا میں لاکھوں مسلمان شہید کر دیئے گئے کہ اور عین یورپ کے قلب میں چنگیزیت کا احیاء کیا گیا لیکن مہذب دنیا نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا روس نے چیچنیا میں جو مظالم ڈھائے اس کے سامنے ہلاکو خان کی بربریت ماند پڑ گئی۔ افغانستان میں دو ملین سے زیادہ لوگ سوویت یونین کی توسیع پسندی کی بھینٹ چڑھ گئے' سوویت یونین اگرچہ اب نقشہ عالم پر نہیں رہا اور وہ اس خریطہ سے حرف غلط کی طرح مٹ چکا ہے مگر اس نے جو کچھ بویا تھا اس کا خمیازہ ابھی تک افغان عوام بھگت رہے ہیں اور اب وہاں شمالی اتحاد کی صورت میں درندگی کا کھیل کھیلا جارہا ہے بہر حال یہ ایک طویل داستان دلخراش ہے۔ جس سے مایوسی ناامیدی اور قنوطیت مزید بڑھ جاتی ہے

ع کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں

مگر عالم اسلام کے نااہل حکمران امریکہ اور دوسرے ممالک کے اشاروں پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچ رہے ہیں نہ انہیں اپنی خبر نہ قوم وملک کا پتہ' وہ تو بس صرف یہ چاہتے ہیں کہ انکی کرسی مضبوط اور محفوظ ہو چاہے ملک جائے چاہے قوم تباہ حال ہو۔ عالم اسلام بالخصوص دنیائے عرب جو کہ وسائل اور

معدنیات کے لحاظ سے دنیا کا ایک ایسا خطہ ہے جس کی طرف تمام دنیا کی نگاہیں مرکوز ہیں لیکن اس کے تمام وسائل پر امریکہ اور اسکی اتحادی قومیں قابض ہیں اور اسقدر بے دست و پا ہیں کہ بیچارے ظالم یہودیوں کیخلاف قرار داد مذمت پاس کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ انکے ساتھ جہاد کرنا اور لڑنا یہ تو ایک خیال خام ہے اگر یہودی سپاہ اور اتحادی فوج آج ہی چاہیں تو تمام خطہ عرب اپنے قبضہ میں لے سکتے ہیں خدا ایسا نہ کرے اور اللہ ہمیں یہ روز بد نہ دکھائے مگر زمینی حقائق اس طرف بہانگ دہل آوازیں دے رہی ہیں۔ اگر یہ وسائل قدرتی معدنیات اور افرادی قوت کسی اور ملک کے پاس ہوتی تو خدا جانے وہ اس سے کیا کیا فوائد حاصل کرتا مگر شومئی قسمت دیکھئے کہ ان تمام نعمتوں کے باوصف ہماری زبوں حالی قابل رحم ہے۔

ہمارا ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان جو کہ لا الہ الا اللہ کے نام پر معرض وجود میں آیا تھا۔ تقسیم سے قبل جب مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت بنانے کی تحریک چلی جسے تاریخ میں تحریک پاکستان کے نام سے یاد کی جارہی ہے تو اس وقت مسلمانوں کے سامنے ایک منزل متعین تھی کہ دنیا کے نقشے پر ایک ایسا خطہ ابھرے گا جس میں اسلامی نظام اور قرآنی قانون کا نفاذ ہوگا اسی لئے مسلمانانِ برصغیر دیوانہ وار میدان میں کود پڑے اور جانوں کے نذرانے دے کر یہ ملک حاصل کیا، مگر رفتہ رفتہ وہ عظیم مقصد، جس کے لئے اتنی بڑی جدوجہد کی گئی وہ پس منظر میں چلا گیا اور آج حالت یہ ہے کہ وہ منزل بھی آہستہ آہستہ نظروں سے او جھل ہورہی ہے اور نئی نسل کو یہ معلوم تک نہیں کس مقصد کیلئے تقسیم برصغیر عمل میں آئی تھی۔ اسی منزل سے غفلت کی وجہ سے ملک دولخت ہوگیا اور اب بھی اس کے استحکام کے بجائے اسے کمزور کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں۔ البتہ پاکستان کے حوالے سے یہ بات خوش آئند ہے کہ یہ عالم اسلام کا پہلا ملک ہے جو کہ ایٹمی قوت ہے لیکن اس کی یہ قوت ہونا تمام عالم کفر کی آنکھوں کا کانٹا ہے اور پاکستان سے اسکی چھیننے کی سر توڑ کوششیں ہورہی ہیں لیکن پاکستان کے غیور عوام اس عظیم نعمت کے خود محافظ ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے پیٹ پر پتھر رکھ کر پاکستان کو اس مقام پر پہنچایا۔ یوں وہ عالم اسلام کا پہلا ایٹمی ملک بنا مگر افسوس کہ پاکستان کے ارباب اقتدار بھی ایسی سوچ سے عاری نکلے۔ جس میں قوم کی بھلائی ہو ملک کی ترقی اور عوام کی خوشحالی ہو مگر اب حالت یہ ہے کہ ان ناعاقبت اندیش حکمرانوں کی غلط اقتصادی پالیسیوں اور شہ خرچیوں کی وجہ سے ملک کا چپہ چپہ مقروض ہے۔

گو کہ تمام عالم اسلام میں احیائے اسلام کی تحریکیں کام کررہی ہیں لیکن ان کے مقابلے میں جو حکمران طبقہ ہے وہ ان تحریکات کو کچلنے کی بھرپور اور سر توڑ کوششیں کررہا ہے جس کے لئے مثال دینے کی ضرورت نہیں یہ تو عالم اسلام کی بے سامانی کا ایک نہایت ہی مجمل نقشہ ہے ہمارے پاس کوئی بھی ایسی معقول دلیل اور محکم ثبوت نہیں جس کو بنیاد بنا کر ہم یہ دعوی کرسکیں کہ ہم اپنے اس کارنامے کے ساتھ

اکیسویں صدی کا استقبال کریں گے کیونکہ عالم اسلام نہ اقتصادی اور معاشی لحاظ سے قابل رشک ہے نہ دفاعی اعتبار سے مضبوط اور نہ سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں اس کی جھولی میں کوئی قابل ذکر شئی موجود ہے لہٰذا اکیسویں صدی اور نئی ہزاری میں داخل ہونے کیلئے ابھی عالم اسلام کو بہت کچھ کرنا ہوگا ورنہ اگر یہی حالت رہی تو پھر ہماری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ تمام عالم اسلام متحد و یک جان ہو کر اپنے اندر جو دشمنان دین و ملت اور غداران قوم و ملک ہیں ان کا صفایا کریں۔ اپنی اصلاح کیساتھ ساتھ ایسے قوانین (جو کہ اسلامی نظام کے سوا اور نہیں ہو سکتے) وضع کریں جس سے عوام کی اصلاح ممکن ہو اور ان میں جذبہ حریت اور دین و ملک سے محبت کا داعیہ پیدا ہو سکے جہاں تک ممکن ہو کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے اپنے ہی وسائل بروئے کار لائیں اور حتیٰ الامکان بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے مقروض نہ بنیں۔ اپنے اپنے ملکوں کے درمیان ایک مربوط نظام ہو جس کے باعث بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کر سکیں اقوام متحدہ اور دیگر یہود نواز اور امریکہ پرست بین الاقوامی تنظیموں کے بجائے ان کی الگ ایک موثر انجمن ہو جس کی وساطت سے عالم اسلام اپنے مسائل خود حل کرے ایک مشترکہ فوج ایک مشترکہ کرنسی اور مشترکہ مالیاتی ادارے ہوں تاکہ تمام مسلمان جسد واحد کا ایک عملی نقشہ پیش کر سکیں۔ آپس کے اختلافات باہمی افہام و تفہیم سے طے کریں اسکے بعد انشاء اللہ جو نتیجہ نکلے گا وہ یقیناً بہت حوصلہ افزا ہوگا اور یہ طاغوتی طاقتیں خود بخود نابود ہوں گی اور عالم اسلام جب تک اپنے دین و مذہب تہذیب و تمدن اور اپنے کلچر و ثقافت سے وابستہ رہے گا اتنی ہی اس میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور اس سے مرعوبیت کا واہمہ ختم ہو جائے گا کیونکہ ہمارے اسلام اور ہمارے دین اور شریعت مقدسہ میں وہ سب کچھ موجود ہیں جس پر انسان کی کامیابی و فلاح کا دارومدار ہو۔ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

الغرض اگر ایمانی قوت سے سرشار ہو کر مسلمان میدان عمل میں اتریں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ خدائی وعدہ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین ظہور پذیر نہ ہو اور ہماری وہ عظمت رفتہ اور پرشکوہ ماضی جس پر ہم بجا طور سے فخر و ناز کرتے ہیں واپس نہ لوٹے۔ کیونکہ ہمارا خدا بھی وہی، رسول بھی وہی، قرآن بھی وہی اور دین بھی وہی۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم مسلمان ہی تمام اقوام عالم میں ذلیل اور رسوا ہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم قرون اولیٰ والے مسلمان نہیں رہے اگر اللہ پر ایمان کامل رسول کی اطاعت اور اپنے اندر خود اعتمادی اور جذبہ عمل کار فرما ہو جائے تو وہی فضائے بدر پیدا ہوگی جس کے متعلق علامہ نے فرمایا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

تحریر: شاہ نواز خان
ترجمہ و تلخیص: معید اشرف ندوی

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا

آنے والی صدی کے نام آخری پیغام

رائے بریلی کے علاوہ مولانا علی میاں کو لکھنئو سے خاصا لگاؤ تھا اسی شہر میں پلے بڑھے اور پڑھے تھے اس شہر کی لگا تار بجوتی ہوئی تصویر انہیں ہمیشہ پریشان کیے رہتی تھی اپنی اس پریشانی کا خلاصہ انہوں نے اس دنیا کو الوداع کہنے سے پہلے "روزنامہ ہندوستان لکھنئو" کے ساتھ ایک خاص گفتگو میں بیان کیا تھا' اس جاتی ہوئی صدی کے بارے میں مولانا کے خیالات جاننے کیلئے "ہندوستان" کے نمائندہ سے بدھ کی صبح (۲۰ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ) ندوے میں مختصر بات چیت میں مولانا نے فرمایا:

"لکھنئو میرا وطن ثانی ہے لوگ بدل گئے لیکن یہ نہیں بدل سکا میں نے اسکو بچپن سے دیکھا ہے اس سے پہلے کہ میری روح جسم سے نکل جائے میں اس کشادہ شہر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ ملک الموت کو کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ میرے بچپن میں یہ آبادی کے لحاظ سے بالکل فٹ تھا، جتنی شہر کی وسعت تھی اتنی ہی آبادی تھی"

انہوں نے لکھنئو اور اسکے بدلتے ہوئے مزاج پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جب لوگ اس شہر کو چھوڑ کر اپنے وطن واپس جاتے تھے تو اس کو یاد کرتے اور تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ چونکہ یہ شہر صوبائی حکومت کا مرکز رہا ہے اس لئے یہاں پر ہر طرح کے لوگ آتے ہیں اس پرانے وقت میں صوبائی حکومت بھی شہر کو سنہرا رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

یہاں کی تہذیب کی شہرت دور دور تک تھی میں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ اس شہر میں بسر کیا ہے مجھے لکھنئو بہت پسند ہے' کسی شہر کی پہچان اس کی تہذیب سے ہوا کرتی ہے لکھنئو اپنی پہچان بنا چکا ہے اس پہچان کو اب برقرار رکھنا ہوگا۔

مولانا علی میاں کا کہنا تھا کہ اس شہر کی تہذیب کو بنائے رکھنے کیلئے حکومت کو نہیں بلکہ عوام کو بھی اس کام میں مدد کرنی ہوگی اس شہر کے لوگوں کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ:

"آنے والی صدی میں اس صدی کی گذری ہوئی باتوں کو دہرایا نہ جائے اس سے اختلاف بڑھتا

ہے ہمارا فرض لڑوانا نہیں بلکہ لڑتے ہوؤں کو روکنا ہے شہر بھلے ہی اب سنہرا نہ رہا ہو لیکن اس کے مستقبل کو سنہرا بنانا ہو گا۔ کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اچھی تہذیب بھی گم ہو جائے۔ اس صدی کے اختلافات اگلی صدی میں نہ دہرائے جائیں یہی میری گزارش ہے حکومت کے سربراہوں کو بھی اپنے عوام کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ عوام ان کے قریب آئیں لوگوں کو ایسا رخ اختیار کرنا چاہیے جس سے یہ نہ لگے کہ ہم نے اپنی تہذیب کھودی ہے انسان کے عمل ہی سے اس کی پہچان ہوتی ہے میں نے دیکھا ہے کہ اب انسان کا علم بدلتا جارہا ہے۔ لوگوں میں عمل کو لے کر خیالات بدلتے جارہے ہیں یہ آخری نصیحت ہے کہ صدی بدل جائے لیکن عمل نہیں بدلنا چاہیے۔ (روزنامہ ہندوستان۔ لکھنئو یکم جنوری ۲۰۰۰ء)

جناب عبدالماجد
اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج ، مانسہرہ

اکیسویں صدی کیلئے اسلام خطرہ ہے یا مغربی جمہوری نظام ؟

عالمی سطح پر سرد جنگ کے خاتمے اور امریکہ کا دنیا کی واحد سپریم پاور بننے کے بعد اس کے مفکرین نے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اب دنیا کیلئے صرف مغربی لادینی جمہوری نظام (Wester Secutar Capitalistic Democratic System) ہی بہترین نظام ہے اسے فرانس فوکایاما نے The End of History (تاریخ کا اختتام) کا نام دیا ہے۔ لیکن جب دوسری طرف انہوں نے دیکھا کہ اسلام امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں تیزی سے پھیل رہا ہے اور اسلامی ممالک میں نفاذ اسلام کی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں تب انہیں اسلام سے خطرہ محسوس ہوا اور مغربی دانشوروں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا کہ مغربی تہذیب کو سوشلزم وغیرہ سے تو خطرہ نہیں رہا لیکن ایک تہذیب ایسی ہے جو مستقبل میں اس کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے اور وہ ہے اسلامی تہذیب اس خیال کو سیموئیل پی ہنٹنگٹن (Samoel P. Hun-tinghten) نے Clash of Civilizations (تہذیبوں کے ٹکراؤ) کا نام دیا ہے۔ یہ مقالہ ہنٹنگٹن (جو کہ ایک امریکی سیاسی مبصر اور مشیر ہے) نے ۱۹۹۳ء میں لکھا۔ اس کے نزدیک اب دنیا میں قوموں اور ملکوں کا نہیں بلکہ تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوگا اس نے لکھا ہے کہ اس وقت دنیا میں آٹھ تہذیبیں موجود ہیں ایک ہماری مغربی تہذیب اور سات دوسری تہذیبیں۔ ان میں سے پانچ کو تو ہم آسانی سے اپنے اندر سمو سکتے ہیں لیکن دو تہذیبیں ایسی ہیں کہ وہ ہمارے لئے لوہے کے چنے ثابت ہوں گی ایک مسلم تہذیب اور دوسری کنفیوشس تہذیب جس کی نمائندگی اس وقت چین کر رہا ہے۔ لہذا اس نے مغرب کو دو مشورے دیئے جن پر عمل پیرا ہو کر ان دونوں تہذیبوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے ایک یہ کہ چین کو اسلامی ممالک کے قریب نہ آنے دیا جائے دوسرا مشورہ اس نے یہ دیا کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو ہوا دی جائے۔(1)

اسی طرح کے خطرہ کا اظہار دیگر کئی مغربی دانشوروں نے کیا ہے پیٹرک بوشانن (Petric Bu-chanon) نے کہا

"For a millenium, the struggle for mankind's desting was between chris-

tianity and Islam, in the 21st century it may be so again"- (2)

یہی صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"The Muslim threat is global is nature as muslims in Europe, Soviet Union and America proliferate and prosper." (3)

حالانکہ اسلام یا اسلامی تہذیب ان کے لئے خطرہ نہیں بلکہ ان کا اپنا دیا ہوا غلط استحصالی نظام مستقبل کے لئے خطرہ ہے جس کی وجہ سے اس وقت بھی پوری دنیا معاشی بد حالی اور اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہے جو کہ لازمی طور پر بد امنی اور فساد فی الارض کا باعث ہے جس کی وجوہات درج ذیل ہیں :

۱۔ مغربی سرمایہ دارانہ استحصالی نظام کی بدولت اس وقت دنیا میں ایک ارب تیس کروڑ افراد ایسے ہیں جن کو روزانہ ایک ڈالر سے کم میں گزارا کرنا پڑتا ہے اور روزانہ پینتیس ہزار افراد غذا کی کمی اور ناقابل علاج بیماریوں کے ہاتھوں دم توڑ دیتے ہیں۔ (4)

اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت بیس فی صد امیر ترین افراد دنیا کی اسی فیصد دولت، تجارت، سرمایہ کاری اور بچتوں پر قابض ہیں اور باقی بیس فی صد افراد صرف ڈیڑھ فی صد تجارت، سرمایہ اور بچتوں کے حامل ہیں (5)

۲۔ مغرب نے دنیا کے تمام ممالک بشمول اسلامی ممالک میں بے جا مداخلت کر کے انکے معاشی اور معدنی وسائل پر قبضہ کیا ہوا ہے اور عالمی اقتصادی پالیسیوں کو آئی ایم ایف (I.M.F) ورلڈ بینک اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (W.T.O) کے ذریعے اپنے کنٹرول میں لے لیا ہے اور عرب ممالک کے تیل اور دولت پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے

۳۔ کویت اور سعودی عرب کی حفاظت کے نام پر امریکہ اور دیگر ممالک نے اپنے ہزاروں فوجیوں کو عرب کی سرزمین پر رہنے کا جواز فراہم کیا۔ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کا ناسور پیدا کر کے مسلمانوں کیلئے ایک مستقل خطرہ کھڑا کر دیا۔ اور پھر اپنے دوہرے معیار کے تحت اسرائیل وغیرہ کیلئے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور اقوام متحدہ کی قراردوں کے علی الرغم مراعات جاری رکھیں جبکہ اسلامی ممالک میں انسانی حقوق کے نام پر مداخلت کی اور ظالمانہ پابندیاں لگا کر اپنے خلاف نفرت اور غصے کے جذبات پیدا کئے

امریکہ کے عراق اور افغانستان پر حملوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اپنے خلاف رائے عامہ کو مزید ہموار کیا۔

۴۔ مغربی میڈیا اور اس کے دانشوروں نے مسلمانوں کو اشتعال انگیز ناموں (جیسے بنیاد پرست Fundamentalist، دہشت گرد Terrorist، جنونی Fanatic، انتہا پسند Extremist وغیرہ) سے یاد کر کے اپنے خلاف مسلمانوں کے غصے کی لہر میں مزید اضافہ کیا۔ (6)

۵۔ اسی طرح امریکی کانگریس نے مسلمانوں کے "مذہبی مواخذے سے آزادی" کے نام پر ایک بل منظور کر کے امریکی صدر کو دیگر ممالک میں بے جا مداخلت کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً ۷۷ ممالک میں مذہبی آزادی کی نگرانی اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے نام پر مداخلت شروع کر دی(7) جبکہ خود امریکہ میں انسانی حقوق کا حال تمام دنیا سے بدتر ہے اور جرائم کی شرح تمام ممالک سے زیادہ ہے۔(8)

ان تمام بے انصافیوں اور غلط پالیسوں کی وجہ سے اگر غریب اقوام اور مسلمانوں کے اندر مغرب کے خلاف غصے اور نفرت کے جذبات پیدا ہوں اور وہ عدم برداشت کا شکار ہو کر چند انتہائی اقدامات کے مرتکب ہوں تو ذمہ دار مغرب کا استحصالی نظام ہے نہ کہ غریب اقوام اور مسلمان۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مقالہ نگار یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ تہذیبی کشمکش اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے نہیں بلکہ دنیا کے وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کا نتیجہ ہے۔

Clash of civilization is not so much over Jesus Christ, Confucious or Prophet Muhammad as it is over the unequal distribution of World power, wealth and influence (9)

چنانچہ یہ اسوقت کی سب سے اہم پکار ہے کہ عالمی وسائل، خزانہ اور دولت منصفانہ طور پر تقسیم ہوں تاکہ پوری دنیا میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو اگر یہ تقسیم پرامن طریقے سے نہ ہوئی تو پھر ایک بہت بڑے تصادم کے بعد ہو گی جیسا کہ Global Sharing of Power کا مقالہ نگار رقم طراز ہے:

The Challenge of our time is whether a redistribution of power, which is a sine qua non (essential conditions) of a stable world order can be based on some over riding principles and brought through peaceful means. If not,it will take places through a series of social, economic convulsions and politics- military conflicts. (10)

ان عالمی وسائل کی منصفانہ تقسیم اور عالمی امن کے قیام کے لئے آسمانی ہدایت سے محروم مغربی جمہوری نظام یا کوئی دوسرا نظام کارگر ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ تمام دنیا ان نظاموں کو آزما چکی ہے اور نیو ورلڈ آرڈر کے نتائج بھی دنیا کے سامنے ہیں۔ اب اکیسویں صدی میں انسانیت کی option کے لئے مزید کوئی نظام باقی نہیں رہا سوائے ایک نظام کے اور وہ ہے رحمۃ للعالمین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا امن وسلامتی والا دین اسلام، جس کے بارے میں دنیا کے تمام دانشوروں اور انسانیت کے بہی خواہوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے: "ایسے وقت میں جبکہ اسلحہ کی قوت یا اقتصادی غلبہ کے نفرت انگیز دباؤ نسل انسانی اپنی پیاری آزادیاں گنواتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اسلام ہی مستقبل میں انسانیت کی آزادی کے قلعے کا آخری پشتہ ہے اور عالمی سیاست کی تنظیم نو کے لئے حقیقی طور پر بڑا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔(11)

دراصل مسلمان ہی ایسی قوم کے افراد ہیں جن کے پاس عالمی برادری کو دینے کیلئے ایک واضح اور مثبت شے ہے"(12)

اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان اپنی صفوں کے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کر کے اپنے فرض منصبی کو پورا کرتے ہوئے دلائل و براہین سے تمام دنیا کے انسانوں کو اسلام کی طرف دعوت دیں اور اسلام کے حوالے سے مغرب کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کا رد پیش کریں۔ مواصلاتی انقلاب اور دیگر جدید سہولتوں نے تمام دینا کو ایک بستی (Global Village) کی شکل دے کر دعوت کے اس کام کو مزید آسان بنادیا ہے اس لئے ان جدید سہولتوں کو اسلام کی دعوت کے لئے استعمال کرتے ہوئے حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ تمام انسانوں کو "دارالسلامہ" کی طرف بلائیں اور اسلام کو عملی طور پر انکے سامنے پیش کریں اور بقول قائداعظم محمد علی جناح:

"ہمیں دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیے جو انسانی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔ اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچالے گا اور نوع انسانی کی بہبود اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا"(13)

حوالہ جات

1- مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون "عدم برداشت کا رجحان اور تعلیمات نبوی" ماہنامہ "حکمت قرآن" لاہور جون ۲۰۰۰ء

2- Esposito, john, L, The Islamic Threat, Myth or Reality, Oxford University Press, N.York Oxford-1992 -p-175

3- Ibid 4- ماہنامہ "العصر" (پشاور جولائی اگست ۱۹۹۸ء) نے ایمنسٹی انٹرنیشنل کے حوالے سے یہ رپورٹ دی ہے

5- Human Development Report, 94 in Press Review, Feb 96-Vol III P-51

6- Walke, Alan, Address in "Islam and teh Challnges of the Contemporary World" by Prof. Saeed ullah Qazi- Sheikh Zaid Islamic Centre, university of Peshawar - 95 P.191

7- ملاحظہ ہو سہ ماہی "الشریعہ" گوجرانوالہ اکتوبر ۹۸ء

8- روزنامہ مشرق پشاور ۱۶ مارچ ۱۹۹۹ء مضمون "امریکہ میں انسانی حقوق کی حالت زار" مشرق سروس اور روزنامہ نوائے وقت ۲۲ مارچ ۹۹ء میں محمد آصف شیخ کا مضمون "حقوق انسانی کا تحفظ اور امریکہ"

9- Satish Kumar "Global sharing of Power in Press Review-Defence and Media Publication, Rawalpinid- Feb 96- P52

10- (بحوالہ بالا ص ۵۰) 11- Opcit- P-50 رحمان مذنب "تہذیب و تمدن اور اسلام" ۹۳ء ص ۳۹۱

12- رحمان مذنب "تہذیب و تمدن اور اسلام" ص ۳۹۰

13- سٹیٹ بینک کی افتتاحی تقریب سے خطاب جولائی ۱۹۴۸ء ماخوذ از ماہنامہ "تعمیر انسانیت" لاہور دسمبر ۸۹ء ص ۳

محمد نسیم خان
لیکچرر سپیشلسٹ (اکنامکس)، مانسہرہ

اکیسویں صدی، عالم اسلام اور سائنس و ٹیکنالوجی

ان فی خلق السمٰوت والارض واختلاف الیل والنہار لایت لا ولی الالباب

آٹھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی کے دوران مسلم تہذیب نے سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں بے مثال ترقی کی اور مشاہداتی و تجرباتی طریقہ تحقیق و جستجو علم کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں نے مختلف اقوام و ملل کے ذخیرہ علم کو عربی میں منتقل کیا۔ اسکے علاوہ ان کی اپنی تگ و دو سے جو سائنسی حقائق و معارف حاصل ہوئے ان کو بھی کتابی صورت میں پیش کیا۔ یہ وہ دور ہے جب یورپ اپنی تاریخ کے تاریک ترین دور سے گزر رہا تھا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ مسلمانوں کے تہذیبی ورثہ کی بدولت ہی ممکن ہو سکی۔ اس حقیقت کا اعتراف یورپ کے حق شناس لوگوں نے بھی بڑی فراخدلی سے کیا ہے۔ ...لپ۔ کے حق لکھتا ہے۔

"مسلم اسپین قرون وسطیٰ میں یورپ کے ذہنی ارتقاء کی تاریخ بنانے میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ آٹھویں اور تیرھویں صدی کے درمیان ...... عربی بولنے والے ہی پوری دنیا میں تہذیب و تمدن کے مشعل بردار رہے ہیں۔ مزید بر آں وہی قدیم سائنسی اور فلسفہ کی بازیافت کا واسطہ بھی بنے۔ پھر ان علوم میں اضافہ کر کے انہیں اس طور پر منتقل کیا کہ مغربی یورپ کی نشاۃ ثانیہ ممکن ہو سکی" (۱)

بہت عرصہ تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ تجرباتی طریقہ یورپ کی ایجاد ہے لیکن اب بہت سے یورپی مصنفین بھی یہ اقرار کرتے ہیں کہ تجرباتی طریقہ مسلمانوں نے یورپ کو عنایت کیا۔ "میکنگ آف ہیومینٹی" کا مصنف بریفالٹ لکھتا ہے۔

" ...... Neither Roger Bacon nor his later name sake has any title to be credited with having introduced the experimental method. Roger Bacon was no more than one of the apostles of Muslim schinece and method to cristian Europe, and he never wearied of declaring that a knowledge of arabic and arabian science for his contemporaries the only way to true knowledge .... The experimental method of Arabs was by Bacon's time widespread and eagerly cultivated throughout Europe." (2)

اسلام اور سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت و ضرورت

اسلام دین کامل ہے جو انسانوں کی ہمہ گیر فلاح و بہبود کا علمبردار ہے ایک طرف وہ چاہتا ہے کہ ہماری اخروی زندگی خوشیوں سے بھر جائے تو دوسری طرف وہ دنیا کی زندگی کی بہتری، فلاح اور ترقی کا بھی خواہاں ہے۔ قرآنی دعا "ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة" کس قدر جامعیت کی حامل ہے جو دونوں جہاں کی فلاح مانگنے کا درس دے رہی ہے۔

بنی نوع آدم کو اللہ تعالیٰ نے "خلافت ارض" کی خلعت عطا کی ہے اور خلافت ارضی کے فرائض و وظائف کی ادائیگی کیلئے جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ بھی ابتداء سے ہی انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے عطا کر دی تھیں۔ زمین پر زندگی گزارنے کے لئے ضروری تھا کہ انسان موجودات عالم یا مظاہر کائنات کی معرفت اور انکے آثار و خواص سے آگاہی رکھتا ہو۔ حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے جس چیز سے بہرہ ور کیا تھا وہ علم الاسماء تھا۔ یہ علم الاسماء کیا چیز ہے؟ اس کی وضاحت مختلف مفسرین کرام نے جس طرح کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چیزوں کی حقیقت کا علم تھا۔ علامہ شہاب الدین آلوسی کے مطابق الاسماء سے مراد ان تمام چیزوں کے نام ہیں جو واقع ہو چکی ہیں اور جو قیامت تک واقع ہونے والی ہیں۔ امام رازی لفظ اسماء کے اشتقاق اور اسکے لغوی مفہوم پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ "وعلم ادم الاسماء کلھا سے چیزوں کی صفات انکی تعریفیں اور انکے خواص مراد لینا درست ہے۔ قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے تمام علوم و فنون کو بھی اس لفظ کے عموم میں داخل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "آدم کو اس نے چیزوں کی ہستیاں، ان کے خواص ان کے نام، علم کے اصول صنعتوں کے قوانین اور صنعتوں میں استعمال ہونے والے آلات کی کیفیات (غرض سب کچھ الہام کردیا)" شیخ طنطاوی جوہری اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ "اس نے اشیاء کی معرفت، ایجاد و اختراع اور تمام صنعتیں الہام کر دیں" (۳)

"علم الاسماء" دراصل وہی چیز ہے جسے جدید اصطلاح میں سائنس کا نام دیا جاتا ہے۔ کیونکہ سائنس تمام موجودات عالم اور ان کے آثار و خواص اور انکی حقیقت سے بحث کرتی ہے۔

قرآن حکیم کی سینکڑوں آیات آفاق و انفس میں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ آفاق و انفس میں غور و فکر سے مختلف علوم و فنون معرض وجود میں آتے ہیں جن میں حیاتیات۔ نفسیات، طبیعات، کیمیاء، ارضیات، فلکیات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے: "یقیناً زمین اور آسمان کی تخلیق اور دن رات کے ہیر پھیر میں عقلمندوں کے لئے بہت سے نشانات موجود ہیں" (آل عمران۔ ۱۹۰)

ایک اور جگہ ارشاد خداوندی ہے: "اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کیلئے اور خود تمہارے

اندر۔ سو کیا تم غور نہیں کرتے" (۵۱: ۲۰-۲۱)

جو لوگ کائنات میں غور و فکر نہیں کرتے قرآن حکیم نے انکی مختلف انداز سے مذمت کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "اور ہم نے دوزخ کے لئے بہت سے جن اور انسان پھیلا رکھے ہیں جن کے دل تو ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں ہیں اور انکی آنکھیں تو ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں ہیں اور ان کے کان تو ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں کیونکہ یہ غافل و بے پرواہ ہیں (اعراف: ۱۸۵)

ایک اور جگہ فرمان خداوندی ہے: "اور ارض و سماوات میں کتنی ہی ایسی نشانیاں ہیں جن پر یہ لوگ آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں" (یوسف: ۱۰۵)

قرآن حکیم کی تعلیمات نہ صرف علم الاسماء (یعنی سائنس) کی اہمیت واضح کرتی ہیں بلکہ ایک قدم اور بڑھاتے ہوئے وہ علم الاسماء کو انسانی فلاح و بہبود کیلئے عملی طور پر استعمال کرنے پر بھی زور دیتی ہیں۔ سائنسی علوم کے عملی استعمال کا نام ہی ٹیکنالوجی ہے جسے قرآنی اصطلاح میں "تسخیر اشیاء کا علم" کہا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مظاہر کائنات میں انسان کیلئے بے شمار فوائد اور عجیب و غریب نعمتیں ودیعت کر دی ہیں جو انکی ربوبیت و رحمانیت کا حیرت انگیز مظہر ہیں۔ ارشاد قرآنی ہے۔

الم تروا ان الله سخرلكم مافى السمٰوٰت وما فى الارض واسبغ عليكم نعمه ظاهرة وباطنة (لقمان: ۲۰) (۴)

اس آیت کریمہ کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا شہاب الدینؒ لکھتے ہیں۔ "ظاہری نعمتوں سے مراد وہ نوازشات الٰہیہ ہیں جو آفرینش آدمؑ سے لے کر عصر حاضر تک برابر معلوم و متعارف چلی آرہی ہیں۔ یعنی وہ لوازم حیات جن کے استعمال سے ہر دور کا انسان بخوبی واقف رہا ہے......... باطنی نعمتوں سے مراد مادہ (matter) اور توانائی کے وہ سارے پوشیدہ اسرار و حقائق اور ان میں ودیعت شدہ فوائد ہیں جو علوم سائنس کی ترقی کی بدولت منکشف ہو سکے ہیں جن کو موجودہ دور کا انسان مسخر کر کے بخوبی فائدہ اٹھا رہا ہے مثلاً برق، بھاپ، جوہری توانائی، جوہری آئسوٹوپ اور بے شمار قسم کے کیمیاوی مرکبات جو مصنوعی غذاؤں، ادویہ، کھادوں اور دیگر بے شمار مصنوعات کی تیاری سے متعلق ہیں......... یہ تمام نعمتیں روز اول ہی سے کائنات میں موجود تھیں۔ جن سے انسان علم الاسماء کی ترقی اور علم تسخیر (ٹیکنالوجی) کی قوت کی بدولت صحیح فائدہ اٹھا رہا ہے۔ (۵) ایک دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ربانی ہے:

"اور اس نے زمین اور اجرام سماوی کی تمام چیزیں تمہارے کام میں لگا دی ہیں۔ یقیناً اس باب میں غور و فکر کرنے والوں کیلئے (بہت سے) دلائل موجود ہیں" (الجاثیہ نمبر ۱۳)

قرآن کریم میں ان آیات کے علاوہ اور مقامات پر بھی موجودات عالم کے مسخر کرنے کا ذکر آیا ہے تمام چیزوں کا خالق اللہ سبحانہ و تعالی ہے اسلئے وہ ان اشیاء کا حقیقی مسخر ہے (وله اسلم من فی السمٰوٰت والارض) ایک فرمان نبویؐ کے مطابق انسان کو بھی صفات خداوندی کا مظہر ہونا چاہیے۔ (تخلقوا باخلاق الله) اسلئے جب انسان موجودات عالم کو سائنس و ٹیکنالوجی کی بدولت مسخر کر کے اپنے فائدہ کیلئے استعمال کرتا ہے تو در حقیقت وہ اپنی ذات میں صفات خداوندی کی ایک جھلک پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ یہ عمل کار خلافت کو کما حقہ ادا کرنے کیلئے ازبس ضروری ہے۔[۶]

اس بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ مظاہر فطرت اور انکے نظاموں کا علم حاصل کرنا اور پھر اس علم کو انسانی فلاح و بہبود کیلئے استعمال کرنا غیر اسلامی، ناجائز، بے کار یا غیر ضروری نہیں ہے۔ بلکہ وہ عین تعلیم الٰہی اور منشائے خلافت کے مطابق ہے اور اس سے اعراض و چشم پوشی دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے بڑے نقصان کا باعث ہوگا۔

اکیسویں صدی میں عالم اسلام کیلئے مختلف چیلنج اور سائنس و ٹیکنالوجی کا کردار

اکیسویں صدی میں عالم اسلام کو تہذیبی، تمدنی معاشی سیاسی اور فوجی محاذوں پر مختلف چیلنج درپیش ہونگے۔ جنکا سامنا کرنے کیلئے سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں تیز رفتار ترقی انتہائی ناگزیر ہے۔ ورنہ قوموں کی برادری میں عالم اسلام کا کوئی مقام و مرتبہ نہ ہوگا۔ چیچنیا، بوسنیا، کشمیر، فلسطین، افغانستان وغیرہ کی تاریخ اسی طرح دہرائی جائیگی۔ مغرب کی ثقافتی یلغار اسی طرح جاری رہے گی۔ عالم اسلام کے مادی وسائل کی exploitation اسی طرح ہوتی رہے گی۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ یا غلبہ اسلام کا خواب تشنۂ تکمیل ہی رہے گا۔ اور عالم اسلام کی قسمت کے فیصلوں کا اختیار اسی طرح اغیار کے ہاتھوں میں رہے گا۔

۱۔ مغرب میں سائنس جس پس منظر میں پروان چڑھی وہاں مذہبی طبقہ نے مسلمہ سائنسی حقائق کو رد کرنے کا رویہ اختیار کیا اور سائنس دانوں کو اذیتیں دینے میں آخری حدود بھی پار کرلیں، نتیجتاً مغربی سائنسی حلقوں میں یہ سمجھا جانے لگا کہ مذہب و سائنس میں مفاہمت ممکن نہیں اسلئے سائنس کے علمبرداروں نے خدا بیزار تہذیب کی پرورش کی۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان سائنس کا مطالعہ کر کے اسکے خالص اور ناخالص اجزاء کو علیحدہ علیحدہ کریں اور سائنس نے جہاں جہاں ٹھوکریں کھائی ہیں وہاں قرآن و سنت کی روشنی میں اسکی اصلاح کریں۔ سائنس جہاں انسانوں کے دین وایمان کی غارت گر بن جاتی ہے وہاں بقول اقبالؒ اسکو 'مسلمان' کرنے کی ضرورت ہے وہ لکھتے ہیں:

'مسلمان کیلئے لازم ہے کہ جو اسی علم کو مسلمان کرے۔ "بولہب را حیدری کرار کن ....." اگر اس بولہب کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسانی کے لئے رحمت ہے۔' اسی حوالہ سے اقبال کے یہ

اشعار بھی اپنے اندر مسلمان کے لئے لائحہ عمل متعین کرتے ہیں :۔

قوتش ابلیس را یارے شود
نو نار از صحبت نارے شود

کشتن ابلیس کارے مشکل است
زانکہ اوگم اندر عماق دل است

خوشتر آں باشد مسلمانس کنی
کشتہ شمشیر قرآنش کنی

کور را بیندہ از دیدار کن
بو لہب را حیدرِ کرار کن (۷)

حقیقت یہ ہے کہ جب سائنس "مسلمان" ہو جائے تو وہ انسانوں کو اللہ کی وحدانیت کا قائل کر کے چھوڑتی ہے کیونکہ آفاق وانفس میں ایسی ہزاروں نشانیاں موجود ہیں جو خالق حقیقی کی موجودگی کا پتہ دیتی ہیں۔ اسی حوالہ سے مولانا شہاب الدین ندوی لکھتے ہیں۔ "علم الاسماء (یعنی سائنس) کی تحقیق کا سب سے اہم مقصد معرفت الٰہی کا حصول ہے۔ یعنی نظام ربوبیت کی تحقیق کے نتیجے میں خدائے تعالیٰ کی بے مثال صفات مثلاً اس کی وحدت ویکتائی، قدرت و ہمہ دانی حکمت و مصلحت، مخلوق پروری، رحمت و رافت اور اس کی عجیب وغریب منصوبہ بندی کا بھرپور مشاہدہ ونظارہ ہو جاتا ہے جو توحید شہودی اور عین الیقین کی منزل اور اس کا اعلیٰ مرتبہ ہے اور اس منزل پر پہنچ جانے کے بعد انسان کو فکری اعتبار سے کسی طرح بھی بھٹکنے اور غلط راستوں کی طرف نکلنے کا موقع باقی نہیں رہتا(۸) اسلام کی نشاۃ ثانیہ یا غلبہ کی دلائل و براہین کی سطح پر تکمیل کے لئے سائنسی علوم کا تنقیدی مطالعہ ناگزیر نظر آتا ہے اور یہ چیزیں بنی نوع انسان کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کیلئے اس دور کی ضرورت ہیں۔

۲۔ پچھلی دہائی کے اختتام پر دنیا میں روس کی شکست وریخت نے سرد جنگ کا خاتمہ کیا تو امریکہ واحد سپر پاور (Sole super power) کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا اور نیو ورلڈ آرڈر کا غلغلہ بلند ہوا۔ نیو ورلڈ آرڈر کا سادہ ترین الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد عالمی معاملات امریکہ اور اسکی اتحادی قوتوں کی مرضی ومنشا کے مطابق طے ہونگے اور کسی قوت کو امریکہ وغیرہ کی مرضی سے انحراف کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اس پس منظر میں تہذیبوں کے ٹکراؤ (clash of civilizaion) کا نظریہ سامنے آیا ہے۔ کمیونزم کے خاتمہ کے بعد مغربی حلقوں کے خیال کے مطابق سماجی جمہوریت (social de-mocracy) یا کیپیٹلزم کے نظام کی فتح ہوئی ہے۔ اسلئے اب دنیا میں اس نظام اور اسکے علمبرداروں کا سکہ چلنا چاہیے انکے خیال کے مطابق سماجی جمہوریت کے نظام کو اب صرف اسلام سے خطرہ لاحق ہے اسلئے عالمی سطح پر اسلامی قوتوں اور اسلامی ممالک کو کچلنے کیلئے مختلف محاذوں پر کام ہو رہا ہے ان میں اسلامی ممالک کے خلاف دفاعی تیاریاں بھی شامل ہیں اور جہاں کہیں کوئی اسلامی ملک "سماجی جمہوریت" کے علمبرداروں کی نظر میں کوئی ایسا کام کر رہا ہو جس سے عالم اسلام کا دفاع مضبوط ہو سکتا ہو اسکو بھی بند

کرنے کیلئے وہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کو نہ صرف اپنی موجودہ دفاعی صلاحیت کی حفاظت کرنی ہے بلکہ قرآنی حکم واعد والهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله و عدوكم والاخرين من دونهم کی روشنی میں عالم اسلام کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔ یہ سطح اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب مسلمان ممالک مانگے تانگے کے ہتھیاروں کی جائے اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے خود کفالت حاصل کر لیں گے۔

دفاعی تیاریوں کے ضمن میں فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کے قول انتم فی رباط دائم (یاد رکھو کہ تم ہمیشہ پہرے پر ہو یعنی تمہیں ہمیشہ اپنے دشمنوں سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے) کو سامنے رکھنا چاہیے۔ کیونکہ "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات" کا نظارہ خود مسلمانوں کی تاریخ سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ سلطنت عباسیہ، مسلم اندلس، ملت اسلامیہ ہند دولت عثمانیہ کا زوال عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کی فتح چیچنیا اور بوسنیا میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے واقعات اسی حقیقت کے غماز ہیں کہ مسلم دنیا کے بہترین دفاع کے لئے عالم اسلام اور اسکے دشمنوں کے درمیان خوف کا توازن (Balance of terror) قائم کرنا اشد ضروری ہے تاکہ عالم اسلام کو کوئی تر نوالہ نہ سمجھے۔

قرآن وحدیث کی تصریحات کے مطابق قیامت سے پہلے اسلام کا عالمی غلبہ ہو کر رہے گا۔ اس سے پہلے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جنگوں کے طویل اور خون ریز سلسلوں کی بھی احادیث مبارکہ میں پیشن گوئیاں کی گئی ہیں اس حوالہ سے بھی دفاعی تیاریاں ناگزیر نظر آتی ہیں کیونکہ عمومی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت بھی اسباب وعدل ہی کے روپ میں اور کارزار عمل میں جدوجہد ہی کے باعث ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اگر مسلمانوں کے دل ودماغ میں آج کسی حیثیت سے یہ تصور جاگزیں ہو کہ "مہدیؑ" کا ظہور اور حضرت عیسیٰؑ کا دوبارہ نزول ہو گا تو مسلمان خود بخود کامیاب ہو جائیں گے اور انہیں حرکت کرنے یا ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت نہیں ہو گی تو یہ نظریہ اور تصور بالکل غلط اور گمراہ کن ہے۔(۹)

۳۔ سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی عالم اسلام کی معاشی ترقی کیلئے ایک ناگزیر لازمہ (in-evitabel pre-requisite) کی حیثیت رکھتی ہے۔ سائنسی و تکنیکی ترقی کے بغیر نہ تو معدنی وسائل نکالے جاسکتے ہیں، نہ زراعت کو جدید خطوط پر استوار کیا جاسکتا ہے نہ صنعتوں کا جال پھیلایا جاسکتا ہے نہ ذرائع نقل وحمل اور مواصلات کو ترقی دی جاسکتی ہے۔ جدید دور میں معاشی ترقی مشینوں کی مرہون منت ہے اور مشینوں کی تیاری اور بہتری کیلئے ان افراد کی ضرورت ہے جو ایجاد واختراع کی صلاحیتوں سے لیس ہوں اور ایجاد واختراع کی صلاحیتوں کو سائنسی اور تکنیکی علوم میں مہارت پیدا کر کے ہی جلا بخشی جاسکتی ہے۔ یورپ کی تمام تر معاشی ترقی ٹیکنالوجی میں ترقی کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے۔ اسلامی دنیا نے بھی اگر

sustainable development حاصل کرنی ہے تو یورپ کی روایت کی تقلید کرنی ہوگی۔ ورنہ پس ماندگی غربت اور دوسروں پر انحصاریوں ہی ہمارا طرہ امتیاز رہے گا۔

اسلامی دنیا میں جہاں جہاں قیمتی معدنی وسائل موجود ہیں وہ یا تو یوں ہی دفن ہیں اور ان سے مناسب ٹیکنالوجی اور مہارت کی ناموجودگی کی وجہ سے استفادہ نہیں کیا جارہا یا اگر نکالے جارہے ہیں تو ان سے خاطر خواہ آمدنی حاصل نہیں ہورہی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ خام مال کو 'تیار اشیاء' میں تبدیل کرنے کیلئے صنعتیں موجود نہیں ہیں۔ مثلاً تیل اکثر عرب ممالک میں ایک اہم معدنی دولت ہے۔ لیکن اس معدنی دولت سے غیر بھرپور استفادہ کر کے اپنی معیشتوں کو ترقی دے رہے ہیں۔ عربوں سے تیل خام شکل میں حاصل کر کے ایک طرف اگر توانائی کی ضروریات پوری کی جارہی ہیں تو دوسری طرف موم، مصنوعی ربڑ وارنش، الکحل، پلاسٹک، مصنوعی ریشے، خوشبویات، دھماکہ خیز مواد وغیرہ اشیاء تیار کی جارہی ہیں۔ تیل کی اسی اہمیت کی وجہ سے آج عالم اسلام کے قلب میں استعماری ممالک کی فوجیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ستر کی دہائی میں جس طرح oil embargo نے استعماری ممالک کے ایوانوں کو ہلا دیا تھا آج بھی اگر ان ممالک کو تیل کی فراہمی رک جائے تو ان کی معیشتیں ٹھپ ہو جائیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی دنیا اپنے خام مال کو اپنے اپنے ممالک میں ہی استعمال کر کے تیار اشیاء (finished goods) کو بیچنے کے لئے ٹیکنالوجی اور ضروری صنعتوں کے قیام کو یقینی بنائے۔ اس طرح نہ صرف روزگار کے بے پناہ مواقع پیدا ہونگے بلکہ آمدنی زیادہ ہونے کیساتھ ساتھ نئے عالمی تجارتی نظام میں اپنے وجود کو برقرار رکھنا بھی ممکن ہوگا۔ (دنیا میں آج کل "ٹریڈ بلاکس" بن رہے ہیں اور "بلاکس" کے ممبران ہی زیادہ تر آپس میں تجارت کر رہے ہیں۔ مسلم ممالک کو بھی اپنی صنعتی پیداوار میں اضافہ کیساتھ اسلامی کامن مارکیٹ کی طرف پیش رفت کرنا پڑے گی۔

عالم اسلام میں زراعتی "پوٹینشل" بھی کافی موجود ہے لیکن ناقص منصوبہ بندی اور ضروری ٹیکنالوجی کی ناموجودگی کی وجہ سے خوراک کے معاملہ میں بھی ہم دوسروں کے دست نگر بنے ہوئے ہیں۔ (۱۰) اکیسویں صدی میں استعماری ممالک "خوراک بطور ہتھیار" استعمال کر سکتے ہیں۔ (بلکہ کر رہے ہیں اس کا اندازہ افغانستان کے موجودہ حالات اور اقوام متحدہ کے کردار کی روشنی میں بخوبی کیا جاسکتا ہے) ایسی صورت میں ہم اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو خوراک مہیا کرنے کیلئے انکی ہر طرح کی شرائط تسلیم کرنے کیلئے تیار ہونگے۔ پاکستان کی موجودہ صورت حال کو سامنے رکھنا چاہیے۔ بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے قرضہ حاصل کرنے کیلئے کڑی سے کڑی شرائط بے چون و چرا تسلیم کی جارہی ہیں۔ زراعت کی ترقی اگر ایک طرف اسلئے ضروری ہے کہ اس سے بڑھتی ہوئی آبادی کو اپنے وسائل سے خوراک مہیا ہوگی تو دوسری

طرف روزگار کے مواقع پیدا ہونگے کیونکہ زراعت خود روزگار کرنے کیساتھ ساتھ زرعی خام مال سے چلنے والی صنعتوں (Agro-based industries) میں بھی روزگار مہیا کرے گی۔ نیز زراعتی فاضل پیداوار زر مبادلہ کمانے کا بھی ایک اہم ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

عالم اسلام میں آج کئی ممالک تیل کو بیچ کر کافی دولت کما رہے ہیں اور بظاہر امیر ممالک کی صف میں شامل ہیں لیکن ان ممالک کو ترقی یافتہ ممالک نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ان ممالک کی معیشتیں اپنی کوئی مضبوط معاشی بنیاد (Sound Economic Base) نہیں رکھتیں۔ مضبوط معاشی بنیاد کیلئے صنعتی طور پر ترقی یافتہ ہونا ضروری ہے۔ جاپان جیسے ملک نے صنعتی طور پر ترقی کر کے ترقی کا ایک نیا ماڈل ہمیں فراہم کیا ہے کیونکہ جاپان میں ضروری معدنی وسائل اتنی زیادہ مقدار میں موجود نہیں ہیں۔ جاپان نے پچھلی صدی کے آخر میں بنیادی صنعتوں کو فروغ دینا شروع کیا۔ پھر دوسری جنگ عظیم میں شکست کے باوجود بھی تھوڑے ہی عرصہ میں بے مثال ترقی کر کے دنیا کو حیران و ششدر کر دیا۔ جاپان کی اس محیر العقول ترقی میں سائنس و ٹیکنالوجی کا کردار فیصلہ کن نظر آتا ہے کیونکہ وہاں تعلیم کی شرح سو فیصد ہے اور بالخصوص اعلیٰ تعلیم تحقیق و تجسس کے ذریعے نئی نئی دریافتوں کو متعارف کروا رہی ہے۔

عالم اسلام میں بعض ممالک نے اگرچہ عالیشان عمارتیں کشادہ سڑکیں اور محل نما مکانات تو تعمیر کر لیے ہیں لیکن یہ تمام چیزیں مضبوط معیشتوں کی علامات نہیں ہیں۔ خام مال کو بیچ بیچ کر کب تک ہم یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔ اگلی صدی میں جب تیل کے ذخائر میں کمی ہو جائے گی تو لامحالہ آمدنی میں بھی کمی ہو جائے گی۔ اسلئے ضروری ہے کہ مسلم ممالک اپنی معیشت کی بنیادوں کو سائنس و ٹیکنالوجی کو ترقی دے کر مضبوط سے مضبوط تر کر دیں اور صنعتوں کو فروغ دیں۔

۴۔　اکیسویں صدی کو اطلاعات کے انقلاب (Information revolution) کی صدی کہا جارہا ہے۔ کیونکہ اس صدی میں دنیا صحیح معنوں میں ایک "گلوبل ولیج" (Global Village) بن جائیگی۔ اس "گلوبل ولیج" میں اپنا مقام بنانے کیلئے عالم اسلام کو انفارمیشن ٹیکنالوجی میں خاطر خواہ پیش رفت کرنا پڑیگی۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی میں مہارت اور برتری کی بنا پر ہی عالم کفر کی ثقافتی یلغار اور پروپیگنڈا عالم اسلام کو بری طرح متاثر کر رہا ہے۔ اس ثقافتی یلغار اور پروپیگنڈا کا مقابلہ کرنے اور اسلام کا پیغام دنیا تک پہنچانے کیلئے عالم اسلام کی اس شعبہ میں ترقی از بس ضروری ہے۔

۵۔　ماہرین کا خیال ہے کہ اگلی صدی میں توانائی کے روایتی ذرائع میں کمی ہو جائے گی۔ ان حالات میں توانائی کے نئے وسائل تلاش کرنا پڑیں گے۔ اس مقصد کے لئے بھی سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں پیش رفت ضروری ہے۔

۶۔ بیسویں صدی میں دنیا نے صنعتی طور پر بہت زیادہ ترقی کی ہے لیکن اس ترقی نے ساتھ ساتھ ماحولیاتی آلودگی کو بھی جنم دیا ہے۔ اکیسویں صدی میں معاشی ترقی کو اس طرح انجام دینے کی ضرورت ہے کہ ماحولیاتی آلودگی کے مسائل کم سے کم پیدا ہوں اسلئے "انسان دوست" (human friendly) اور ماحول دوست (Environment friendly) ٹیکنالوجی کی دریافت بھی انتہائی ضروری ہے۔

بیسویں صدی میں عالم اسلام نے اگرچہ استعماری قوتوں کی "سیاسی غلامی" سے بظاہر آزادی حاصل کر لی لیکن اس کی ذہنی، تہذیبی اور تمدنی غلامی کا طوق ابھی تک اسکے گلے میں موجود ہے۔ حقیقی سیاسی آزادی حاصل کرنے اور ذہنی، تہذیبی اور تمدنی غلامی سے سے نجات حاصل کرنے کیلئے سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں مولانا شہاب الدین ندوی لکھتے ہیں :۔

"......... مگر یہ عجیب بات ہے کہ وہ قومیں جو اقوام مغرب کے غلبے و تسلط سے سیاسی طور پر آزاد نہ ہو سکیں کیونکہ تعلیم اور علوم و فنون نیز صنعت و ٹیکنالوجی کے باب میں یہ قومیں بدستور پس ماندہ اور مغرب سے کوسوں دور ہیں۔ نتیجہ یہ کہ سیاسی آزادی کے باوجود گویا کہ اپنی تمدنی اور فوجی ضروریات کے باب میں عملاً انہی کی دست نگر اور انہی کی غلام بنی ہوئی ہیں اور یہ تمدنی غلامی اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک یہ قومیں علوم و فنون میں کمال حاصل کر کے صنعت اور ٹیکنالوجی میں ترقی نہیں کر لیتیں اور ہر حیثیت سے اپنے آپ کو خود کفیل نہیں بنا لیتیں۔"

سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کیونکر ممکن ہے؟ سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کیلئے ضروری ہے کہ انسانی وسائل Human Resources کو ترقی دی جائے۔ انسانی وسائل کی ترقی کیلئے ضروری ہے کہ تعلیم کے شعبہ میں سرمایہ کاری کی جائے۔ تعلیم کے شعبہ میں سرمایہ کاری کا مطلب ہے کہ ہر مرحلہء تعلیم پر زیادہ رقوم خرچ کی جائیں۔ تعلیم کے فروغ سے ایک طرف وہ افراد تیار ہونگے۔ جو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں بہتر طور پر کام کرنے کے قابل ہونگے۔ تو دوسری طرف نئی ٹیکنالوجی کی دریافت اور ایجاد کا باعث بنیں گے۔ اس ضمن میں خصوصاً اعلیٰ تعلیم پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اعلیٰ تعلیم میں بھی کیمیاء، فزکس، حیاتیات، ارضیات، فلکیات، کمپیوٹر ٹیکنالوجی وغیرہ کے شعبوں میں اگر زیادہ سرمایہ کاری کی جائے تو سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے۔ جاپان، امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، فرانس، روس، جرمنی، اٹلی وغیرہ ممالک میں ہر سال ہزاروں پی ایچ ڈی فارغ التحصیل ہو رہے ہیں اسلامی ممالک میں اعلیٰ تعلیم کا شعبہ انتہائی خراب حالت میں ہے۔ اس صورت حال کو تبدیل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اسلامی ممالک مشترکہ کاوشوں کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم کریں اور تحقیق و تجسس کیلئے ضروری سہولیات مہیا کریں اور عالم اسلام کے قابل ترین ذہنوں کو تحقیق و تجسس کی طرف

راغب کرنے کیلئے تعلیمی وظائف دیں۔ اسکے علاوہ عالم اسلام کے وہ قابل سائنس دان جو مغربی ممالک میں کام کر رہے ہیں انکو ترغیبات دے کر عالم اسلام کے تعلیمی اور سائنسی اداروں میں واپس لائیں۔ نیز یہ کہ عالم اسلام میں دینی تعلیم دینے والے اداروں کے نصاب میں بھی دور جدید کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی لائی جائے۔ ان اداروں میں سائنس و ٹیکنالوجی کے مضامین کو مقامی یا عربی زبان میں منتقل کر کے بھی پڑھایا جاسکتا ہے۔ عالمی سطح پر سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی پیش رفت سے آگاہ کرنے کیلئے ترجمہ و تالیف کے شعبوں اور لائبریریوں کا قیام بھی اشد ضروری ہے۔

حرف آخر سائنس و ٹیکنالوجی کی طرف عالم اسلام کی مراجعت نہ تو دین اسلام سے روگردانی ہے اور نہ بے کار و عبث کام ہے۔ اسکے برعکس یہ قرآنی احکامات کی تکمیل بھی ہے اور عالم اسلام کی ترقی، وقار اور بقا کی ضمانت بھی ہے

﴿ حواشی ﴾

۱۔ محمد شہاب الدین ندوی، "اسلام کی نشاۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں" ص ۲۲۱

۲۔ علامہ اقبال "Reconstruction of Religious thoughts in Islam" (ص ۱۰۳)

۳۔ محمد شہاب الدین ندوی، ایضاً (ص ۳۹۔۳۱) ۴۔ "کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے تمہارے لئے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں مسخر کر دیں اور تم پر اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں پوری کر دیں"

۵۔۶۔ محمد شہاب الدین ندوی، ایضاً (ص ۱۳۵۔۱۳۳) اور مولانا فضل الرحمان انصاری
The Quranic foundation & Stucture of Muslim Society

۷۔ راقم کا غیر مطبوعہ مضمون "اقبال اور نظام تعلیم"

۸۔۹ مولانا محمد شہاب الدین ندوی ایضاً (ص ۶۴) ۔ (ص ۲۰)

۱۰۔ ۸۱۔۱۹۸۰ سے ۸۵۔۱۹۸۴ کے دوران مختلف ممالک میں مختلف فصلوں کی پیداوار کی جو صورت حال رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم ممالک میں پیداوار بڑھانے کے مواقع زیادہ ہیں کیونکہ مقابلتاً اسلامی ممالک کی فی ہیکٹر پیداوار کافی کم ہے۔ نیچے دیئے گئے جدول سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

نمبر	فصل	ملک	پیداوار فی ہیکٹر (۸۵۔۸۴)
۱	گندم	امریکہ۔ انڈیا۔ کینیڈا۔ ترکی فرانس۔ میکسیکو۔ پاکستان	2519 کلوگرام ۔ 1873 کلوگرام۔ 1746 کلوگرام ۔ 1892 کلوگرام 6008 کلوگرام۔ 4209 کلوگرام ۔1612 کلوگرام
۲	دھان	جاپان۔ مصر۔ پاکستان	6414کلوگرام ۔5310 کلوگرام۔ 2488 کلوگرام ۔
۳	کاٹن سیڈ	ترکی۔ مصر میکسیکو۔ پاکستان	2030 کلوگرام۔ 2500 کلوگرام 2302 کلوگرام۔ 1350 کلوگرام
۴	گنا	مصر۔ امریکہ۔ پاکستان	75893 کلوگرام۔ 84238 کلوگرام35568 کلوگرام

حوالہ انور فاضل چشتی کی کتاب "Agriculture Development Problems of Pakistan" (ص ۳۸)

مولانا مفتی ابو لبابہ
دار الافتاء و الارشاد کراچی

گزشتہ صدی کا قرض

دلخراش مصائب اور کار گر نسخہ : بیسویں صدی اختتام پذیر ہو کر تاریخ کے اوراق کی زینت بن چکی ہے ایک نئے عہد کا آغاز ہو چکا ہے اور توقع ہے کہ دنیا کی عمر کے اس نئے سینکڑے میں باطل اپنی تمام تر حشر سامانی کے ساتھ حق کے ساتھ ٹکرائے گا۔ اہل باطل پہلے سے زیادہ وحدت وجدت 'زیادہ تیاری اور شدت کے ساتھ فدایان حق سے رزم آزما ہوں گے 'مسلمانوں کے ایک ازلی کرم فرما کی طرف سے نیو ورلڈ آرڈر کی تنفیذ کا عزم اور دوسرے کی طرف سے عہد جدید کو مسیحیت کی صدی کہہ کر اس متوقع معرکے کا اعلان کیا جا چکا ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ ایسا کوئی اعلان اس وقت ہوتا ہے جب درون خانہ تیاری مکمل اور کیل کانٹے درست کئے جا چکے ہوں۔ کیا ہم نے اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے کوئی پیش بندی کی ہے؟ آنے والی مشکلات کا ہمیں کوئی احساس ہے؟ دشمن کو نابود کرنے کی غرض سے نہ سہی 'خود کو اس کے ہاتھوں شکار ہونے سے بچانے کی کوئی فکر 'کوئی تدبیر 'کوئی منصوبہ یا سرگرمی ہمارے ہاں پائی جاتی ہے؟ یہ ایک دلخراش حقیقت ہے کہ اس کا جواب تقریباً نفی میں ہے اور یہ مسلم امہ کے اہل علم 'دینی رہنماؤں 'دانشوروں اور صحافیوں کا فرض ہے کہ وہ عنقریب بپا ہونے والے اس معرکے کیلئے مسلم عوام کو تیار کریں ان کے دل ودماغ میں اجتماعی مفاد کیلئے سوچنے کا شعور بیدار کریں اور ان میں آنے والی مشکلات سے نمٹنے کے لئے کتاب وسنت کا تعلیم کردہ نسخہ اپنانے کی تبلیغ وترویج کریں۔ وہی نسخہ جو بے سروسامانی کے باوجود مسلمانوں کی کامیابی کا ضامن اور کفر کے مادی اسباب سے پوری طرح لیس ہونے کے باوجود اس کی ذلت وخواری کا سبب ہے یعنی عبادات کی ادائیگی اور گناہوں سے بچتے ہوئے قتال فی سبیل اللہ۔

اس قرض کی ادائیگی ضروری ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر آئندہ ہمیں کفر کی اس چومکھی یلغار کا سامنا ہوتا جو ہم پر ہونے ہی والی ہے 'تو بھی گزشتہ صدی میں ہم پر ان کا اتنا بھی قرض چڑھ چکا ہے کہ اس کو اتارے بغیر کسی غیرت مند قوم کا زندہ رہنا اولو العزم لوگوں کے نظریہ حیات کے اعتبار سے باعث شرم ہے۔ ان سو سالوں میں کئی ایسے واقعات ہوئے ہیں جنکے جواب کا ادھار ہم پر باقی ہے اور جب یہ نہ اترے گا یہ زندگی ہمارے لئے عار ہے۔ قرض کی اس گراں بار گٹھڑی کو اپنی گردنوں سے اتار پھینکنے کی سعی جہاں ہمیں باعزت طور پر سر اٹھا کر جینے کا حق دلائے گی وہیں مستقبل میں ہمیں ایسے سانحوں سے محفوظ رکھنے کی ضمانت بھی فراہم کرے گی۔

آیئے ذرا ماضی کے جھروکوں سے گزشتہ صدی کے ان دلدوہ سانحوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں جن کی یاد دل میں ان کا حساب بے باکی کرنے کی چنگاری جلادے ایسی دہکتی بڑھکتی چنگاری جس کی سوزش، جس کی دھیمی تپش اس وقت تک چین نہ لینے دے جب تک اس قرض کی ایک ایک پائی ادا نہ ہو جائے۔

بیت المقدس: ابتداء قبلہ اول سے کرتے ہیں، عظیم المرتبت انبیاء کرام و اولیاء عظام کی یہ عبادت گاہ پہلے صلیب کے پجاریوں نے ہم سے چھینی تھی ان کی تمام تر سطوت و شوکت، یہاں کے اہل اسلام پر بے پناہ ظلم و ستم کے باوجود ہمارے قابل فخر اسلاف نے ان پلید مشرکوں سے واپس لی اور اس شان سے لی کہ آج تک اس شکست کے زخم صلیبوں کے پشت، ان کی پیشانی اور چہرے پر صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ اب کی مرتبہ انبیاء کے گستاخ اور سدا کے ملعون و مردود اسرائیلوں کو یہاں ٹھکانہ بنانے کا شوق چرایا ہے۔ عالمی طاقتوں کی مدد سے انہوں نے یہاں اپنے جبر و استبداد کو طول و دوام بخشنے کے لئے کافی کچھ انتظامات کرر کھے ہیں۔ لیکن اللہ کی تدبیر کے آگے کوئی تدبیر نہیں چل سکتی بشرطیکہ مسلمان اللہ کو ساتھ لینے والے اعمال کرنے لگ جائیں۔ اے اہل اسلام! دشمن سے انتقام اور اپنی وراثت کی حفاظت قرآنی حکم اور نبوی سنت ہے، تم اسے کیونکر بھلائے بیٹھے ہو۔

کوفہ و بغداد: جلیل القدر علماء اور بلند مرتبہ اولیاء اللہ کے مسکن جو اپنوں کی احمقانہ روش اور غیروں کی ظالمانہ روش کے باعث اب اسلامی یادگاروں کی وجہ سے نہیں، دشمن کے لگائے ہوئے چرکوں کی بنا پر جانے جاتے ہیں۔ عیار یہود نے عالمی غنڈوں کو استعمال کر کے یہاں اتنا فساد مچایا ہے اور وقتاً فوقتاً مچائے چلے جاتے ہیں کہ اب جب تک انکے خون کو زمین پر اتنا نہ بہایا جائے کہ اس کی رگیں سیر اب ہو جائیں۔ اس وقت تک مسلمان اللہ کی رحمت کے مستحق ہو سکتے ہیں نہ ان سفاک درندہ نما محافظوں سے جان چھوٹ سکتی ہے۔ اے مسلمانو! اولیاء اللہ سے تمہاری عقیدت کیا ہوئی؟ کیا وہ بھی تمہیں بصرہ و گیلان پر نافرمان کافروں کی یورش کا بدلہ لینے پر آمادہ نہیں کرتی۔

خلافت عثمانیہ: دنیا بھر کے مسلمانوں کیلئے ابر کرم، سایہ رحمت، جو روئے زمین کے ہر بے بس و بے کس کلمہ گو کے حقوق کی محافظ اور اس کا سرپرست تھی۔ جس کے ایک نوجوان سلطان نے محیر العقول تدبیر سے قسطنطنیہ فتح کر کے لازوال کارنامہ سر انجام دیا۔ جسکے شہسوار یورپ کے شہروں اور راجدھانیوں کو اپنے پاؤں تلے روندے ڈالتے تھے۔ اور آج کے نام نہاد ترقی یافتہ یورپی ممالک اس کے باج گزار بننے میں عافیت محسوس کرتے تھے۔ افسوس کہ اپنوں کی نادانی اور غیروں کی پیہم سازشوں کی وجہ سے یہ سائبان چاک چاک کر دیا گیا۔ اے نادان مسلم! خلافت کے ادارے کا قیام تیرے حقوق کی پاسبان اور عظمت اللہ کی بازیابی کا ذریعہ ہے۔ اس کاروبار کا احیاء اگلی صدی کا سب سے اہم چیلنج ہے غور کرو کہ اس امتحان سے

کا میابی کا راستہ کیا ہو سکتا ہے؟ احوال عالم کا مشاہدہ کرو کہ یہ چھینی گئی نعمت کیسے واپس مل سکتی ہے؟

برصغیر: کرہ ارضی کا وہ خوش نصیب خطہ جس کے متعلق امام المجاہدین، رحمۃ اللعالمین ﷺ نے یہ معطر و مکیف تبصرہ فرمایا تھا کہ مجھے اس جانب سے خوشبو آتی محسوس ہوتی ہے۔ جہاں محمد عربی ﷺ کے نام لیواؤں نے دنیا کی ایک عظیم سلطنت کی داغ بیل ڈالی اور بت پرستوں کے سینے پر چڑھ کر حکومت کی۔ کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی اور ان کو خراج دیئے بغیر کسی راجے مہاراجے کا راجواڑہ برقرار نہ رہ سکتا تھا۔ افسوس کہ جب شمشیر و سناں کی بجائے طاؤس و رباب کی گرم بازاری ہوئی اور مجاہدین کی جگہ مسخروں، بھانڈوں اور قصیدہ گوئی پر سلطنت کا خزانہ خرچ ہونے لگا تو عالمی استعمار کے علمبرداروں اور ملک گیری کی ہوس سے بھرے ہوئے یورپین بدمعاشوں کی چاندی ہوگئی، پہلے ولندیزی، پرتگیزی اور پھر برطانوی یہاں ٹوٹ پڑے اور اس سونے کی چڑیا کے پر نوچ نوچ کر اور گھونسلے کو اکھاڑ اکھاڑ کر اپنے خزانے بھرنے لگے۔ طویل جدوجہد کے بعد بالآخر ایک عظیم سلطنت کے بدلے چند صوبے مسلمانوں کے ہاتھ آئے جس میں سے غنڈہ گردی کے ذریعے آدھا کاٹ کر بقیہ کی کانٹ چھانٹ کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف دنیا کا سب سے بڑی جمہوریہ کہلانے والے ملک میں مسلمانوں کی آئے دن نسل کشی کے منصوبوں پر عمل اور بابری مسجد ڈھانے جیسے دلدوز واقعات پیش آرہے ہیں۔

اے ہندوپاک کے توحید پرستو! خنزیر خور انگریز اور پیشاب نوش ہندو سے اس وقت تک ہمارا حساب صاف نہیں ہو سکتا جب تک لال قلعے اور بر منگھم پیلیس پر ہلالی پرچم نہ لہرائے گا۔ غیور ہندی مسلمانو! اس چھینی گئی عظمت کی بازیابی اور چھیننے والوں کی سرکوبی کی کوئی فکر تمہیں ہے یا نہیں؟ بابری مسجد کی ہر اینٹ جب تک واپس اپنی جگہ نہ لگے گی تم پر سے ترک جہاد کے گناہ کبیرہ کی نحوست ختم نہیں ہو سکتی۔ برطانیہ کے محلوں اور عجائب گھروں میں موجود ہم سے چھینا گیا مال و زر، ہیرے و جواہرات جب تک واپس نہ آئیں گے، غلامی کا داغ دھل نہ سکے گا۔

وسط ایشیاء: دنیا کا زرخیز ترین قطعہ ارضی جو زمین کی شادابی کا علاوہ مردم خیزی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا، جہاں ہماری تاریخ کے ایسے انمٹ نقوش ثبت ہیں کہ ۷۰ سال تک گج وج کے آنے والا سرخ سیلاب بھی انہیں مٹا نہ سکا۔ مسلمانوں کے زریں دور کی عظمتوں کا امین یہ خطہ یہودیوں کے تلقین کردہ الحادی نظام کے ماننے والوں کے قبضہ استبداد میں ہے۔ بڑے بڑے مصنفین اور راسخین فی العلم کی یہ آرام گاہ آج منکرین خدا کے جابرانہ نظام میں جکڑی ہوئی ہے جن متبرک جگہوں کی خاک ہمارے لئے مقدس تھی وہاں غلیظ کافر عیش اڑاتے دندنا رہے ہیں اسی پر بس نہیں، ان ریاستوں کے بعد افغانستان اور اب چیچنیا میں خدا کے ان دشمنوں نے وہ وہ کاروائیاں کی ہیں کہ اس کا بدلہ اتارنے کے لئے آئندہ

صدی کے مسلم نوجوان کو آگ اور خون کے دریا عبور کرنے ہوں گے۔ اے پاک دامن ماؤں کے غیرت مند فرزندو! تمہیں یہ بھاری قرض بھی چکانا ہے ابھی سے اس کی تیاری شروع کرو۔

ڈھاکہ سے کارگل تک: بنیا بہت کم ظرف ہے' اور سود خور ہو تا ہی کم ظرف ہے' ۲۴ صوبے رکھ کر بھی کٹا کٹایا پاکستان برداشت نہیں۔ پہلے تعصب کی آگ جلا کر مشرقی بازو ہم سے جدا کیا اب کشمیر میں بہتے زخموں پر کچوکے لگا رہا ہے۔ ڈھاکہ کا زخم ابھی بھرنے نہ پایا تھا کہ کارگل کے سانحہ نے پھر خون کھولا دیا ہے۔ اے افواج پاکستان' میدان جنگ کا حساب بھلانے کی چیز نہیں' جو اس کو بھول جاتے ہیں خود بھولی ہوئی کہانی بن جاتے ہیں۔ اس حساب کتاب کو جب تک بے باق نہ کیا جائے گا سود بڑھتا ہی رہے گا اور تم سے زیادہ کون جانے گا کہ یہ حساب کتنی بیسیاں جوڑنے سے ختم ہو سکتا ہے۔ اے عساکر پاکستان کے شیر دل جوانو! لالہ جی کا ادھار چکانے کی منصوبہ بندی کرو' ورنہ اس کے کھاتے میں تمہارے نام پر سود چڑھتا ہی رہے گا۔ ڈھاکہ سے کارگل تک اس نے بہت سے کھاتے تمہارے نام کھول رکھے ہیں۔ وہ اپنی عادت نہیں بدلتا تم اپنی روایت کیوں چھوڑتے ہو؟ اب کی مرتبہ اس کی چٹیا ہاتھ لگے تو جڑ سے اکھیڑنے میں تامل نہ کرنا کہ اس کے بغیر حساب بے باق اور معاملہ صاف نہ ہو گا۔ چٹیا تم اکھیڑ ڈالو' دھوتی تو ویسے بھی مجاہدین کے ہاتھوں دہلی تک اڑی جا رہی ہے۔

عزم نو! تو یہ ہیں اس بہی کھاتے کے چند ورق' جس میں ہمارے نام چڑھے ہوئے ادھار کی تفصیل درج ہے وہ ادھار جو جلد یا بدیر ہم نے ادا کرنا ہے ورنہ خود ہمیں گروی رکھ لیا جائے گا وہ ادھار جس کو ادا کئے بغیر نہ ہم ماضی میں لگنے والے دھچکوں اور جھٹکوں کا اثر مٹا سکتے ہیں نہ آئندہ کی جھڑکیوں اور دھمکیوں سے بچ سکتے ہیں۔ اس ادھار کی ادائیگی کچھ اتنی مشکل بھی نہیں' بس ایک عزم نو کی ضرورت ہے اپنے خالق و مالک کے دین کے غلبے کے عزم کی' اپنے محبوب نبی ﷺ کی سنتوں کی بالادستی کے عزم کی' یہ عزم پختہ ہو جائے تو جان دینا اور مال لٹانا آسان ہے اور جب مسلمان کے لئے یہ دو باتیں آسان ہو جائیں تو دنیا میں کامیابی کی منزل اور آخرت میں جنت کا حصول اس کے لئے سہل ہو جاتا ہے خوش نصیب ہیں وہ جنہیں اس عزم کی توفیق مل جائے۔ خوش قسمت ہیں وہ جن کے لئے جان و مال دین پر وارنا آسان ہو جائے۔ نیک بخت ہیں وہ جن کے لئے دنیا میں کامیابی اور آخرت میں جنت مقدر کر دی جائے برادران اسلام! یہ عزم کر لینے سے نہ صرف گزشتہ سو سال میں چڑھ جانے والے قرض کی ادائیگی ممکن ہو سکتی ہے بلکہ وہ اس طرح لوٹایا جا سکتا ہے کہ آئندہ کوئی طالع آزما' ہمیں اس طرح زیر بار کرنے کی جرأت نہ کرے گا۔

ڈاکٹر اصغر حسن، حافظ آباد

اکیسویں صدی.........کتابِ زندگی کا نیا باب

وقت بدلتا ہے، دن ہفتے مہینے سال اور صدیاں بدلتی ہیں۔ بیسویں صدی ختم ہوئی چاہتی ہے اور یکم جنوری 2001ء سے اکیسویں صدی کا آغاز ہو گیا ہے۔ ماضی میں جو کچھ ہم اپنی اصلاح کے لئے کرتے رہے وہ ناکافی ہے اب نئی صدی میں ہمیں خود کو سنوارنے کا عہد کرنا ہے ہمیں جھوٹ، فریب، بد کلامی، چوری، ڈاکہ، بلیک میلنگ، خوردنی اشیاء میں ملاوٹ سمگلنگ اور منشیات جیسی تمام غیر اخلاقی عادات کو مکمل طور پر ختم کرنا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کی تضحیک سے بچنا ہے۔ بے شرمی اور بے حیائی سے باز رہنا ہے، ہر ایک کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا ہے اور صحیح معنوں میں ایک مہذب قوم بننا ہے۔ ہمیں خود کو بھی سنوارنا ہے اور اپنی نئی نسل کو بھی۔

اگر ہمارا تعلق بزنس سے ہے تو ہمیں صاف ستھرے اسلامی طریقوں پر اپنا کاروبار چلانا ہے، اگر ہم ملازم ہیں تو ہمیں دیانتداری سے بغیر کسی رشوت کے اپنی ڈیوٹی دینا ہے۔ اگر ہم استاد ہیں تو اپنے شاگردوں کی صحیح رہنمائی کر کے انہیں مستقبل میں قوم کا معمار بنانا ہے۔ اگر ہم طالب علم ہیں تو ہمیں اپنے اساتذہ کا احترام کرنا ہے تاکہ مثالی طالب علم بن سکیں۔ ہمیں اپنے بچوں کو سچی محبت اور شفقت دینا ہے ہمیں اپنے والدین کی دل و جان سے خدمت کرنا ہے سادگی اور کفایت شعاری کے رستہ پر چلنا ہے تخریب سے پرہیز اور تعمیر سے لگاؤ پیدا کرنا ہے دشمنی کو ختم کر کے پیار و محبت اور دوستی سے رہنا ہے اپنے اندر اسلامی طریقوں پر چلنے کا شعور پیدا کر کے اور اپنے اذہان کو صاف ستھرا رکھ کر اللہ رب العزت کے حضور ہر وقت سربسجود رہنا ہے۔

ہم غلط راستے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ ہمیں اغیار کے تہوار منانے کا جنون آتا ہے تو پتنگ بازی جیسے فضول کھیل پر کروڑوں روپے ضائع کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں اسلامی تہوار منانے کا ڈھنگ تک نہیں آتا شب برأت آتی ہے تو عبادت کی بجائے ساری رات آتش بازی اور غل غپاڑے میں گزار دیتے ہیں۔ ماہ رمضان آتا ہے تو اس کے تقدس کا خیال نہیں رکھتے عید آتی ہے تو عید کے دن جواء، شراب جیسی گندی محفلیں جماتے ہیں۔ ادھر موذن اذان دیتا ہے کہ آؤ نماز پڑھو، نماز کا وقت ہے ادھر ہم اسی لمحہ ٹی وی پر اناؤنسمنٹ کر رہے ہوتے ہیں کہ آؤ ڈرامہ دیکھو یہ وقت ڈرامہ دیکھنے کا ہے.........در اصل ہمارے

ساتھ "ڈرامہ" ہو رہا ہوتا ہے۔ اور ہمیں علم تک نہیں ہوتا.......... ہم تعلیم یافتہ ہونے اور ادبی دنیا سے تعلق کے باوجود عید قربان کے موقع پر قربانی کے بکرے پر مزاحیہ نظمیں ڈرامے لکھ کر اسلامی تہوار اور قربانی کا جانور کا مذاق اڑاتے ہیں اور بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہم عید منا رہے ہیں۔ ذرا غور کیجئے اور خود ہی بتایئے کہ ہماری کون سی کل سیدھی ہے۔

اسلامی تعلیم کو فضول سمجھنے والو! اسلامی مدارس سے منہ موڑنے والو! اور انگلش طرز تعلیم اور طرز زندگی سے رشتہ جوڑنے والو! جان لو اگر تم اپنی عادات اور اپنے اخلاق کو اسلامی طریقوں سے نہیں سنواروگے 'اپنی بے ڈھنگی چالوں کو درست نہیں کروگے تو تمہاری زندگی کی کتاب کا کوئی ورق بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ زندگی کی کتاب بہت قیمتی ہے۔ اس پر بہترین اخلاق و عادات کا ڈسٹ کور (Dust Cover) چڑھا رکھو۔ یہ ڈسٹ کور جتنا صاف ستھرا اور مضبوط رہے گا ہماری زندگی کی کتاب اتنی ہی محفوظ اور خوبصورت رہے گی۔

آیئے! بیسویں صدی کے داغ دھبوں والے بدزیب اور پرانے ڈسٹ کور (Dust Cover) کو اتار کر اکیسویں صدی کا نیا خوبصورت اور مضبوط ڈسٹ کور چڑھالیں تاکہ کتاب کی گیٹ اپ پرکشش رہے اور غیر مسلم اقوام ہماری زندگی کی کتاب کا مطالعہ کرنے اور ہماری تقلید کرنے پر ہر وقت آمادہ رہیں۔

کٹے گی ظلمت کی شب صبح کے اجالے سے
یہ انتظار نظر کو مدام رہتا ہے

جناب احمد دین حداد، اٹک

اکیسویں صدی میں امت مسلمہ کیلئے شرح خواندگی اور جدید علوم کی اہمیت

خواندگی کی تعریف کے مطابق ہر وہ فرد جو معمولی پڑھنا لکھنا جانتا ہو خواندہ ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان کی ستر فیصد 70% آبادی اس تعریف پر پوری نہیں اترتی۔

پاکستان دنیا کے 160 ممالک میں تعلیمی پسماندگی میں ننانویں نمبر پر ہے۔ جبکہ اسی خطے میں موجود چند دیگر ممالک بھارت، سری لنکا اور بنگلہ دیش پاکستان سے کہیں بہتر ہیں۔ بالخصوص چائنا نے تو نصف صدی میں حیرت انگیز ترقی کر کے دنیا کی چند بڑی طاقتوں میں اپنی جگہ مستحکم کر لی ہے۔ ایک تجزیے کے مطابق دنیا میں صرف ان ممالک نے مادی ترقی کی ہے کہ جہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے یونیورسٹیوں کے ساتھ ساتھ بنیادی و ابتدائی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے کی وجہ سے شرح خواندگی کا معیار بھی بہتر ہے۔ اس لئے سائنس و ٹیکنالوجی اور جدید علوم میں ترقی کے خواہاں ممالک کو پہلے اپنی شرح خواندگی کو بہتر بنانے اور افراد و معاشرہ میں سائنسی و تعلیمی شعور بیدار کرنے کے لئے اقدامات کرنے چاہئیں۔ تاکہ بعد میں یونیورسٹیوں اور ٹیکنیکل اداروں کے لئے ایک مناسب کھیپ میسر آسکے۔ گویا شرح خواندگی اور اعلیٰ جدید علوم کا باہمی تعلق کافی اہمیت کا حامل اور لازم و ملزوم ہے۔ فی الوقت پاکستان اور تمام عالم اسلام میں جدید سائنسی و تکنیکی میدانوں میں کوئی منظم پیش رفت نہیں ہو رہی کہ جس کی وجہ سے آئندہ صدی میں عالم اسلام کا عصری میدانوں میں کوئی مقام تلاش کیا جاسکے۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو یہ ملک دنیا کی پہلی اسلامی جوہری قوت ہونے کے باوجود تا حال اپنی آزادی اور خود مختاری میں دوسروں کا دست نگر ہے۔ جس کا اہم ترین سبب اس ملک کا 60 ارب ڈالر کا مقروض ہونا ہے۔ حالانکہ پاکستان قدرتی وسائل سے مالا مال اور زرعی لحاظ سے زرخیز ملک ہے۔ اسی طرح عالم اسلام دنیا کی 6 ارب آبادی کا ایک چوتھائی ہے اور تقریباً 160 ممالک میں سے 60 ممالک اور ریاستوں میں مسلمانوں کی مکمل اکثریت ہے۔ جبکہ پوری دنیا میں پائی جانے والی معدنی دولت اور تیل کے 70 % ذخائر بھی مسلم ممالک میں ہیں لیکن اللہ کے ان بیشمار احسانات کے باوجود یورپ، ایشیا اور افریقہ کے

مختلف کونوں میں اسلام کا نام کے ہی مظلوم و مقہور ہیں۔

آج اسلامی ممالک کے سربراہان اتنے بے بس اور مجبور ہیں کہ O.I.C کے پلیٹ فارم سے خون مسلم کی ارزانی و روانی پر آواز تک بلند نہیں کر سکتے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ یہود و ہنود اور صلیب کی تکون نے اس حد تک ہمارا ستیاناس کر دیا ہے کہ ہم بے بسی کی موت مرتے ہوئے بے بسی کی آواز تک بھی نہیں نکال سکتے۔

اسکا مختصر جواب یہ ہے کہ خاص طور پر یہودیت اور عیسائیت نے اپنی سائنس و ٹیکنالوجی اور عصری ترقی کے بل بوتے پر ہمارے وسائل اور اقتصادیات کو اپنے قبضہ میں لے لیا ہے۔ اور ہم اللہ کی طرف سے عطا کردہ نعمتوں اور وسائل پر حد درجہ قانع اور کاہل بن کر خواب خرگوش کے مزے لوٹتے رہے۔ ہم نے ان وسائل کو اپنی افرادی قوت سے مخلوقِ خدا کے فائدے کیلئے استعمال کرنے اور ترقی دینے کا نہ سوچا۔ ہم نے روحانی و مادی دونوں میدانوں میں اسلام کے مزاج ترقی کو نہ اپنایا اور ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے روحانی قطع تعلقی کیساتھ ساتھ عصری و مادی میدان میں بھی ان کے کارناموں سے استفادہ نہ کیا۔

آج ہماری تعلیم جو ہمیں اپنے اسلاف سے میسر آئی تھی۔ دو مختلف بلکہ بالمقابل نظاموں میں بٹ چکی ہے۔ دینی مدارس اور سائنسی و فنی تعلیم کے اداروں میں بعد اور فاصلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اسلام دشمنوں کی خواہشوں اور سازشوں کے عین مطابق اسلامی ممالک میں "بنیاد پرست" اور "ترقی پرست" قسم کے دو گروہ پیدا ہو رہے ہیں بلکہ پیدا کیے جا رہے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک دین فطرت اور ترقی پسند مذہب ہے جو ارتقاء و ترقی کا مخالف ہر گز نہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم موجودہ صیہونی و سامراجی اور استعماری و ابلیسی منفی پراپیگنڈے کا ہر محاذ پر مقابلہ کرتے ہوئے اس کا توڑ تلاش کریں۔ جسکی ایک صورت یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے علوم کی بالادستی برقرار رکھتے ہوئے انکی روشنی میں سیاسیات، معاشیات، سماجیات اور سائنسی و فنی علوم کو نئی نسل تک منتقل کرنے کیلئے اپنا کردار ادا کریں۔ تاکہ دین اسلام کی تمام شعبہ ہائے حیات میں بطور رہنما اور نظام کے اہمیت واضح ہو سکے۔

صرف اسی صورت میں اکیسویں صدی عالم اسلام کے غلبہ کی صدی قرار پا سکتی ہے۔ کیونکہ جب ہم سابقہ انسانی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں انسانی عروج و زوال اور قوموں کی ترقی و تنزلی میں عصری تقاضوں اور علوم کی اہمیت و افادیت واضح طور پر نظر آتی ہے حتی کہ دین اسلام کے دور جاہلیت پر غلبے میں بھی ایک اہم ترین سبب یہ تھا کہ اسلام زمانہ جاہلیت کے دیگر فرسودہ اور تنگ نظر مذاہب کے

برعکس اپنے اندر ایک کشادگی اور روشنی لئے ہوئے تھا جس کی بدولت اسے دیگر مذاہب میں انفرادیت ملی اور عالمگیر غلبہ نصیب ہوا۔ لیکن بعد میں قرون وسطیٰ کے اسلامی ترقی یافتہ دور کے بعد مسلمانوں کی کاہلی اور غفلت نے انہیں پھر غیروں کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

اب ہم مذکورہ بالا نقطۂ نظر کو تاریخی حقائق کے آئینے میں پرکھتے ہیں تاکہ ہم اپنے درخشاں ماضی کی ضوفشانیوں سے اپنے مستقبل کو تابناک بنا سکیں۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے اور کائنات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے جبکہ سائنس سادہ الفاظ میں مطالعہء فطرت کا نام ہے۔ اگرچہ جب سے پہلا انسان پیدا ہوا ہے اس وقت سے یہ کائنات اسکے سامنے ہے لیکن سائنس نے جو ترقی پچھلے چودہ برس میں کی وہ ترقی اس سے پہلے لاکھوں برسوں میں نہ ہو سکی تھی۔ اسکا جواب یہ ہے کہ یہ بات درست نہیں کہ اس سے پہلے انسان نے ترقی کی ہی نہیں البتہ یہ ہے کہ اسکی ترقی کی رفتار اب کی نسبت کافی سست تھی جبکہ دوسری وجہ یہ ہے کہ قدیم ترین زمانے میں ترقی اور خاطر خواہ سائنسی تحقیقات نہ ہونے میں شرک و توہم پرستی کا کردار اور عمل دخل رہا ہے۔

شرک وہ بیماری ہے جو انسان کو مظاہر فطرت میں فکر و تدبر کی بجائے اس سے مرعوب کرتی ہے۔ جسکا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسانی زندگی میں کسی قسم کی ترقی اور بہتری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ حضورؐ کی بعثت سے پہلے بھی انبیاؑ آتے رہے ہیں اور انسانوں کا اپنے خالق حقیقی کیساتھ رشتہ اس وقت بھی برقرار تھا لیکن اسوقت پیغمبروں کے بعد انکی قومیں اصل الہامی ہدایات میں ردوبدل کر دیتی تھیں جس سے اصل احکام کی صورت مسخ ہو جاتی تھی۔ جبکہ آخری الہامی کتاب قرآن مجید کی یہ انفرادیت ہے کہ اسکی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے اٹھایا ہے اور یہ تا قیامت محفوظ و مامون رہے گی۔ گویا شریعت محمدیؐ سے پہلے الہامی احکام میں تغیر و تبدل سے انسان فطرت کا مطالعہ کرنے کی بجائے اسے ہی خدا سمجھ بیٹھتا تھا۔

حضورؐ کی بعثت عظمیٰ سے شرک کا علاج خالص پیغام توحید سے ہوا اور اس عقیدے نے پھر سے انسان کو یہ باور کرایا کہ مظاہر فطرت خالق و مالک نہیں بلکہ مخلوق و مملوک ہیں جبکہ انسان اللہ کی تمام مخلوقات میں اشرف و افضل ہے اور یہ فطرتی مظاہر اور حسن و خوبصورتی خالق حقیقی تک انسان کی رسائی کا ذریعہ ہیں۔ یوں نظریہ توحید کی بنیاد پر انسانی معاشرے میں وسیع تر انقلاب بپا ہوا اور بنی نوع انسان کی ترقی کے نئے دروازے کھلے۔ اسلام کا تمام انسانیت پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے شرک کے ایوانوں کو زیر و زبر کر کے مظاہر فطرت اور کائنات میں فکر و تدبر کی دعوت دیکر سائنسی طرز فکر کی بنیاد ڈالی اور یوں سائنسی ترقی کا عظیم دور شروع ہوتا ہے۔

مسلمانوں نے ابتدائی دور میں سائنس کے میدان میں جو ترقیاں کی تھیں اسکا پہلا سب سے بڑا

فائدہ انکو دو سو سالہ صلیبی جنگوں (1095-1270) میں ہوا۔ ان جنگوں میں تقریباً سارا یورپ متحدہ طاقت سے مسلم دینا پر حملہ آور ہوا تا کہ اپنے مقدس مقامات کو مسلمانوں کے قبضہ سے واپس لے مگر انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ان مہموں میں کروڑوں جانیں اور بے پناہ دولت قربان کی گئی اور جب یہ ختم ہوا تو یروشلم بدستور بے دینوں کے قبضہ میں تھا اگرچہ صلیبی جنگوں کا خاتمہ مسلمانوں کی کامل فتح اور مسیحی یورپ کی کامل شکست پر ہوا۔ (۱)

حقیقت میں صلیبی جنگوں میں شکست نے مسیحی یورپ کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جبکہ مسلمان ان فتوحات پر قانع ہو کر خواب غفلت میں پڑ گئے۔ یہاں مسلمانوں کے علمی و سائنسی کام اور کارناموں پر جمود طاری ہو گیا اور یورپ نے مسلمانوں کے ہی علمی ذخیروں سے فیض یاب ہو کر ترقی کے لئے اپنی راہیں متعین کیں۔ یورپ کی جدید علوم پر تحقیق و ترقی کا یہ سفر صلیبی جنگوں کے بعد سے لے کر اب تک جاری ہے یہاں تک کہ آج ہم عصری ترقی میں ان سے کہیں زیادہ پیچھے جامد و ساکت پڑے ہیں۔

اب انیسویں صدی کا یورپ اور امریکہ اپنی سائنسی و فنی ترقی کے سبب دنیا کی معیشت پر اجارہ داری کر رہے ہیں اور دنیا کے اکثر حصے پر بالواسطہ یا بلاواسطہ قابض ہو کر اپنی من مانی اور غنڈہ گردی کر رہے ہیں۔ عصری و جدید علوم و فنون میں ترقی یافتہ چند ممالک نے تیسری دنیا خصوصاً عالم اسلام کے بے پناہ وسائل پر قبضہ کیا ہوا ہے اور ہم اپنا سب کچھ لٹتے اور برباد ہوتے دیکھ کر بھی خواب غفلت کی چادر تانے ہوئے ہیں۔ اگر بارہویں صدی کے یورپ نے اپنے فاتح دشمن (مسلمانوں) کے عصری علوم اور تحقیقات سے فائدہ اٹھانے میں عار محسوس نہیں کی۔ تو ہم انیسویں صدی کے یورپ سے اپنے علمی و تحقیقی ورثے کی بازیابی میں کیوں شرم محسوس کرتے ہیں؟

جدید سائنسی علوم اور ترقی تو دراصل امت مسلمہ کا گمشدہ ورثہ ہیں جو ہمارے آفاقی دین کے تصور توحید کے طفیل دینا کو میسر آئے ہیں اور جن کی داغ بیل ہمارے ہی آباؤ اجداد نے ڈالی ہے مگر افسوس کہ آج ہماری میراث پر غیروں کی اجارہ داری قائم ہے۔ بقول اقبال ؎

وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی جو دیکھیں انکو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

یورپ کا موجودہ تسلط اور غلبہ صرف اسی وجہ سے ہے کہ انہوں نے صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد اپنے روایتی و کلیسائی جمود کو توڑ کر مسلمانوں کے عصری علوم اور تحقیق و ترقی کے مزاج کو اپنایا۔

آیئے چلتے چلتے ایک مختصر نظر قرون وسطیٰ کے ان مسلمان سائنسدانوں کے چند اہم کارناموں پر بھی ڈال لیں جن کی بدولت غیروں نے عروج حاصل کیا۔ شاید اس سے ہمیں اپنی عظمت رفتہ کی بحالی کا احساس ہو جائے۔ مسلم سائنسدانوں میں محمد زکریا رازی کو نمایاں مقام حاصل ہے یہ ۸۶۵ء میں ایران

کے دار لحکومت تہران کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور ساٹھ سال کی عمر (۹۲۵ء) میں فوت ہوئے۔
ان کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ انہوں نے یونانی علوم کو ہو بہو نقل کرنے کی بجائے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بناء پر پرکھا۔ اور سائنسی طرز فکر کو فروغ دیا۔ جراحی کا طریقہ سب سے پہلے الرازی نے ایجاد کیا۔ اسکے علاوہ انہوں نے ۱۱۳ بڑی اور ۲۸ چھوٹی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ الرازی کی علم کیمیا پر مشہور تصنیف "کتاب الاسرار" کافی عرصہ تک یورپی اداروں میں شامل نصاب رہی۔ انکی دیگر مشہور تصانیف میں "الحاوی" "کتاب المنصوری اور ایک رسالہ ہے ان کتابوں کے وقتاً فوقتاً جرمنی، فرانسیسی اور لاطینی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ (۲)

ابن سینا کو رازی کے بعد اپنے علم و فن میں نمایاں شہرت ملی۔ ان کا اصل نام ابو علی الحسن ہے اور یہ ۹۸۰ء میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ یہ نہ صرف طب کے ماہر تھے بلکہ فلسفے، شاعری، اور علم کلام میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی کثیر تصانیف میں سے دو کتابیں کتاب الشفا اور القانون فی الطب بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ القانون فی الطب کے منظر عام پر آنے کے بعد یونانی طبیبوں بقراط، افلاطون، جالینوس اور ارسطو کی کتابوں کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔ جبکہ انکی ایک اور کتاب مخزن الادویہ کو مغربی ممالک میں طبی انجیل کا درجہ حاصل ہے۔ (۳)

جابر بن حیان مشہور و معروف کیمادان ۷۲۱ء میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں علم کیمیا کی نوعیت عجیب تھی۔ کیمیادان تین اقسام کے ہوتے تھے ایک وہ جو کشتہ جات اور جڑی بوٹیوں کی تحقیق سے انسان کی صحت اور درازئ عمر کی جستجو کرتے تھے، دوسرے صرف تانبے، چاندی اور پارے سے سونا بنانے میں مگن رہتے تھے اور تیسرے علم کیمیا کا مطالعہ علم فلسفہ کے طور پر کرتے تھے۔ جبکہ جابر بن حیان نے علم کیمیا کا ایک جامع اور سائنسی نظریہ پیش کیا اس کے نظریات آج کے ایٹمی نظریات کے بہت قریب قریب نظر آتے ہیں۔ یورپ میں تحریک احیائے علوم شروع ہونے پر جابر بن حیان کو علم کیمیا میں بلند مقام دیا گیا۔ (۴) اسی طرح علم نباتات و زراعت کے میدان میں بارہویں صدی کے اواخر میں اشبیلیہ کے مقام پر ابو زکریا ابن محمد نے علم زراعت کی تحقیق کا کام کیا۔ انکی جمع کی ہوئی معلومات اور انکی کتاب "الفلاحہ" سے یورپی اقوام نے استفادہ کر کے اپنی زراعت کو سائنسی اصولوں پر ڈھالا۔ (۵)

ابن البیطار جن کا اصل نام عبداللہ ہے اندلس کے شہر ملاغہ میں پیدا ہوئے انکی تاریخ پیدائش ۱۱۸۲ء ملتی ہے۔ انہوں نے شمالی افریقہ میں مصر، ایشائے کوچک اور سارے شام کی سیاحت کر کے یہاں کے جنگلات میں پائی جانے والی نباتات پر مشاہدات کر کے تحقیق کی۔ انکی دو کتابوں "المعنی فی الادویة المفردہ" اور "الجامع فی الادویة المفردہ" میں علاج کا طریقہ اکثر نباتات، معدنیات اور جانوروں

کی پیداوار پر مشتمل ہے۔ ان کتابوں کا ترجمہ جرمن، انگریزی اور لاطینی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ (۶)

بارہویں صدی عیسوی میں الہیثم نامی مسلمان سائنسدان نے روشنی کے اصولوں پر تحقیق کر کے ایک جامع کتاب المناظر لکھی جس میں نہ صرف تمام اصول بلکہ کروی آئینوں اور عدسوں کے اصولوں کے الجبرے کو ایسی دقیق مساوات کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے کہ یورپی آج تک ان چیزوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں لیکن متعصب انگریزوں نے ان اصولوں کو نیوٹن اور سینل کے نام سے منسوب کیا ہے۔ حالانکہ الہیثم کا لکھا ہوا مسودہ آج بھی پیرس کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ جسکے نصف حصے کا ترجمہ انگریزی یا فرانسیسی زبان میں نہیں ہو سکا جبکہ 'المناظر' کے نصف کا ترجمہ یورپ کی اکثر یونیورسٹیوں میں اضافی شکل میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہاں بھی انگریزوں کے تعصب کی حد دیکھیں کہ مترجم کتابوں میں الہیثم کے نام کو بگاڑ کر "ہیزن" رکھا گیا ہے تاکہ یورپی طالب علم اس سائنسدان کو انگریز سمجھتے رہیں۔ (۷)

یہ تو رہیں ماضی کی داستانیں موجودہ دور میں بھی فرانس کے ایٹمی پروگرام کا بانی ایک مسلمان سائنسدان ہے۔ جبکہ بھارت کے ایٹمی پروگرام کا بانی بھی ایک مسلمان سائنسدان عبدالکلام ہے۔ خود پاکستان میں مسلمان سائنسدانوں کی ایٹمی اور دیگر شعبوں میں خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ آج فرانس، برطانیہ اور امریکہ کی سائنسی و تحقیقی تجربہ گاہوں میں کئی مسلمان کام کر رہے ہیں۔ اس لئے امت مسلمہ کو احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ امت مسلمہ کے نوجوانوں کا شعور بیدار کیا جائے اور سائنسی طرز فکر کو عام کیا جائے اس مقصد کے حصول کیلئے ہمیں مسلمانوں کی سائنسی وفنی، معاشی واقتصادی، سیاسی وسماجی اور علمی و تحقیقی کاوشوں کو اجاگر کرنا ہوگا۔ تاکہ امت مسلمہ غیروں سے اپنی میراث کو بازیاب کرا سکے۔ کیونکہ حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے۔

اکیسویں صدی کو عالم اسلام کی صدی بنانے کیلئے ہمیں قرآن وسنت کو انفرادی واجتماعی سطح پر اپنانا ہوگا۔ اور مادی میدانوں میں بھی ان آفاقی تعلیمات سے رہنمائی اور اسلاف کے کارناموں سے استفادہ کرنا ہوگا۔ تاکہ کفر کی موجودہ الحادی یلغار کا مقابلہ کیا جا سکے۔ جدید علوم اور سائنسی وصنعتی ترقی کے حوالے سے مفکر اسلام ومورخ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں۔ "یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ ایک بدعت کی جارہی ہے میں اپنی دینی اصطلاح میں بول رہا ہوں کہ بہت سے لوگوں کو اس بدعت سے روکا جائے۔ یہ بدعت نہیں ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسلمانوں کی ایک قدیم سنت کا احیا ہے اور اسکو زندہ کیا جائے مسلمانوں کو اسکی بڑی ضرورت ہے اور مسلمان ان میدانوں میں بہت سی قوموں سے آگے رہے ہیں" (۸)

ہمارا آج کا سب سے بڑا مسئلہ بلکہ فکری بحران یہ ہے کہ ہم نے دین اور دنیا کو دو علیحدہ خانوں

میں تقسیم کر دیا ہے۔ آج چند مذہبی عبادات کو مکمل دین سمجھ لیا گیا ہے جبکہ دین اسلام بطور ایک مکمل "ضابطہ حیات" کے ہمارے یہاں سے ناپید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے ملک میں مذہبی و جدید علوم کی علیحدہ علیحدہ درسگاہیں اور ادارے قائم ہیں اور اسی تقسیم سے ہمارے یہاں دو متضاد طبقات پیدا ہو رہے ہیں۔ ہمیں امتِ مسلمہ کی ترقی اور فلاح کیلئے اس تقسیم اور ان طبقات میں موجود باہمی فرق کو کم کرنا ہوگا تاکہ دیگر مذاہب کی قوموں پر اسلام کی حقانیت واضح ہو سکے۔ آج جس طرح مذہبی علوم کے حامل افراد جدید علوم کی نفی کر رہے ہیں اور جدید اہل علم قدیم علوم کی مخالفت کر رہے ہیں اس منفی سوچ نے علوم کی ان دو شاخوں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔ حالانکہ "علمائے قدیم نے تمام علوم کو سمیٹ کر دونوں میں بانٹ دیا ہے ایک کو وہ منقول کہتے ہیں جسکا تعلق تاریخی شعور سے ہے۔ دوسرے کو معقول کہا جاتا ہے جس کی بنیاد عقلیت پسندی پر ہے۔ مشہور مقولہ ہے" العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان" یعنی علم کی دو قسمیں ہیں (Physics) اور (Metaphysics) ان میں سے کسی کو کمتر بتایا گیا ہے نہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے۔ لیکن اسلامی سائنٹیفک نظریہ یہی ہے کہ ان دونوں شاخوں کو ایک وحدت کے روپ میں دیکھا جائے نہ یہ کہ انکو ایک دوسرے سے بیگانہ سمجھا جائے اور نہ ان میں سے کسی کی نفی کی جائے۔"(۹)

عیسائیت نے سائنس کی مخالفت اس لیے تھی کہ وہ اسلام کی طرح حکمت تکوینی میں غور و فکر کی داعی نہیں کیونکہ اسکی بنیاد عقلیت پسندی پر نہیں تھی اسلئے اسے سائنس سے شکستیں ہوئیں اسلام نے کبھی عقلیت کی نفی نہیں کی بلکہ طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کے رشتے کو جوڑے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کے برعکس ہر شعبہ ہائے زندگی کیلئے پسندیدہ اور قابل عمل دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابو البشر حضرتِ آدم علیہ السلام کو زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا اور خلافت ارض کا منصب سنبھالنے کیلئے آپکو علم الارشاد سے نوازا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وعلم ادم الاسماء کلھا (بقرہ:۳۰)

مفسرین نے تصریح کی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو دنیا بھر کی تمام چیزوں کے نام ہی نہیں بلکہ ان کے خواص و تاثیرات اور دینی و دنیوی منافع بھی بتا دیے تھے کیونکہ زمین کی خلافت کیلئے زمینی اشیاء سے واقفیت ضروری تھی تاکہ ہر چیز کا صحیح تعارف حاصل کر کے اس کا صحیح استعمال ہو سکے۔ اب ترقی یافتہ دنیا سائنس و ٹیکنالوجی میں اس قدر آگے جا چکی ہے کہ جس کا تصور صرف ایک سو سال پہلے تک محال تھا اور ارتقاء و ترقی کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ شب و روز نت نئی ایجادات کے لئے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اور دستیاب وسائل کو بروئے کار لایا جا رہا ہے۔

تیسری دنیا اور مسلم ممالک کے لئے موجودہ گھمبیر حالات میں جب استحصالی طاقتوں کی طرف

سے ہر سو گلوبل ولیج، نیو ورلڈ آرڈر اور فری اکانومی جیسی آوازیں سنائی دے رہی ہیں دور اندیشی سے کام لینا از حد ضروری ہو گیا ہے۔ ہمیں ابھی سے مستقبل قریب میں پیش آنے والے حالات و مسائل کا ادراک کرنا ہو گا اگر امت مسلمہ الہی معاشی و عسکری خود کفالت اور آزادی چاہتی ہے تو اسے اپنے وسائل کے بہتر استعمال اور نفع بخشی کیلئے اپنے ہاں جدید علوم و فنون کو رائج کرنا ہو گا ورنہ اس اقدام کے بغیر آج کی جدید دنیا پر غلبہ واستحکام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

اگر آج امت مسلمہ میں یہ فکر عام ہو جائے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے جدید علوم کو مادیت پرستی اور خود غرضی ولالچ کے لبادے سے نکال کر تمام بنی نوع انسان کے فائدے کے لئے کام میں لانا ہے۔ تو پھر غلبۂ اسلام اور خلافت ارض کی منزل زیادہ دور نہیں کیونکہ ہمارے پاس وہ ایمانی قوت اور تائید ایزدی ہے جو آج کے ترقی یافتہ ممالک اور طاقتوں کے پاس نہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ امت مسلمہ ایمانی قوت کے ساتھ مادی قوت بھی حاصل کرے ورنہ آئندہ صدی میں نیو ورلڈ آرڈر اور فری اکانومی سسٹم تیسری دنیا اور عالم اسلام کو اپنے استحصالی و توسیع پسندانہ ریلے میں بہالے جائیں گے۔

محترم قارئین! اسلام ہی وہ دین ہے جو سائنس ودیگر جدید علوم کو ایک اعلیٰ وارفع مقصد وغایت دے سکتا ہے اور مسلمان ہی وہ رجال کار ہے جو اسے اصلاح فی الارض کا وسیلہ بنا سکتا ہے۔ اسکے لئے علم الادیان کیساتھ علم الابدان سے بھی تعلق جوڑا جائے تاکہ سائنس کو اپنی گم کردہ راہ میسر آسکے۔ اور دنیا کی ایجادات واختراعات کو بامقصد بنایا جاسکے۔ اسلام اور سائنس کی ترکیب وامتزاج سے دنیا کو توحید کا ایک سائنسی تصور مل سکتا ہے اور آخرت کا بھی اس طرح سائنس کی زندگی بھی طویل ہو گی۔ اور اس سے صالح انسانوں کا وہ طبقہ پیدا ہو گا جسے زمین کا وارث کہا گیا ہے۔ آیئے اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے ابھی سے سر جوڑ کر بیٹھیں اور غلبہ اسلام کے تمام لوازمات کو مد نظر رکھتے ہوئے عملی جدوجہد شروع کردیں پھر دیکھیں کہ نصرت خداوندی کیسے ہمارے قدم چومتی ہیں۔

...... حوالہ جات ......

(۱) سائنس کا خالق اسلام (مولانا وحید الدین خان) ماہنامہ انجمن کراچی۔ اگست ۱۹۸۹ء

(۲) مسلم فلاسفی، اسلامی فلسفہ حیات، اسلامی ادارے اور تہذیب وتمدن (ایس۔ ایم شاہد)

(۳ تا ۷) " " " "

(۸) صنعتی اور سائنسی علوم کی تعلیمی اہمیت وافادیت (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) تعمیر حیات ۱۰ دسمبر ۱۹۹۳ء

(۹) جدید سائنس اور اسکا مقصد وجود (ڈاکٹر نثار احمد فاروقی) ماہنامہ فکر ونظر، جولائی ستمبر ۸۴

(۱۰) خلافت ارض کیلئے علم کیمیا اور طبیعیات کی اہمیت اور جدید صنعتی علوم کا تعارف (مولانا شہاب الدین ندوی) الحق ستمبر ۱۹۹۹

مولانا حافظ عرفان الحق حقانی
مدرس جامعہ دار العلوم حقانیہ

بیسویں صدی عیسوی کے تین بڑے المیئے اور عالم اسلام کی زبوں حالی و اسباب

بیسویں صدی پیدائش، بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے ادوار سے گزر کر موت کی وادی میں پہنچ چکی ہے اور فی الوقت اکیسویں صدی شاہی تخت پر براجمان ہو چکی ہے بیسویں صدی عیسوی میں ملت مسلمہ کو جن بڑے المیات کا سامنا کرنا پڑا ان میں سے تین المیے اور نقصانات ایسے ہیں جن سے ملت مسلمہ کو سخت اور شدید ترین دھچکا لگا ہے ان تینوں المیوں کے پیچھے یہود جو کہ مسلمانوں کے ازلی دشمن ہیں کارفرما ہے۔

خلافت عثمانیہ کا خاتمہ:

بیسویں صدی کی ابتداء میں خلافت عثمانیہ پورے آب و تاب سے موجود تھی خلافت کے مسند پر سلطان عبدالحمید خان متمکن تھے جنہیں ایک زمانہ میں نہایت سخت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنایا گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ ان کے عہد میں مغربی طاقتیں اور یہود کسی طور سے بھی ترکی اور فلسطین کے علاقوں میں قدم نہ جما سکے تھے۔ یہی وہ شخصیت ہے جنہوں نے یہودی پیشکشوں کو ٹھکراتے ہوئے زمین سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر کہا تھا کہ بیت المقدس تو بڑی چیز ہے میں فلسطین کی سرزمین کی اتنی سی خاک بھی دینے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ خلافت عثمانیہ تمام ترکمزوریوں کے باوجود ملتِ اسلامیہ کیلئے سرچشمہ قوت و امتیاز، باعث عزت و افتخار اور آہنی حصار تھی۔ خلافت عثمانیہ مشرق میں یمن و عسیر سے لے کر مغرب میں ایک طرف اورنہ والبانیہ افریقہ میں طرابلس، تونس فزان تک شمال میں بلغیریا، ریاست ہائے بلقان، طرابزون اور ایڈریانوپل سے جنوب میں اسوان مصر برقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ یورپ کے مصنفین نے اس سلطنت کو مردِ بیمار کا نام دیا تھا حالانکہ ان پر اسی مردِ بیمار کی سخت دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور اس مردِ بیمار کو خطرہ سمجھتے ہوئے عربوں کو سازش کا شکار بناتے ہوئے اس کے خلاف شریف مکہ شریف حسین کی قیادت میں اٹھایا جس کے نتیجے میں سلطنت عثمانیہ کے مختلف علاقے اس کے کنٹرول سے نکل گئے۔ اور بیت

المقدس تک انگریزوں کے کنٹرول میں چلا گیا اور فرانسیسی جنرل گورو نے فاتح بیت المقدس سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر کو پاؤں سے ٹھوکر ماری اور کہا "لو صلاح الدین ایوبی ہم یہاں تک آگئے اور ہم نے شام فتح کرلیا۔ تم کب تک سوتے رہو گے۔" (۱)

اس طرح خلافت عثمانیہ اندرونی اور بیرونی اتحادی قوتوں کی سازشوں کا شکار ہوتے ہوتے جاں بلب ہو گئی۔ ہمارے اکابرین جیسے شیخ الہند مولانا محمود حسن حضرت مولانا عبدالباری فرنگی مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر وغیرھم نے خلافت قائم رہنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن اپنوں ہی کی نادانی اور ناقدری کے سبب آخر کار یہ جان بلب مریض ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ختم ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ پوری ملت مسلمہ کیلئے ایک جانگداز اور ناقابل تلافی نقصان تھا۔ سلطنت کا خاتمہ غیروں کی چالوں میں آکر خود مسلمانوں ہی نے کروادیا۔ اقبال نے ایسے موقع پر کہا تھا۔

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

قبلہ اول صیہونی گرفت میں

ارض فلسطین انبیاء کی سرزمین مقدس ہے یہ وہ خطہ ہے جہاں جلیل القدر انبیاء علیہم السلام ایک طویل عرصہ تک دنیا کے فساد زدہ لوگوں کو اللہ کی طرف پلٹ آنے کی دعوت دیتے رہے۔ یہاں پر حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام کے مزارات مقدسہ ہیں ایک مشہور قول کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ارض فلسطین کے علاقے بیت اللحم میں ہوئی تھی۔ مسجد اقصیٰ جو کہ فلسطین میں واقع ہے اس کے متعلق قرآن میں ہے کہ

سبحن الذی اسری بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حوله لنریه من ایاتنا انه هو السمیع العلیم

ترجمہ : پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کو گھیر رکھا ہے ہماری برکت نے تا کہ دکھلائیں اس کو کچھ اپنے قدرت کے نمونے وہی ہے سننے والا دیکھنے والا۔

معراج کی رات رسول اللہ ﷺ مسجد حرام سے جبرائیل امین علیہ السلام کی معیت میں مسجد اقصیٰ تشریف لائے۔ مسجد اقصیٰ، قبلہ اول اور مقام محترم تو یوں بھی تھا لیکن معراج نبوی ﷺ میں حضور کے سفر میں عالم ناسوت اور عالم ملکوت کا درمیانی مقام بھی جب مسجد اقصیٰ بن گئی تو عقیدت اور احترام

---

(۱) پندرھویں صدی ہجری، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

وتقدس کا ایک اور تعلق بھی قائم ہو گیا۔

امام مسلم، صحیح مسلم میں حضرات براء رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سال چار ماہ تک بیت المقدس کی طرح رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے اس کے بعد ہم نے کعبۃ اللہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنا شروع کر دی۔ اس کے علاوہ دیگر بے شمار روایات ہیں جن سے ارض فلسطین اور مسجد اقصیٰ و بیت المقدس کی فضیلت واہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ بیت المقدس کو سب سے پہلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فتح کیا تھا۔ اور بیت المقدس کی چابیاں لینے خود یہاں تشریف لا کر یہاں کے باشندوں کے ساتھ معاہدہ کیا کہ جو کہ معاہدہ عمریہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ میں وہاں کے عیسائیوں کے لئے امان نامہ لکھوایا گیا جس میں خاص طور پر اس بات کا بھی ذکر کیا کہ ایلیاء میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے بعد میں یہودیوں نے عیسائیوں کو ورغلایا اور ۱۰۹۹ء میں بیت المقدس پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا۔ حالانکہ ان عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں نے شاندار اخلاق کا مظاہرہ کیا تھا۔ عیسائیوں نے یہاں پر قبضہ کے بعد مقامات مقدسہ کی توہین وتذلیل کی یہاں سے قیمتی نوادرات اتار لیں، گنبد صخرہ پر صلیب لٹکائی حرم ومسجد اقصیٰ کے صحن میں کلیسا (چرچ) تعمیر کیا اور اس کو گھوڑوں کے اصطبل کے طور پر استعمال کیا تقریباً ایک صدی تک مسجد اقصیٰ ان کے ہاتھوں پامال ہوتی رہی۔ پھر اسلام کے عظیم فرزند سلطان صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے ۱۱۸۷ء میں ان کے ناپاک وجود سے آزاد کرایا اور گنبد صخرہ پر نصب صلیب کو اتارا۔

ڈاکٹر تھیوڈر ہرتزل نامی شخص نے جو کہ نسلی صاحب دولت وثروت یہودی تھا انیسویں صدی کے اواخر میں ایک پلاننگ ترتیب دی اور اس کیلئے ہر ممکن وسائل وذرائع کا استعمال کروایا جس کے تحت فلسطین میں ایک اسرائیلی سٹیٹ کا قیام عمل میں لانا تھا انیسویں صدی کے اواخر میں سلطنت عثمانیہ کو پے در پے بحرانوں کا سامنا تھا ایسے حالات میں ہرتزل نے سلطان عبدالحمید خان کو بے پناہ دولت کا لالچ دے کر یہودیوں کو فلسطین کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت لینی چاہی تو اسے سلطان سے شرف ملاقات حاصل نہ ہو سکا۔ لیکن اسے اس کے دوست نفلنسکی نے سلطان کے انکار کا اس طرح ذکر کیا:

"ہرتزل کے لئے لازم ہے کہ اب وہ اس سلسلہ میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھائے میں اس سرزمین کی ایک بالشت کا سودا کرنے کا بھی مجاز نہیں ہوں۔ کیونکہ وہ ملک میری ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ وہ تو میری رعیت کا ملک ہے۔ اس سلطنت کے قائم کرنے کے لئے انہوں نے قربانیاں دیں ہیں اور اسے اپنے خون سے بڑا کیا ہے ہم بھی اس ملک کی اپنے خون سے حفاظت کریں گے اور اس کے انتشار وانقسام کی اجازت نہیں دیں گے۔ عثمانی رعیت ہی اس بادشاہت کی مالک ہے نہ کہ میں۔ میں اس کے کسی ایک

حصے کو چھوڑ دینے پر قادر نہیں ہوں۔ یہودی سرمایہ دار اپنی دولت کو اس دن کے لئے محفوظ رکھیں جب یہ بادشاہت ختم ہو جائے گی تو پھر وہ کچھ دیئے بغیر فلسطین کی طرف ہجرت کر سکیں گے لیکن یہ خلافت ہماری لاشوں پر ہی تقسیم ہو سکتی ہے کیونکہ ہم جیتے جی اپنے آپ کو روندنے کی اجازت نہیں دیں گے"

ہمارے تمام سربراہوں اور قائدین کے لئے اس خط میں درس عبرت ہے بعد میں ہرتزل نے قیصر کے ذریعہ جرمنی کو یہودیوں کی حمایت کرنے اور فلسطین میں اسرائیلی مملکت کے قیام پر سلطان کو مجبور کروانے کی کوششیں کیں۔ ۲ نومبر ۱۸۹۸ء کو مدینہ قدس میں قیصر اور ہرتزل کے درمیان بات چیت کا جو مختصر دور چلا۔ اس میں ہرتزل نے یہودی منصوبہ کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ "میں نے مختلف مقامات پر یہودیوں کی آبادی کو دیکھا ان یہودیوں کے لئے جرمنی بھی کافی نہیں ہے اور ان کے لئے ایک جگہ رہنا ہی زیادہ مفید ہوگا۔ اور یہ علاقہ (فلسطین) یہودیوں کے لئے کافی ہوگا.........."

لیکن سلطان عبدالحمید خان نے اپنی تمام تر قوت وطاقت بروئے کار لاتے ہوئے یہودیوں کو ان کے ناپاک عزائم میں کامیاب ہونے سے روکے رکھا۔ یہودی جب سمجھ گئے کہ سلطان عبدالحمید کے ہوتے ہوئے کسی طرح بھی ان کی کوششیں بارآور نہیں ہو سکتی ہیں تو انہوں نے سلطان کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے سازشیں شروع کر دیں اور آخر کار وہ اس منصوبے میں بیسویں صدی کی ابتداء میں کامیاب ہو گئے۔ سلطان کے معزول ہوتے ہی یہودیوں کی چاندی ہو گئی اور یہودیوں کو اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملا۔

اس طرح در حقیقت اسرائیلی مملکت کا وجود ۱۹۴۸ء میں نہیں بلکہ سلطان عبدالحمید کے معزول ہونے کے بعد ۱۹۰۹ء ہی میں عمل میں آچکا تھا۔ کیونکہ ۱۹۰۹ء میں سلطان کی معزولی کے بعد فلسطین اور دیگر عرب علاقے اس حقیقی تحفظ سے محروم ہو گئے جو انہیں سلطان کے زمانہ میں میسر تھا[1] مغربی اقوام اور انکے حلیفوں نے جان لیا کہ اب ان کی فصل کاٹنے کا وقت آگیا۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک فلسطین پر برطانیہ کا تسلط رہا اس دوران صیہونی تحریک نے فلسطین پر مکمل قبضہ جمانے اور ایک مستقل ریاست وجود میں لانے کیلئے ہر ممکن کوشش کی یہاں تک کہ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین میں ایک غاصب ریاست اسرائیل کی بنیاد رکھ دی گئی اور دنیا بھر سے امریکہ و برطانیہ اور اسکے دیگر حلقوں نے بکھرے ہوئے یہودیوں کو لا لا کر اسرائیل میں ناجائز بسایا اور آج تک روز بروز اس اسرائیلی اسٹیٹ کی سرحدیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ قبلہ اول بیت المقدس ۱۹۶۷ء میں مسلمانوں سے چھین لیا گیا اور آج تک بیسوں بار مسلمانوں کے ان مقدس مقامات کو ڈھانے کے عزائم عمل میں لائے گئے۔

(۱) اسرائیل کے قیام کے لئے صیہونی اقدامات۔ انجینئر مصطفیٰ محمود الطحان (بشکریہ ماہنامہ بیت المقدس)

جزیرۃ العرب میں یہود کا داخلہ

یہود وہ دیمک ہیں جنہوں نے انسانی معاشرے مذاہب تہذیب و تمدن اخلاقیات عمرانیات فلسفے اور فکر و فن کی ہر بنیاد کو منہدم کر کے چاٹ ڈالا ہے یہود ایک ایسی قوم ہے جنہوں نے اپنی دو ہزار سالہ زندگی اللہ تعالیٰ کی مسلسل نافرمانیوں میں گزاری ہے حضرت اسحاق علیہ السلام کے بعد سے بنی اسرائیل نامی قوم کا آغاز ہوا اور تادم تحریر یہ قوم مسلسل بغاوت سازش اور فساد کی علمبردار رہی ہے اس قوم پر رب کائنات نے متعدد بار لعنت کی ہے اسرائیلیوں کی پوری مکر و فریب کی تفصیل قرآن مجید میں محفوظ کی گئی ہے۔ قسمت کی ستم ظریفی بھی عجیب ہے ورنہ آج مسلمانوں سے زیادہ یہود کا جاننے والا کوئی نہ ہوتا۔ قرآن کی یہی ایک آیت اگر ہمارے پیش نظر ہوتی تو ہم کسی طرح سے بھی ان کے قریب نہ خود جاتے اور نہ ان کو اپنے پاس پھٹکنے دیتے۔

لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین امنوا الیھود والذین اشرکو۔

ترجمہ : تو پاوے گا سب لوگوں سے زیادہ دشمن مسلمانوں کا یہودیوں کو اور مشرکوں کو۔

اگر اسلام کے ابتدائی دور پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہودی قوم نے کسی موقع پر بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کیا۔ یہودی قبیلہ بنی نضیر کے لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن اللہ نے ان کو ناکام کر دیا اسی بغاوت کے جرم میں بنی نضیر مدینہ سے نکال باہر کئے گئے، بعد میں بنی نضیر نے پورے عرب میں پھر کر مشرکین اور قریش و بنو قریظہ کو اکھٹا کروا کے بارہ ہزار (12000) کے لگ بھگ فوج کے ذریعہ 5ھ میں مدینہ پر حملہ کیا اس جنگ کو جنگ احزاب اور خندق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے مدینہ کے گرد خندق کھدوائی جس کی وجہ سے ان مخالف قوتوں کو مدینہ میں داخلہ ناممکن ہوا۔ تقریباً ماہ بھر یہ جنگ تیروں کی بارش کی شکل میں جاری رہی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کے لئے آندھی بھیجی جس سے دشمن اور ان کے گھوڑے بدک گئے اور اس طرح اللہ نے اس متحدہ فوج کو رسوا کر کے مسلمانوں کو فتح سے نوازا اس جنگ میں یہودی قبائل نے معاہدے توڑ کر دشمنان اسلام کا ساتھ دیا۔ اور اس طرح انہوں نے واضح کر دیا کہ وہ اسلام کی مرکزی طاقت کو توڑنے کیلئے ہر معاہدے کو توڑیں گے اور ہر طرح کی کمینی حرکات سے گریز نہیں کریں گے ان حالات و واقعات کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ حجاز سے یہود کو نکال باہر کر دیا جائے اخرجوالیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب چنانچہ ایسے باغیوں اور طاغیوں کے وجود سے اس علاقے کو ہمیشہ کے لئے خالی کر دیا گیا یہود ہمیشہ سے یہ خواب دیکھتے آرہے تھے کہ مدینہ کی حدود سلطنت میں بسنے والے اس وقت کے بنی نضیر، بنی قریظہ اور

دوسرے قبائل کی زمینیں حاصل کرنے کے لئے مدینہ پر چڑھائی کر کے وہ علاقے پھر سے واپس لے لیں۔
لیکن کھلم کھلا ایسا عمل کرنا ان کے لئے مسلمانوں کے رد عمل سے ناممکن نظر آیا۔ افسوس کہ مشرق وسطیٰ
کے عراق کویت جنگ کے دوران امریکہ شاطر نے سعودی عرب کے دفاع کا بہانہ بنا کر وہاں پر اپنی
فوجوں کو اتروا کر قبضہ جمالیا ہے۔ اس طرح ۱۴۰۰ سال بعد یہود کو دوبارہ جزیرۃ العرب میں گھسنے ٹیکنے کا
موقع دیا گیا دفاع حرمین پر ہر مسلمان اپنی جان قربان کرنے کیلئے تیار تھا لیکن افسوس صد افسوس سعودی
حکومت اور فرمانروا شاہ فہد پر کہ امریکی افواج کو سعودی عرب میں اتار کر یہود کو اسلام کی شہہ رگ پر وار
کرنے کا موقع دیا سعودی حکمرانوں کا یہ بدترین جرم امت مسلمہ کبھی معاف نہیں کرے گا امریکہ اور یہود
اسوقت حرمین تک کو گھیرے میں لئے ہوئے ہیں جبکہ سعودی حکمران اپنی شہنشائیت کے قائم رکھنے کے
لئے ان کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔

ملت مسلمہ کی زبوں حالی:

آج اگر ہم عالم اسلام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس تصویر کا سب سے اذیت ناک پہلو یہ ہے کہ دنیا کے
مختلف خطوں میں مسلمانوں کا قتل عام جاری ہے اور انہیں بدترین سفاکی کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ مقبوضہ کشمیر
میں ۷ لاکھ بھارتی فوجی نہتے کشمیری عوام کو نشانہ ستم بنا رہی ہے نوجوانوں کی پوری ایک نسل ختم کردی
گئی انبیاءؑ کی سرزمین فلسطین کے کوچہ وبازار نوجوانوں کے لہو سے رنگین ہو رہے ہیں چیچنیا میں مسلم خون کی
ندیاں بہائیں جارہی ہیں ماضی قریب میں کوسوو اور بوسینا میں مسلمانوں کو جس سیاست کے تحت ختم کرنے
کی کوشش ہوئی وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کا سیاہ ترین کردار اس سلسلہ میں بالکل واضح
ہے۔ امریکہ برطانیہ اور اس کے دیگر حلقوں کے دخل اندازیوں کی بدولت افغانستان طویل ترین جنگ
سے گزرنے کے باوجود اب تک عدم استحکام کا شکار ہے۔ افغانستان مین طالبان حکومت نے عدل
وانصاف اور امن وامان کا بیڑا سر پر لیا۔ امارت اسلامی افغانستان ۔تحریک طالبان نے ملا محمد عمر مجاہد کی قیادت
میں وہاں پر مکمل امن وامان عدل وانصاف اور لاء اینڈ آرڈر قائم کر کے افغانستان کے ۹۰ فیصد علاقے کو
ایک مرکز سے جوڑ دیا۔ لیکن افسوس یہ کفری طاقتوں کے آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھتے رہے۔ مغربی
قوتوں کو جب اس بات کا احساس ہوا کہ اس خطہ میں بیداری کی ایک لہر اور ہوا چلی ہے جو کہ آگے چل کر
نو آزاد وسط ایشیائی ریاستوں پاکستان، ایران، عراق، کویت، سعودی عرب اور دیگر اسلامی ممالک کو ایک
نقطہ پر جمع ہونے کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے اور اس طرح مغربی اقوام اور یہود وہنود کے دجل وفریب اور
اسلام دشمنی کے لئے سدّ سکندری بن سکے گا لہذا اسی خطرے کو پیش نظر رکھ کر مغرب نے اس نوخیز
اسلامی امارت کو ختم کرنے کے لئے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نیویارک، واشنگٹن اور پینٹاگون

میں دھماکے کروائے اور پھر اس کا سارا ملبہ ملت مسلمہ کے عظیم ہیرو اسامہ بن لادن اور افغانستان کے امارت اسلامی پر ڈال کر وہاں پر حملے کروانے کیلئے جواز کے طور پر استعمال کیا۔

عالم اسلام کی زبوں حالی کے اسباب :

عن ثوبان رضی الله عنه قال رسول الله ﷺ یوشك الامم ان تداعی علیکم کماتداعی الاکلة الی قصعتها فقال قائل ومن قلة نحن یومئذ؟ قال بل انتم یومئذ کثیر ولکنکم غثاء کغثاءِ السیل ولینزعن الله من صدور عدوکم المهابة منکم و لیقذفن الله فی قلوبکم الوهن فقال قائل یا رسول الله ما الوهن؟ قال حب الدنیا وکراهیة الموت۔ وفی روایة حبکم للدنیا وکراهیتکم للقتال رواه احمد و ابوداؤد وغیرهما۔

ترجمہ : حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا :"عنقریب کافر قومیں ہر طرف سے تم پر متحد ہو کر یوں ٹوٹ پڑیں گی جیسے کھانے والے کھانے کی پلیٹ پر ٹوٹ پڑتے ہیں" ایک صحابیؓ نے عرض کیا : "یارسول اللہ! کافروں کو یہ جراءت کیا اس وجہ سے ہوگی کہ ہم اس وقت تعداد میں کم ہوں گے ؟" ارشاد فرمایا "نہیں، تمہاری تعداد تو بہت زیادہ ہوگی لیکن تم اس وقت جھاگ اور خس وخاشاک کی مانند ہو گے" اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کا قلوب سے تمہارا رعب نکال دیں گے اور تمہارے دلوں میں بزدلی ڈال دیں گے "صحابیؓ نے عرض کیا :"اے اللہ کے رسول! بزدلی کا سبب کیا ہوگا" رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "دنیا سے محبت اور موت سے نفرت" ایک روایت میں یوں ہے کہ "تمہیں دنیا سے محبت اور قتال فی سبیل اللہ سے نفرت ہو جائے گی"۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اکیسویں صدی میں ملت مسلمہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر متحدہ طور پر عالمی اور طاغوتی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جہاد کے میدان میں کمر باندھ کر دنیا کی عارضی اور فانی لذائز کو ترک کر کے عملاً نکل پڑے تو انشاء اللہ دنیا کی کوئی بھی طاقت ان کے راستے میں حائل نہ ہو سکے گی۔

یریدون ان یطفئوا نو الله بافواههم ۔ ویا بی الله الا ان یتم نوره ولو کره الکفرون

ترجمہ : چاہتے ہیں کہ بجھادیں روشنی اللہ کی اپنے منہ سے اور اللہ نہ رہے گا بدون پورا کئے اپنی روشنی کے اور پڑے برا مانیں کافر۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

حافظ محمد ابراہیم فائی

یہ صدی بھی یورشِ خونبار کے نرغے میں ہے

ملت اسلام پھر کفار کے نرغے میں ہے
امت خیرالبشرؐ اغیار کے نرغے میں ہے

اک صلیبی جنگ سے آغاز جس کا ہو گیا
یہ صدی بھی یورشِ خونبار کے نرغے میں ہے

ہر طرف آہ وبکاہ ہے چار سو ظلم و ستم
کیوں مسلماں اس طرح ادبار کے نرغے میں ہے

زندگی سے موت تو بہتر ہے ایسے وقت میں
مسلم لمۃ کفر کی یلغار کے نرغے میں ہے

رحمۃ للعالمینؐ فریاد ہے فریاد آہ
مرکزِ ایمانیاں اشرار کے نرغے میں ہے

نبض ملت ڈوبنے کو ہے یہ فائی الحفیظ
غیرتِ ملیّ بھی دردِ زار کے نرغے میں ہے

راجا رشید محمود
مدیر ماہنامہ "نعت" لاہور

اکیسویں صدی کا استقبال

اپنے اندر جھانکنے کی کس کو فرصت ہے یہاں
کال سا اک کال ہے یہ احتساب نفس کا

اجتماعیت میں ہو یا انفرادی رنگ میں
ایک اضمحلال ہے یہ احتساب نفس کا

اپنے گردو پیش اس کا کچھ اثر ظاہر نہیں
اللہ اللہ! حال ہے یہ احتساب نفس کا

اپنی آنکھوں میں ہیں جو شہتیر، ان کو دیکھنا
احسن استدلال ہے یہ احتساب نفس کا

روئے اخلاق و مروت پر یہ فیضِ مرحمت
ایک دلکش خال ہے یہ احتسابِ نفس کا

معصیت کے جس قدر عفریت ہیں محبوس ہیں
ایک ایسا جال ہے یہ احتساب نفس کا

طاق دل میں ریزہ ریزہ ہے انانیت کا بت
ایسا اک بھونچال ہے یہ احتساب نفس کا

حبّذا کہ آرہا ہے پھر نیا صد سالہ دور
یعنی استقبال ہے یہ احتساب نفس کا

دو ہزار ایک آرہا ہے، مرحبا، صد مرحبا
گویا پہلا سال ہے یہ احتساب نفس کا

عیب جو ہم ہیں تو ہیں محمودؔ ہم پر خود غلط
دل سے استیصال ہے یہ احتساب نفس کا

دار العلوم حقانیہ کے نئے تعلیمی سال ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲ء/۲۰۰۱ء کے داخلوں کا شیڈول

درس نظامی

درجات	ایام	تاریخ دسمبر / شوال
دورہ حدیث	بدھ	۲۶ دسمبر بمطابق ۱۰ شوال تا یکم جنوری بمطابق ۱۶ شوال ۱۴۲۲ھ
موقوف علیہ	جمعرات	۲۷ دسمبر بمطابق ۱۱ شوال تا ۲۹ دسمبر بمطابق ۱۳ شوال ۱۴۲۲ھ
سادسہ، تکمیل	ہفتہ	۲۹ دسمبر بمطابق ۱۳ شوال ۱۴۲۲ھ
خامسہ، رابعہ	اتوار	۳۰ دسمبر بمطابق ۱۴ شوال ۱۴۲۲ھ
ثالثہ، ثانیہ	پیر	۳۱ دسمبر بمطابق ۱۵ شوال ۱۴۲۲ھ
حفظ	پیر	۳۱ دسمبر بمطابق ۱۵ شوال ۱۴۲۲ھ
اولیٰ، متوسطہ، اعدادیہ	منگل	۰۱ جنوری بمطابق ۱۶ شوال ۱۴۲۲ھ
افتتاح	بدھ	۰۲ جنوری بمطابق ۱۷ شوال ۱۴۲۲ھ
تخصص	جمعرات	۰۳ جنوری بمطابق ۱۸ شوال ۱۴۲۲ھ

شعبہ حفظ

درجہ حفظ میں داخلہ کے خواہشمند طلباءؔ کی درخواستیں ۱۵ رمضان بمطابق یکم دسمبر سے ۱۰ شوال بمطابق ۲۶ دسمبر تک دفتر اہتمام میں جمع کی جائیں گی۔ حفظ کے خواہشمند طلباء ٹیسٹ اور انٹرویو وغیرہ کیلئے ۳۱ دسمبر بروز پیر صبح کو دار العلوم حقانیہ بلائے جائینگے۔ صرف وہ امیدوار درخواست دیں جو قرآن کریم ناظرہ پڑھ چکے ہوں۔ عمر ۱۳ سال سے متجاوز نہ ہو۔ دو پارے پہلے سے یاد کرنیوالوں کو ترجیح دی جائیگی۔

درجہ تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء

درجہ تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء کیلئے درخواستیں ۲۶ دسمبر سے ۲ جنوری تک دفتر اہتمام میں وصول کی جائینگی۔ امتحانی ٹیسٹ ۳ جنوری بروز جمعرات ہوگا۔ جس میں دار العلوم حقانیہ کے فضلاء اور وفاق کے امتحان میں کم از کم جید جدا حیثیت حاصل کرنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔ نیز امیدوار کا اردو، عربی زبانوں پر بھی مکمل عبور حاصل ہونا ضروری ہے۔

نوٹ: (۱) یہ تواریخ حتمی ہیں۔ جس دن جن درجات کا داخلہ مقرر ہے اسی دن ان درجات کا داخلہ مکمل کیا جائیگا۔ وقت مقررہ گزرنے کا بعد داخلہ پر قطعاً اصرار نہ کریں اور نہ سفارش لانے کی کوشش کریں۔

(۲) ملکی خراب اقتصادی حالت کی وجہ سے ہر شعبہ میں داخلہ محدود ہوگا۔ اس لئے اوقات مقررہ کے بعد آنے والے طلباء کو کسی بھی درجہ میں داخلہ نہیں دیا جائے گا۔

جامعہ دار العلوم حقانیہ کیلئے نئے تعلیمی سال کا باضابطہ آغاز

انشاء اللہ جامعہ دار العلوم حقانیہ کے تعلیمی سال ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲ء کا آغاز بروز بدھ بتاریخ ۲ جنوری ۱۷ شوال سے ہوگا

جمادی الثانی ۱۴۲۱ھ تا جمادی الاول ۱۴۲۲ھ اکتوبر ۲۰۰۰ء تا ستمبر ۲۰۰۱ء

مضامین کی فہرست موضوعات کے لحاظ سے سلسلہ واران صفحات سے دی گئی ہے جو ہر صفحے کے نیچے لکھے ہوتے ہیں۔ یہ فہرست جلد کے آغاز میں لگوائی جائے

--------مدیر--------

نقش آغاز

ارض مقدس میں یہودی مظالم اور عالم اسلام و پاکستان کا کردار۔ امریکہ کے ڈرامائی صدارتی انتخابات سے عالم اسلام کو کسی خیر کی توقع نہیں رکھنی چاہیے ۲۔۶۶

اسلامی سربراہی کانفرنس کا اجلاس 'خدشات' توقعات اور مایوس کن نتائج۔ افغانستان پر اقوام متحدہ کی ظالمانہ پابندیوں کے خلاف دفاع افغانستان کونسل اور متحدہ اسلامی کانفرنس کا انعقاد............ ۶۸۔۱۳۵

بھارت میں المناک زلزلہ' ظالم حکمرانوں کیلئے تازیانہ عبرت۔ لیبیا کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ کا معاندانہ رویہ جامعہ فاروقیہ کراچی کے ممتاز مدرسین کی شہادت' مولانا ضیاء القاسمی' مولانا محمد امین اوکاڑوی' مولانا لقمان علی پوری کے سانحہ ارتحال

.... ۱۳۳' ۱۳۴' ۱۳۵

فرقہ وارانہ فسادات اور اس کے مضمرات...... ۲۵۲

خدمات دارالعلوم دیوبند کانفرنس' پس منظر و پیشمنظر ۲۶۶

افغانستان کے رئیس الوزرأ ملا محمد ربانی کی رحلت ۲۷۵

سود کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلے سے انحراف کیوں؟ ۳۳۰

مرد قلندر مولانا عبدالستار خان نیازی کی رحلت ۳۳۱

اسلحہ جمع کرنے کی حکومتی مہم یا امریکی اہداف کی تکمیل ۳۹۴

نامور علمی شخصیت صاحبزادہ خورشید گیلانی کی جدائی ۳۹۶

نیپالی ولی عہد کے ہاتھوں بادشاہ اور شاہی خاندان کا صفایا ۳۹۷

کیا پاک بھارت مذاکرات مسئلہ کشمیر کا حل نکال سکتے ہیں؟ ۴۵۸

افغانستان کی سرحدات پر اقوام متحدہ کی مانٹرنگ ٹیموں کی تعیناتی پاکستانیوں کیلئے قابل قبول نہیں ۴۶۰

وفیات

حضرۃ مہتمم صاحب مدظلہ اور انکے خاندان کو صدمہ ۶

حضرت مولانا رشید الدین حمیدیؒ کی رحلت ۴۶۲

جہاد افغانستان / تحریک طالبان

طالبان کی کامیاب جنگی حکمت عملی (جنرل مرزا اسلم بیگ) افغانستان پر پابندیاں' امت کی غیرت کیلئے کھلا چیلنج (جنرل حمید گل)۔ افغانستان کے خلاف الزامات کی اصل حقیقت (مولانا عبدالسلام ضعیف)

.... ۱۵۵۔۱۷۵۔۲۲۷

دفاع افغانستان کونسل کی اہم سرگرمیاں اور مستقبل کا لائحہ عمل (مولانا یوسف شاہ)۔ اسامہ بن لادن اور افغانستان پر پابندیاں (مولانا عبدالسلام ضعیف)

.... ۲۴۰۔۳۷۹

طالبان کا نقطہ نظر اور مغربی موقف (سید رحمت اللہ ہاشمی) ۵۰۴

عالم اسلام

فلسطین کی آزادی کے جاں گسل تقاضے اور حماس کی

جدو جہد کے بارہ سال (راجہ ذاکر خان)...... ۳۵

لمۃ مسلمہ کے مقاصد اور کردار (ڈاکٹر لیاقت نیازی) ۳۱۵

اراکان کے دارالحکومت اکیاب میں خون مسلم کی ارزانی (مولانا محمد صدیق اراکانی) امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ: کیوں اور کیسے (مولانا شہاب الدین ندوی) .... ۳۱۹_۴۳۰

قرآنیات

قرآن عثمانی (امجد بٹ)۔ اکیسویں صدی کا جہاد قرآن حکیم کے ذریعے (مولانا محمد شہاب الدین) .... ۳۰۰_۳۴۵

تاریخ ادب و سوانح

غزل فارسی برزمین سرمد (مولانا ابراہیم فانی) ۴۳

خوشحال خان خٹک (لیفٹیننٹ کرنل محمد اعظم) ۴۴

جذبات محبت (نظم) (حافظ محمد ابراہیم فانی)...... ۱۱۷

خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا۔ خطیب اعظم مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ (صاحبزادہ انوار الحق)............ ۲۵۷

(نظم) رشد و تقویٰ و تقدس سربسر ہے دیوبند (فانی)

جذبات سپاس' (مولانا محمد ابراہیم فانی) ۲۸۹'۳۲۲

ایک جید فاضل دیوبند مولانا ڈاکٹر اسرار الحق کی وفات (مولانا حامد الحق حقانی) ۳۸۴

لاالہ الااللہ (نظم) (مولانا محمد ابراہیم فانی) ۳۸۶

امام طحاویؒ محدث وقت (مولانا تقی الدین ندوی) ۴۱۵

اللہ اللہ مصطفیٰ ہے (نظم) (مولانا ابراہیم فانی) ۵۱۴

ملکی صورتحال

مملکت اسلامیہ پاکستان میں عیسائی مبلغین کا شفائیہ (اجتماع اور اسلام کا نقطہ نظر' اکرام اللہ جان قاسمی) ۳۰۵

اسلام اور سائنس

شہد فیہ شفاءللناس ڈاکٹر نثار محمد............ ۲۵۱

علم' علماء اور دینی مدارس

متحدہ اسلامی کانفرنس کا خطبہ استقبالیہ (مولانا سمیع الحق) ۱۳۶

متحدہ اسلامی کانفرنس کا اعلامیہ............ ۱۴۱

دارالعلوم دیوبند کے اکابر کی جامعہ حقانیہ میں آمد اور استقبالیہ تقریب سے خطاب (مولانا عرفان الحق)............ ۲۷۱

امت مسلمہ' علماً مشائخ اور اسلام دشمن قوتوں کو پیغام۔ دیوبند کانفرنس میں مولانا سمیع الحق کا تاریخی خطاب (مولانا عرفان الحق)............ ۲۹۰

بزرگان دیوبند اور ان کی خدمات ملی (ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی) ۳۶۳

دارلعلوم حقانیہ اور اس کے داعی (کرنل محمد اعظم) ۴۳۵

دینی مدارس' اسلام کے قلعے (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) ۴۷۳

بحث و تحقیق

اسلامی نظام اور مواخات۔ ایک عملی مظاہرہ (مولانا محمد امجد تھانوی) ۷

سرسید کا نظریہ قومیت اور مولوی عبدالحق (ضیاء الدین لاہوری۔) ۱۴
ایک اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں (مولانا مطیع اللہ حقانی) ۱۹
نئی صدی میں ہماری ترجیحات (ڈاکٹر سید عبدالباری) ۳۰
حوا کی بیٹیاں اور ازدواجی دہشت گردی (ملک عبدالصمد شاہد) ۴۰
بجنگ + ۵ کانفرنس۔ تاریخ، و مقاصد (ڈاکٹر محمد سفیر) ۵۲
نظام اکل و شرب میں شریعت کی رہنمائی (مولانا سمیع الحق) .... ۳۹۹،۳۳۳،۲۵۴،۱۴۵،۷۴
رویت ہلال۔ اختلاف مطالع اور فلکی حساب (مفتی محمد مصباح الدین قاسمی) .... ۲۱۵،۱۵۷،۸۸
ولیم میور، دیانند سرسوتی اور سرسید (ضیاء الدین لاہوری) ۱۷۹
ایک غلطی کی اصلاح (پروفیسر عبدالماجد) ۱۹۱
اسلامی بینکاری، کچھ خدشات، کچھ وضاحتیں (منصور ملک) ۲۳۴
قبلہ اولیٰ اور قبلہ ثانیہ کے مابین (علامہ اسرار الحق) ۳۸۷
اسلامی معاشرہ کے لازمی خدو خال (مولانا سمیع الحق) ۴۶۳
احرف سبعہ اور اس کا مفہوم، قرأت قرآنیہ کے تناظر میں (پروفیسر قاری تاج افسر) ۴۸۵
تجارت میں حرام وحلال کے اصول (ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی) ۵۰۹

اصلاح وارشاد، دعوت وتبلیغ

رمضان اللہ کی رحمتوں کا پیغام (مولانا عبدالحق) ۷۵
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی (مولانا ابن الحسن عباسی) ۱۱۲
عدم برداشت کا ابھرتا ہوا رجحان اور تعلیمات نبویؐ۔ (مولانا اکرام اللہ جان قاسمی) ۴۴۰
ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں دینی علوم (عبدالقہار) ۴۵۰

افکار و تاثرات

برطانیہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کا تقاضہ (مولانا عتیق الرحمان سنبھلی) ۱۰۹

دارالعلوم کے شب و روز

جلسہ دستار بندی و تقریب ختم بخاری شریف، دارالعلوم کے سالانہ امتحانات، غیر ملکی ذرائع ابلاغ کی مسلسل آمد۔ دورہ تفسیر و دورہ میراث، امریکہ میں مقیم پاکستانی ڈاکٹر امجد حسین کی دارالعلوم تشریف آوری۔ (شفیق الدین) .... ۱۱۹۔۱۲۱۔۱۲۲
افغانستان کے سفیر عبدالسلام ضعیف صاحب کی دارالعلوم تشریف آوری۔ ۱۲۲
دارالعلوم کے نئے تعلیمی سال کا آغاز۔ ۱۹۴
مختلف بین الاقوامی صحافیوں کی دارالعلوم آمد .... ۵۱۵،۴۵۴،۱۹۴
افغانستان پر پابندیوں کے خلاف دارالعلوم کے طلبہ کا

احتجاجی مظاہرہ، رمضان المبارک میں دارالعلوم کی علمی روحانی رونقیں، جامعہ حقانیہ میں کمپوٹر کلاسز کا اجرأ .... ۱۹۴،۱۹۵،۱۹۶

دارالعلوم کے اساتذہ کی حج بیت اللہ کیلئے روانگی ۲۵۸

دارالعلوم میں عیدالضحیٰ کی تعطیلات ۲۵۸

افغانستان کے سابقہ تنظیموں کے اہم رہنماؤں کی آمد، بین الاقوامی میڈیا کے نمائندوں کی دارالعلوم آمد، دیو بند کانفرنس کے ہزاروں شرکا کی دارالعلوم آمد .... ۲۵۸،۳۲۳،۲۸۹،۳۲۳

دارالعلوم حقانیہ کے مہتمم کی دارالعلوم دیوبند کے علما سے ملاقات، دارالعلوم دیوبند کانفرنس کی تیاری کے سلسلے میں مولانا حامدالحق حقانی کا خطاب ۳۲۴

حضرت مولانا سمیع الحق کا دورہ جمہوریہ یمن ۴۵۳

دارالعلوم کی سہ ماہی تقریب انعامات ۴۵۴

دعائے صحت کی اپیل، ششماہی امتحانات کا انعقاد .... ۴۵۴،۵۱۵

مولانا حامدالحق حقانی کا دورہ یورپ ۵۱۵

مولانا حافظ محمد ابراہیم فانی کو صدمہ، مشہور روحانی بزرگ مولانا عبدالمتین باچاصاحب کا انتقال ۵۱۶

تبصرہ کتب

اشرف التفاسیر (صوفی محمد اقبال قریشی، مولانا محمد اسحاق) ۶۱

متاع وقت اور کاروان علم (مولانا ابن الحسن عباسی) ۶۳

ماہنامہ الرشید (اشاعت خصوصی) مولانا عبدالرشید ارشد ۶۳

زادالمنتھی شرح سنن الترمذی (مفتی محمودؒ) ۱۲۳

الکنز المتواریفی معاون لامع الدراری وصحیح البخاری (محمد زکریا) ۱۲۵

تعمیر حیات (لکھنو) خصوصی شمارہ (شمس الحق ندوی) ۱۹۷

الھدایہ مع نصب الرایہ (منظور احمد تونسوی) ۱۹۸

گلدستہ تفاسیر (جلد اول) الحاج عبدالقیوم مہاجرمدنی) ۲۶۰

قادیانی غداروں کی نشاندہی (محمد طاہر رزاق) ۲۶۱

احکام القرآن (مولانا محمد ایوب ہاشمی قدس سرہ) ۲۶۲

احکام الاسلام (" " ") ۳۹۱_۲۶۲

عالمی نظام سیاست واقتصاد اور افغانستان کی طالبان تحریک (خالد محمود) ۳۲۵

تفہیم الراوی فی شرح تقریب النواوی (مولانا فضل اللہ شامزئی)۔ عبقریت خالدؓ (عباس محمود) .... ۳۲۶،۳۲۷

خواجہ محمد خان اسد احوال وآثار (راشد علی زئی) ۳۲۸

کتابوں کی درسگاہ میں (مولانا ابن الحسن عباسی) ۳۹۰

نبیؐ وصدیقؓ (مولانا سید نورالحسن شاہ) ۳۹۰

سوانح شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ (مولانا عبدالقیوم حقانی) ۴۵۵

ماہنامہ القاسم (خصوصی اشاعت) (" " ") ۴۵۶

ماہنامہ حق چاریار (خصوصی اشاعت) (مولانا قاضی مظہر حسین) ۵۱۷